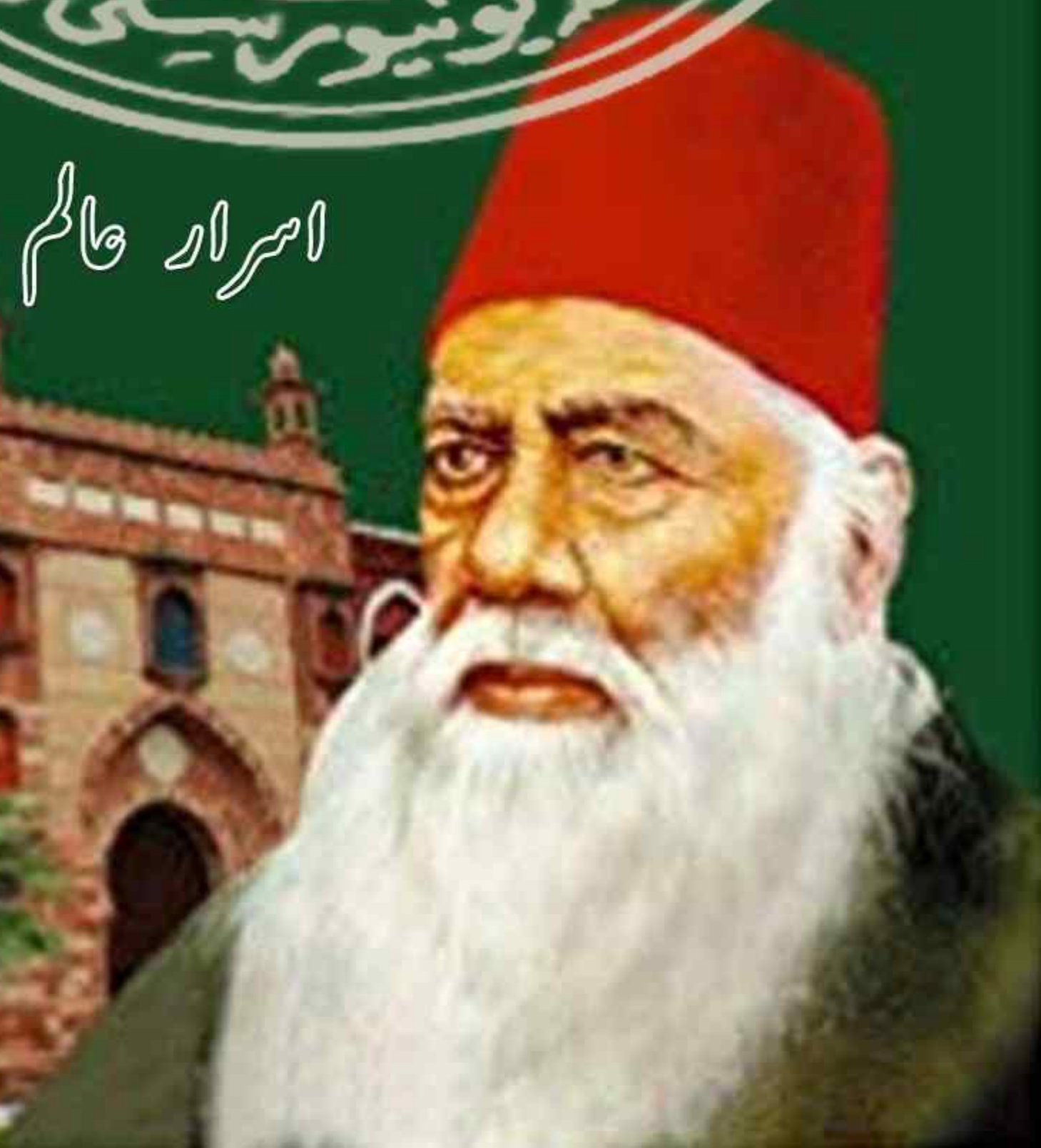
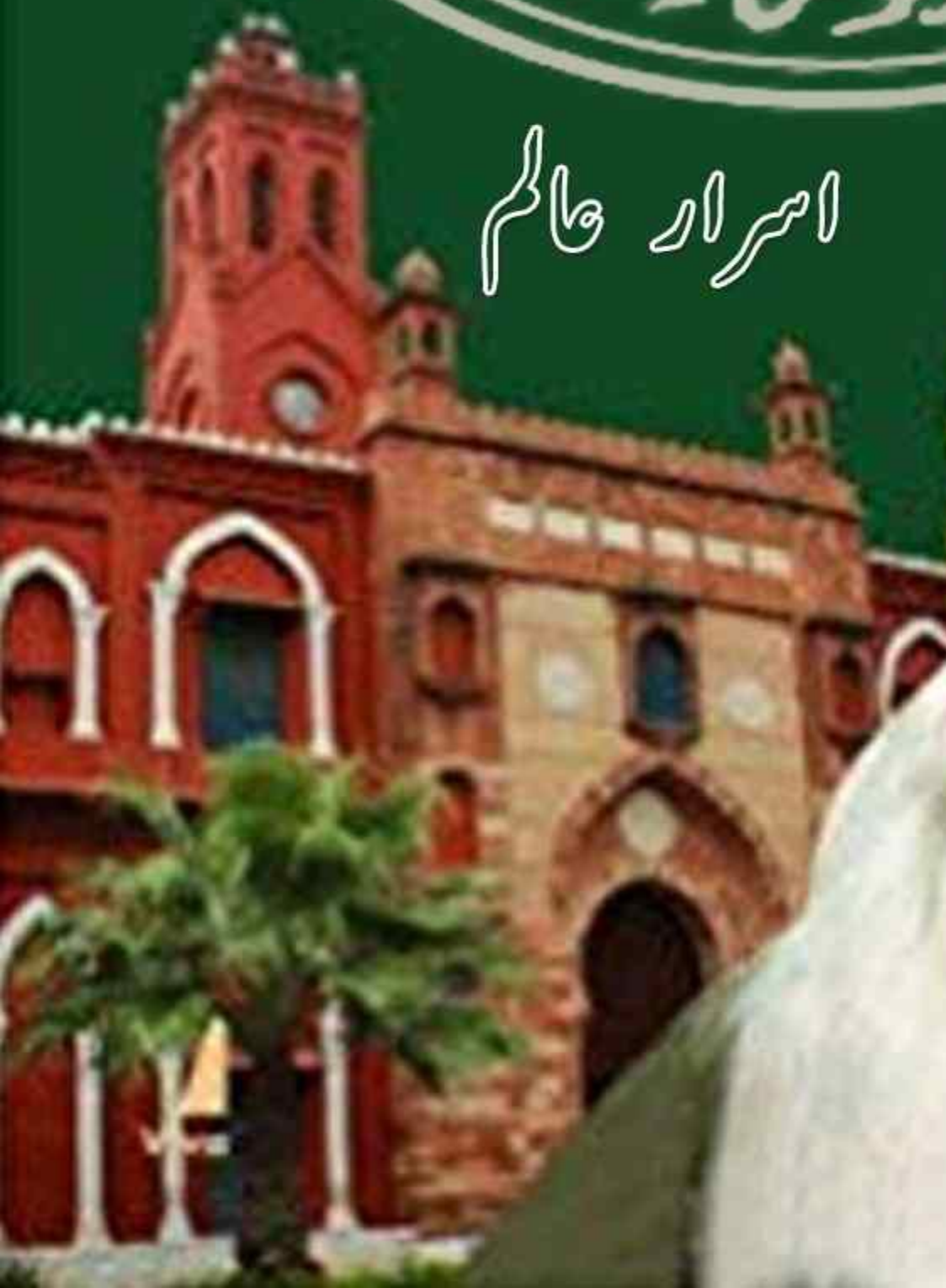


سرسید کی بصیرت



اسرارِ عالم



سرسید کی بصیرت

اسرار عالم

سر سید کی بصیرت

اسرار عالم

دارالعلم، نئی دہلی

All Rights Reserved

© جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

سلسلہ مطبوعات۔ ۱۶۔

SIR SYED KI BASEERAT

By: ASRAR ALAM

نام کتاب :	سر سید کی بصیرت
مصنف :	اسرار عالم
طبع اول :	جنوری ۲۰۱۳
طبع دوم :	مارچ ۲۰۱۳
صفحات :	۲۳۰
ناشر :	دارالعلم، نئی دہلی
ہیہ :	۲۰۰۰/-

Published By:

DAR-AL-ILM

New Delhi

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ



فہرست

۷	پیش لفظ	■
۸	مقدمہ	■
۹	تمہید	■
۱۳	مشاہدات	■
۲۱	انکشافات	■
۳۹	زہریلا دائرہ	■
۵۳	سفر نصیب	■
۵۶	مثنویت و تراذیت	■
۷۹	صبحِ نخست	■
۹۵	صبحِ صبح	■
۱۰۹	صبحِ بام	■
۱۲۵	مضمرات و عواقب	■
۱۴۹	دین اور مذہب	■
۱۶۱	حکم اور صلاۃ	■
۱۷۷	ذہنی بحران	■
۱۸۷	پس چه باید کرد	■
۱۹۹	تجويز اول: سرسید تحریک کا جامع اور مکمل احیا	■
۲۲۵	تجويز دوم: مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں اصلاح حال براہ انتظامی تدابیر ...	■
۲۳۵	تنقیح اور توضح	■

پیش لفظ

حامداً ومصلياً!

نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت بنی نوع انسان میں وہ آخری امت ہے جو منصب شہادت پر فائز کی گئی ہے۔ چنانچہ پوری انسانیت کی کامیابی کا انحصار اب اسی گروہ پر ہے۔ بیسویں صدی عیسوی کی آخری دہائی تک آتے آتے واضح طور پر محسوس ہونے لگا کہ یہ امت تاریخ انسانی کے اس مرحلے میں داخل ہو چکی ہے جس کی خبر دیتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: عنقریب تو میں تم پر ٹوٹ پڑنے کے لئے بلاوا دیں گی۔ جیسے بھوکے (جانور) کھانے پر ٹوٹ پڑنے کے لئے بلاوا دیتے ہیں۔ (ابوداؤد، بیہقی)

اس اندوہناک صورت حال سے زیادہ کرب کی بات یہ ہے کہ امت مسلمہ — جو دنیا کی وہ واحد گروہ ہے جسے ماضی، حال اور مستقبل کا کافی علم (ماکان وماھو کائن) دیا گیا — آج حیران اور ناواقف راہ بھٹک رہی ہے۔ اور دنیا کی تاریکیوں سے روشنی کی بھیک مانگ رہی ہے۔ چودہ صدیوں بعد اب آثار قیامت کے ظاہر ہونے کی رفتار تیز ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے گویا کوئی ہار ٹوٹ جائے اور یکے بعد دیگرے دانے گرنے لگیں۔

ان حالات کا تقاضا تھا کہ قرآن و قول رسول کی روشنی میں امت کی صورت حال کا گہرائی سے جائزہ لیا جاتا، موجودہ حالات کی تبدیلی کو صحیح زاویہ سے دیکھا جاتا اور آئندہ کے لئے خطوط کار کی نشاندہی کی جاتی تاکہ یہ امت اپنے فرض منصبی کو مکمل حقہ سرانجام دے کر پوری انسانیت کو کامیابی سے ہمکنار کرے۔ چنانچہ انہیں امور کو پیش نظر رکھ کر یہ سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس میں مختلف عناوین کے تحت بحث کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کوشش کو قبول فرمائے اور اس میں برکت عطا فرمائے۔

انہ سمیع قریب عجیب

مقدمہ

اللہ تعالیٰ کا فضل خاص ہے کہ یہ عاجز ”سرسید کی بصیرت“ امت کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔ الحمد للہ علی ذلک۔

صورت حال کی ناز کی بڑھتی جا رہی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ امت کی ذمہ داریاں بھی۔ صورت حال کی ناز کی اس کی متقاضی ہے کہ اس کتاب کے محتویات سے امت کا ہر خاص و عام زیادہ سے زیادہ اور جلد از جلد واقف ہو جائے۔ لہذا امید ہے کہ قارئین اور بالخصوص اہل ہمم حسب استطاعت اسے عام کرنے کی سعی فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اس کوشش کو قبول فرمائے اور اس میں برکت عطا فرمائے۔

واللہ المستعان وعلیہ التکلان

اسرار عالم

تکھید

ہندوستان، اس کے باشندگان بالعموم کروڑوں عوام جو مختلف نسلوں، مذاہب، زبانوں، تہذیبوں، ثقافتوں، جغرافیائی صورتوں (Features)، عادات اور طبائع سے تعلق رکھتے ہیں اور مختلف نسلی، علاقائی، لسانی، ثقافتی، تہذیبی اور جغرافیائی ناموں سے پکارے جاتے ہیں اور بالخصوص مسلمانوں کا جو ان سب کے علی الرغم ہندوستان میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک اپنی صرف ایک ہی شناخت رکھتے ہیں اور اسی نام 'مسلمان' سے پکارے جاتے ہیں عاجز برسوں سے غائر مطالعہ کر رہا تھا۔ ابتداءً عاجز کے پیش نظر موضوعات تھے: مسلمانوں کی مخصوص شناخت؛ ہندوستانی معاشرے میں ان کا منفرد توازن قائم کرنے والا کردار؛ ہندوستان جو ہزاروں سالوں سے چھوٹے چھوٹے جغرافیائی یا ثقافتی مگر باہم اجنبی خطوں کا مجموعہ تھا اسے تاریخ میں پہلی بار 'ہندیا' ہندوستان کے نام سے سیاسی وحدت عطا کر دینے کی مسلم روایت؛ اسی روایت کو مستحکم کرنے کے لئے ہند کے طول و عرض میں پہلی بار ایک 'عوامی قومی زبان رابطہ' (National Lingua Franca) 'اردو' کا ایجاد اور اسے مستحکم کرنے کے لئے مسلمانوں کا اپنے اپنے جغرافیائی اور علاقائی شناخت اور ان سے وابستہ بعض مفادات کی قربانی اور اس حوالے سے ان کا ایثار تا کہ سارا ہندوستان ایک مستحکم وحدت کی شکل اختیار کر لے۔ [اس مطالعے کا داعیہ غالباً دو کتابوں کے مطالعے سے ساٹھ کی دہائی میں پیدا ہوا پہلی: قرۃ العین حیدر کی کتاب 'آگ کا دریا' (1959) اور

دوسری پروفیسر محمد مجیب کی کتاب 'انڈین مسلمس' (1967)۔ دورانِ مطالعہ ایک ہولناک تاریخی حقیقت ابھر کر سامنے آنے لگی۔ وہ ہولناک تاریخی حقیقت تھی گزشتہ تین سو سالوں سے ان کا مسلسل زوال و انحطاط اور اس کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ۔ چنانچہ اس ہولناک تاریخی حقیقت نے مطالعے کو مزید وسیع اور از حد گہرا کر دیا۔ نئے حقائق (Facts & Data) کے سامنے آ جانے کے بعد عاجز کے مطالعے کا دائرہ مزید وسیع اور متعدد والا بعا د ہو گیا جن کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱۔ دنیا میں بالعموم اور ہندوستان میں بالخصوص زندگی کے جملہ شعبوں میں گزشتہ تین سو سالوں کے دوران وقوع پذیر ہونے والے واقعات و حادثات اور ان کے پس منظر، مضمرات اور عواقب کا دقیق جائزہ۔

۲۔ گزشتہ تین سو سالوں کے دوران ہندوستانی مسلمانوں کو درپیش چیلنجز (Challenges) اور ان کا جوابی عمل (Response)۔

۳۔ ان تین سو سالوں میں مسلمانوں کی زندگی کے جملہ میدانوں اور سطحوں پر زوال اور انحطاط کی نہ ختم ہونے والی صورتحال۔

۴۔ بیسویں صدی میں مسلمانوں کے زوال و انحطاط کا بدترین سطح تک پہنچ جانا۔

۵۔ گزشتہ تین سو سالوں کے دوران درپیش چیلنجوں (Challenges) پر مسلمانوں کے جوابی عمل (Response) کا غیر موثر (Ineffective)، خدنگ جتہ (Misfire)، ناکافی (Inadequate)، اور بے محل (Misfit) ہونا لہذا ناکام (Unsuccessful) ہو جانا۔

۶۔ درپیش چیلنجوں، ان کی حقیقت، قوت اور سرعت سے متعلق مسلمانوں کے نادرست شعور، علم، ادراک اور فہم کے اسباب و علل۔

۷۔ درپیش چیلنجوں پر مسلمانوں کی جانب سے جوابی عمل (Response) کی حقیقت، قوت اور سرعت کے نادرست شعور، علم، ادراک اور فہم کے اسباب و علل۔

۸۔ کیا مسلمانوں کی جانب سے درپیش چیلنجوں پر جوابی عمل خلاف حقیقت (Unreal)، خلاف واقعیت (Fictitious)، غیر معقول (Irrational)، غیر انسانی (Inhuman)،

غیر اخلاقی (Unethical)، غیر اسلامی (UnIslamic)، خلاف سنت الہی (Anti-Islamic) اور خلاف رضا الہی (Anti-Divine) تھے؟

- ۹۔ گزشتہ تین سو سالوں میں رونما ہونے والے حوادث کے پیچھے مشیت الہی کیا تھی؟
- ۱۰۔ گزشتہ تین سو سالوں میں رونما ہونے والے حوادث کے تعلق سے ارادہ الہی کیا تھا؟
- ۱۱۔ گزشتہ تین سو سالوں میں رونما ہونے والے حوادث کے تعلق سے رضا الہی کیا تھی؟
- ۱۲۔ گزشتہ تین سو سالوں سے مسلمانوں کی زندگی کے جملہ شعبوں میں احمد اہل مسلسل (Free Fall) کیا ان کے 'معتوب' ہو جانے کی علامت ہے؟

۱۳۔ گزشتہ تین سو سالوں سے مسلمانوں کی زندگی میں Free Fall کیا اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس بات کا اظہار ہے کہ اب یہ قوم 'ولا یخاف عقبہا' (91:15) کے حدود میں داخل ہو گئی ہے؟

۱۴۔ کیا یہ قوم تاریخ کی سابقہ دیگر اقوام کی طرح خود کو اللہ کی محبوب و برگزیدہ قوم سمجھنے کی ناقابل اصلاح خوش فہمی میں مبتلا ہو چکی ہے؟

۱۵۔ کیا سنت اللہ کے عین مطابق اب اس قوم کا تاریخی خاتمہ ایک یقینی امر ہے؟

۱۶۔ کیا سنت اللہ کے عین مطابق انھیں ذمہ داریوں کے ساتھ کوئی دوسرا انسانی گروہ برپا ہونے والا ہے؟ کیا بحیثیت امت مسلمہ محمد یہ کسی اور انسانی گروہ کی بعثت ہونے والی ہے؟

عاجز کے غائر مطالعے کا خلاصہ درج ذیل ہے:

- ۱۔ مسلمانوں کے زوال اور انحطاط کا بنیادی سبب تکلیف (Conditioning) ہے۔
- ۲۔ مسلم معاشرے میں اس تکلیف (Conditioning) کو قائم کرنے والے 'حکمران' اور 'علماء' تھے۔
- ۳۔ مسلم معاشرے کو صدیوں تک اس تکلیف (Conditioning) میں مقید رکھنے والے 'علماء' تھے۔
- ۴۔ مسلم معاشرے کو صدیوں کی اس تکلیف (Conditioning) اور اس کے نتیجے میں آئے زوال و انحطاط سے نکلنے کی واحد راہ 'ارتقائی نظام تعلیم' (Progressive Educational System) ہے۔

۵۔ 'ارتقائی نظامِ تعلیم' کی سب سے احسن تدبیر فی زمانہ 'سر سید کی بصیرت' (Vision of Sir Syed) میں مضمون ہے۔

۶۔ 'ارتقائی نظامِ تعلیم' یا سر سید کی بصیرت پر عمل آوری میں سب سے بڑی رکاوٹ 'علما' ہیں۔

1980 سے جاری اس مطالعے میں ایک مرحلہ ایسا بھی آیا جب 'سر سید کی بصیرت' غور و فکر کا مرکز بن گئی۔ ظاہر ہے اس کے بعد اس مطالعے کا رخ اس بصیرت کی عملی تعبیر یعنی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی جانب مڑ جاتا۔ چنانچہ مطالعے کا اب مرکز المراكز مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ بن گئی۔ یوں بھی متعدد وجوہ سے اس سے قبل بھی یہ یونیورسٹی غور و فکر کا مرکز المراكز تھی۔ ہندوستانی مسلمانوں کے حقیقی احوال، ان کی تاریخ اور مسلم نفسیات کی پیچیدگیوں کے ادراک کے لئے مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ اگر ہندوستان عالم کبیر (Macrocosmos) ہے تو مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ عالم صغیر (Microcosmos)۔

چنانچہ عاجز کے لئے ناگزیر ہو گیا کہ وہ جا کر 'مادرِ علمی' مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے موجودہ احوال بچشمِ خود دیکھے اور 'سر سید کی بصیرت' اب تک کیا برگ و بار لائی ہے اس کا جائزہ لے۔

مشاہدات

۱۔ ”کیا مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ اپنا مقصد وجود (Raison d'etre) مکمل طور پر کھو چکی ہے؟“
آج مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ جا کر ذہن میں آنے والا سب سے پہلا سوال یہی ہوتا ہے۔ وہاں کی ذہنی، فکری، علمی، تعلیمی، تدریسی، تدریجی، اخلاقی اور معاشرتی صورت حال کا پچھتم خود مشاہدہ کر کے ایک باخبر اور حساس انسان تاریخ کے ان ہولناک منظر ناموں میں کھو جاتا ہے جن کے نتیجے میں یہ عظیم الشان یونیورسٹی قائم ہوئی تھی۔ تاریخ کا ہر موڑ اور تاریخی شاہراہ کا ہر سنگ میل اس سے سوال کرتے ہیں: یہ یونیورسٹی کس پس منظر اور کن حالات میں قائم کی گئی تھی؟ اس کے بانی مہمانی کے پیش نظر اصل خاکہ کیا تھا؟ کیا سرسید کا قائم کردہ مدرسۃ العلوم رایننگلو محمدن اور نینٹل کالج علی گڑھ (1875) جو 1920 میں مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے نام سے موسوم ہوا سرسید کے بعد فی الواقع انھیں خطوط اور بعینہ انھیں اصولوں پر پروان چڑھا جو اس کا اصل خاکہ تھا؟ کیا وہ تعلیم گاہ اب بھی انھیں خطوط پر قائم ہے یا اب ان اصولوں اور مقاصد کا گورستان (Graveyard) بن کر رہ گیا ہے؟

۲۔ کیا مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ امت میں اصلاح و تعمیر کرنے والوں کا کشت زار (Nursery) ہے یا ٹرین، ممرض، معطل، مفلوج اور ناکارہ لوگوں کا عیش گاہ؟

۳۔ کیا مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ رفتہ رفتہ بے علم، بے ہنر، ناکارہ، بے حوصلہ، بے مقصد، بے عزم،

ژولیدہ فکر، ریاکار، خود غرض، ذہنی غلام، ہوس پرست، بے حس، بے غیرت، در یوزہ گر، زلہ ربا، کاسہ لیس، حاشیہ بردار اور اُلش نصیب طفیلیوں (Parasites) کا مسکن (Habitat) اور مامن (Safe Haven) بن کر رہ گئی ہے؟

۴۔ بالخصوص گزشتہ ساٹھ سالوں کے دوران مسلم یونیورسٹی کورٹ (Muslim University Court)، اکادمک کاؤنسل (Academic Council) اور اکیڈمیکیوٹیو کاؤنسل (Executive Council) کے علمی (Intellectual)، تعلیمی (Academic)، تدریسی (Pedagogical)، نصابی (Curricular)، تربیتی (Institutional)، معی (Educational)، ہدایتی (Instructional)، توسیعی (Developmental)، اور انتظامی (Executive) فیصلوں (Decisions) اور ہدایات (Rulings) کے بیشتر حصوں کو دیکھتے ہوئے قطعاً محسوس نہیں ہوتا کہ یہ ایسے ایوانوں اور کمیٹیوں کے لئے کئے فیصلے ہیں جو صاحبان بصیرت (Visionaries) اور خلاق (Innovative) یا کم از کم باخبر (Informed) لوگوں کی معمولی اکثریت پر بھی مشتمل ہوں۔

ہمدوم متبدل ماحول کے باوجود ایک ایک فیصلے کا تجزیہ یہی باور کراتا ہے کہ فیصلے کرنے والوں کی اکثریت دماغی اور ذہنی طور پر Sterile، Visionless اور Mediocre افراد پر مشتمل ہوگی جن کے طبائع Moron اور Parasitic ہو چکے ہوں اور جن کی شخصیت میں ایسے رجحانات راسخ ہو چکے ہوں جنہوں نے انہیں مکمل طور پر Uncle، Poodle، Nincompoop، Humpty Dumpty اور Tom بنا دیا ہو۔

انسانی تاریخ گونا گوں احوال سے عبارت ہے۔ اس نے بدترین اور ہولناک مظالم میں مبتلا قوموں کو دیکھا ہے اور بدترین اور ہولناک مظالم کرنے والے نظاموں اور حکمرانوں کو بھی۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ بدترین مظالم کرنے والے نظام اور حکمران بھی بدترین و ہولناک ابتلا سے گزرنے والی قوموں میں پائے جانے والے صاحبان بصیرت (Visionaries) کی راہ روک دینے میں ناکام ہو گئے۔ الحمد للہ، بھارت میں مسلمان اب تک ایسی صورتحال سے کبھی دوچار نہیں ہوئے۔ یہاں مسلمانوں کے احوال اب تک کبھی ایسے نہیں رہے جنہیں تاریخ میں برے احوال سے موسوم کیا جاتا ہے۔ بلکہ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ گزشتہ ساٹھ سالوں میں بھارت میں مسلمانوں کے احوال مجموعی طور پر اتنے اچھے اور 'موافق' رہے ہیں کہ درجنوں مسلم ملکوں کے عوام اس پر رشک کریں تو بے جا نہ ہوگا۔

۵۔ وہیں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ گزشتہ ساٹھ سالوں میں بھارت میں 'مسلم قیادت' کا رویہ عموماً منفی، سلبی اور ناقابل فہم رہا ہے۔ گزشتہ ساٹھ سالوں میں 'مسلم قیادت' کے ذریعہ برپا کی جانے والی تحریکیں اور ان کے نعرے مسلمانوں کی توجہ کے خاص مرکز رہے۔ ان تحریکوں میں بعض ہمہ گیر اور پر شور تھیں مثلاً 'اردو بچاؤ تحریک'، 'مسلم یونیورسٹی بچاؤ تحریک' اور 'مسلم پرسنل لائحہ عمل تحریک' وغیرہ۔ لیکن یہ نظر غائر مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ ان تحریکوں کے پس منظر میں کوئی سنجیدگی تھی نہ مدبرانہ فکر۔ 'مسلم قیادت' کے ذریعہ چلائی جانے والی اکثر تحریکیں محض رد عمل (Reactionary) اور بالذات غرضی (Ad-hoc) تھیں۔ عام مسلمان ان تحریکوں اور ان کے نعروں کی حقیقت سے کم ہی واقف ہوئے۔ یہ تحریکات، ان کے نصب العین، ان کے طریقہ کار، ان طریقوں کی عملیت، ان تحریکوں کے نعرے، ان کی کارکردگی اور ان کے برآمد ہونے والے نتائج، مضمرات اور عواقب کبھی زیر بحث لائے نہیں گئے بالخصوص انہیں برپا کرنے والی 'مسلم قیادت' کے ذریعہ۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نعرے قومی اور ملی نصب العین نہیں تھے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ یہ 'نعرے' تھے ہی نہیں بلکہ ایسے جذباتی، دلکش اور عوامی 'Clutches' تھے جن کا مقصد عوام کے شعور کو بیدار کرنے کی بجائے ان کے جذبات کو برا بیچختہ کرنا تھا۔ جذبات کو ابھارنا شعور کو مغلوب کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ ممکن ہے خالی الذہن 'مسلم قیادت' کو رد عمل (Reaction) میں بالذات غرضی (Ad-hoc) ہی ترکیب سوچھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا اصلی سبب ان کا مزاج (Temperament) ہو۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ 661 عیسوی کے بعد 'مسلم قیادت' کو کبھی 'عوامی تحریک' چلانے کا تجربہ نہیں ہوا۔ 'مسلم قیادت' نے کبھی عوام کو مخاطب کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ مسلم تاریخ میں پائی یا سمجھی جانے والی 'عوامی حرکات' (Public Mobilizations) کبھی بھی دو طرفہ (Two-way) اور بین الاقوامی (International) نہیں تھیں جو غیر ملکی (Unconditioned) ماحول میں واقع ہوئی ہوں۔ ایسی تمام 'عوامی حرکات' ہمیشہ یک طرفہ (One-way) اور خالصتاً قومی (Purely National) ہوتی ہیں جو 'صدفی صد ملکیف' (Strictly Conditioned) ماحول میں واقع ہوتی ہیں۔

'اردو بچاؤ تحریک'، 'مسلم یونیورسٹی بچاؤ تحریک' اور 'مسلم پرسنل لائحہ عمل تحریک' اور ان کے نعرے غیر معمولی جاذب اور جذباتی تھے۔ 'مسلم قیادت' نے شعوری طور پر ان تحریکوں کو برپا اور ان نعروں کو بلند کیا۔ ہر عمل کے پیچھے مقاصد ہوتے ہیں۔ مسلمانوں نے ان تحریکوں کو حقیقت اور ان نعروں کو نصب العین سمجھا۔ یہ غلطی سراسر عوام کی تھی۔ 'قیادت' کے نزدیک ان کے مقاصد کچھ اور تھے۔ آج جب ان تحریکوں کو

برپا اور ان نعروں کو بلند ہوئے نصف صدی بیت چکی ہے یہ بات واضح تر ہوتی جا رہی ہے کہ 'قیادت' ان نعروں کے ذریعہ بظاہر دو مقاصد کا حصول چاہتی تھی:

۱۔ 'مسلم قیادت' کے Status quo کو برقرار رکھنا۔ اور

۲۔ اس 'قیادت' کے لئے مسلمانوں میں آئندہ قابل اعتماد متبعین (Followers) پیدا کرنا۔

ان دو مقاصد کے تناظر میں ان تمام تحریکوں میں سب سے دور رس نتائج کی حامل تحریک تھی 'مسلم یونیورسٹی بچاؤ تحریک'۔ 'مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ' مسلم تاریخ میں واقع ہونے والا ایک معجزہ تھی۔ چنانچہ گزشتہ نصف صدی میں اس تحریک کے ذریعہ اور اس کے جلو میں 'مسلم قیادت' نے قابل اعتماد متبعین پیدا کرنے میں صد فی صد کامیابی حاصل کر لی۔ آج مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ 'مسلم قیادت' کے لئے قابل اعتماد متبعین پیدا کرنے والا زرخیز کشتزار (Nursery) بن گئی ہے۔

۶۔ بھارت میں گزشتہ ساٹھ سالوں کے دوران 'مسلم قیادت' کے ذریعہ بلند کئے جانے والے نعروں (Clitches) کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا 'انتہائی جاذب' (Extremely Attractive) ہونا ہے۔ عام طور پر یہ نعرے کم از کم چار ابعاد (Dimensions) کے حامل رہے ہیں:

۱۔ حکومت کی جانب سے مسلمانوں کی حق تلفی

۲۔ اکثریتی فرقے کے مظالم اور ان کے ذریعہ مسلمانوں کی حق تلفی

۳۔ مسلمانوں کا مسلسل جانی و مالی استئصال (Extermination)

۴۔ مسلمانوں کا مسلسل ثقافتی اور تہذیبی استئصال (Extermination)

'مسلم قیادت' کے ذریعہ برپا کی گئی تحریکوں اور ان کے نعروں کے زیر اثر مسلمانوں کے ذہن و فکر میں یہ بات راسخ ہو گئی کہ مسلمانوں کی پس ماندگی (Backwardness) اور استئصال (Extermination) میں اور بالخصوص مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے زوال اور اردو کے خاتمے میں سر تا سر حکومت اور اکثریتی فرقے کا ہاتھ ہے۔ مسلمانوں کے مابین یہ امور کبھی سنجیدگی کے ساتھ زیر بحث ہی نہیں آئے۔ ان کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہیں آئی کہ اس پس ماندگی (Backwardness) اور استئصال (Extermination) کی اصل ذمہ دار 'مسلم قیادت' ہے۔ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ بھارت جیسے جمہوری ملک میں مسلمانوں کے مسائل، ان کی پس ماندگی (Backwardness) اور استئصال

(Extermination) کو حکومت نے کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا۔ اس کی بنیادی وجہ حکومت کی 'عدم توجہی' (Unattentiveness) نہیں بلکہ 'مسلم قیادت' کی 'غیر سنجیدگی' تھی۔ امر واقعہ یہ ہے کہ حکومت محض اس لئے 'عدم توجہی' کا شکار اور اپنے فرض منصبی کی ادائیگی میں ناکام ہو گئی کہ اس نے 'مسلم قیادت' کو کبھی واضح (Clear)، سنجیدہ (Serious)، صاف (Unambiguous)، اور قابل اعتماد (Faithful) نہیں پایا۔ حکومت کی کارکردگی (بہ حوالہ پلاننگ کمیشن اور تمام پانچ سالہ منصوبے) یہ بتاتی ہے کہ گزشتہ ساٹھ سالوں میں اس نے جس طبقے کی قیادت کو جتنا واضح، سنجیدہ، صاف اور قابل اعتماد پایا ہے اس کے مطالبات کو اسی قدر موثر طور پر پورا کیا۔

جہاں تک برادرانِ وطن بالخصوص اکثریتی فرقے کی بات ہے تو ان کے جس عمل کو 'تعصب' کا نام دیا جاتا ہے وہ دو احوال سے خالی نہیں۔ اولاً مسابقت (Competition) اور ثانیاً اخلاقی بدسلوکی (Immoral Treatment)۔ اول الذکر معاملات میں اسی فیصد واقعات اس اعتبار سے واقع ہوئے کہ مسلمانوں کی استعدادی پس ماندگی (Potential Backwardness) محرومی کا اصل سبب تھی جسے 'تعصب' کا نام دیا گیا۔

ثانی الذکر بلاشبہ ایک حقیقت اور قابل توجہ امر ہے۔ لیکن اس کی حقیقت قطعاً ایسی نہیں جیسی عموماً ظاہر کی جاتی ہے۔ اس کو 'تعصب' کا نام دینا محض 'تعبیر' ہے۔ ایسا ہوتا ہے یہ ایک امر واقعہ ہے۔ لیکن اس کی حقیقت Circumstantial ہے۔ ایسی اخلاقی بدسلوکی (Immoral Treatment) محض اکثریتی فرقے کی نہیں بلکہ معاشرے میں موجود ایک عام انسانی کمزوری ہے۔ اس کا تعلق معاشرے اور اخلاق سے ہے۔ اکثر ایسا دیکھا گیا ہے کہ اگر ایسی مبینہ اخلاقی بدسلوکی میں فریقِ ثانی اکثریتی فرقے سے متعلق فرد ہوا تو اسے 'آسانی' اکثریتی فرقے کا 'تعصب' سمجھا اور قرار دے دیا جاتا ہے۔ اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ایسی اخلاقی بدسلوکی کے سب سے زیادہ مرتکب خود مسلمان ہوتے رہتے ہیں۔ سنی، شیعہ، مقلد، غیر مقلد، دیوبندی، بریلوی، مسلم پس منظر رکھنے والے ترقی پسند، کانگریسی، غیر کانگریسی، اشتراکی ہمہ دم آپس میں روزانہ اور بدترین طور پر ایسی اخلاقی بدسلوکی کرتے رہتے ہیں۔ اس اخلاقی بدسلوکی کا حال یہ ہے کہ باہم مسابقت میں اگر دو دیوبندی آمنے سامنے ہیں مثلاً ایک مغربی یوپی اور دوسرا بہار کا تو ایسا تعصب وہاں بھی جلوہ گر ہوتا ہے۔ اس 'تعصب' کی انتہا یہ ہے کہ مثلاً اگر مسابقت میں دو ایسے دیوبندی ہیں جن میں دونوں دارالعلوم دیوبند کے فارغین ہیں تو پھر اس 'تعصب' کی بنیاد ہوگی کہ کون کس

شیخ سے وابستہ ہے۔ کیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت کا اس کی تاسیس سے بلا فصل اب تک ایک طبقے کے پاس ہونا اس 'تعصب' کے زمرے میں نہیں آتا؟ کیا پروفیسر محمد حسن مرحوم کی خوبیوں میں اس واقعے کا ذکر کہ جب جھارکھنڈ کی ایک یونیورسٹی میں لیکچرر کی ایک اسامی کے لئے انہوں نے متعدد ترقی پسند اور قربت رکھنے والے امیدواروں کو نظر انداز کر کے ایک مدرسہ سے فارغ عالم دین کو محض میرٹ کی بنیاد پر منتخب کر لیا، اس بات کا شاہد نہیں کہ ایسا 'تعصب' ہر طبقے میں عام ہے۔

[ملاحظہ فرمائیں: پروفیسر عبدالحق: جس کا انداز نظر اپنے زمانے سے جدا: ایوان اردو، دہلی، جون

[۲۰۱۰، صفحہ ۲۰]

۷۔ گزشتہ ساٹھ سالوں سے زاید عرصے سے 'مسلم قیادت' بالعموم مسلمانان ہند اور بالخصوص مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے تناظر میں جن باتوں مثلاً:

۱۔ حکومتی حق تلفی،

۲۔ اکثریتی طبقے کا تعصب،

۳۔ مسلمانوں کا مسلسل جانی و مالی استتصال (Extermination)، اور

۴۔ مسلمانوں کا مسلسل ثقافتی و تہذیبی استتصال (Extermination)۔

کی بات کہتی رہی ہے اگر فی الواقع وہ حقیقت ہوتی جب بھی انسانی تاریخ میں ایسا ہونا کسی با بصیرت (Visionary)، پر عزم (Firm & Determined) اور با مقصد (Object Bound) قیادت کے زیر سایہ کسی قوم کے لئے ایک قلیل مدتی ظاہرہ (Short-term Phenomenon) سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ انسانی تاریخ خود اس بات کی شاہد ہے کہ 'معاشرت' ایک ہمہ دم متبدل ظاہرہ (Comprehensively Changing Phenomenon) ہے۔ اس کے تقریباً تمام عوامل (Factors) کیف و کم کے اعتبار سے متغیرات (Variables) واقع ہوئے ہیں۔ انسانی تاریخ میں حوادث (Events) نام ہے معاشرت کے ایک یا ایک سے زائد عوامل (Factors) کے ہمہ دم تبدیل ہو کر نئی صورتحال (New Circumstances)، نئی ترجیحات (New Priorities)، نئی جہات (New Dimensions)، نئے امکانات (New Possibilities) اور نئے مواقع (New Opportunities)، پیدا کرنے کا۔ کسی قوم کی با بصیرت (Visionary)، پر عزم (Firm & Determined)

(Determined)، صاف گو (Unambiguous) اور بامقصد (Object Bound) قیادت ان ہمہ دم متبدل احوال کا مقابلہ اور اک کرتے ہوئے خلاقانہ تفکر، تدبیر اور تعمیل کے ذریعہ قومی اہداف کے حاصل کرنے میں قوم کی سربراہی کرتی ہے۔ انسانی معاشرے میں تبدیلی لانے والے بنائی عوامل (Tectonic Factors) کو تین عنوانات کے تحت یکجا (Club) کیا جاسکتا ہے:

۱۔ قوم کی حرکت: یعنی قوم کے اندر پائی جانے والی احتسابی اور اصلاحی قوت کار اور ان کے گونا گوں مظاہر،

۲۔ دنیا میں جاری مشیت: یعنی طبیعی قوانین (Physical Laws) اور ان کے مظاہر،

۳۔ دنیا میں جاری سنت اللہ: یعنی بنی نوع آدم میں جاری سنت اللہ اور ان کے مظاہر۔

انسانی تاریخ شاہد ہے کہ ہمہ دم تبدیلی لانے والے بنائی عوامل (Tectonic Factors) کسی وقوعہ (Event) سے پیدا ہونے والی صورتحال (Circumstance) کو محض پچاس سالوں میں بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ چنانچہ کسی وقوعے (Event) کے سبب کسی قوم پر عارض ہو جانے والی بدترین صورتحال بھی پچاس سالوں سے زیادہ عرصے تک برقرار نہیں رہ سکتی الا یہ کہ خود اس قوم کے اندر تبدیلی لانے والے ان بنائی عوامل (Tectonic Factors) کے ذریعہ ڈالے جانے والے اثرات اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والی نئی صورتحال (New Circumstances)، نئی ترجیحات (New Priorities)، نئی جہات (New Dimensions)، نئے امکانات (New Possibilities) اور نئے مواقع (New Opportunities) اور ان سے استفادہ کرنے والے داعیات کو بے اثر (Neutralise) کرنے والی قوت موثر طور پر کام نہ کر رہی ہو۔

بعض اوقات ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ بدترین حالات میں مبتلا قوم کے بعض طبقات کے اندر منفی (Negative) اور سلبی (Passive) رجحانات ارتجالاً یا اضطراباً ظہور پذیر ہو جاتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہونے والا ایسا منفی اور سلبی رجحان دیر پا نہیں ہوتا۔ با بصیرت (Visionary)، پر عزم (Firm & Determined)، صاف گو (Unambiguous) اور بامقصد (Object Bound) قیادت کے زیر سایہ بہت جلد مثبت (Positive)، ایجابی (Affirmative)، اقدامی (Assertive) اور تعمیری (Constructive) بلکہ عہد ساز (Historic) جوابی عمل (Response) ظہور پذیر ہونے لگتے

ہیں۔ تاریخ اس بات کی بھی شاہد ہے کہ انتہائی نامساعد حالات میں با بصیرت (Visionary) اور خلاق (Innovative) قیادت کے ذریعہ کئے گئے اقدامات اکثر تاریخ ساز (Historic) ہو جاتے ہیں۔

گزشتہ تین سو سال سے ہندوستان میں مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے میں جاری زوال و انحطاط اور ان میں فکری، علمی، سیاسی، معاشرتی، معاشی، اخلاقی اور روحانی انحدر شدید (Free Fall) کی کیفیت انسانی تاریخ میں وقوع پذیر ہونے والے بے نظیر واقعات (Unprecedented Events) ہیں۔ انسانی تاریخ میں تبدیلی کے مذکورہ تین بنائی عوامل (Tectonic Factors) کی موجودگی میں ایسا ہونا از حد حیران کن اور ناقابل فہم ہے۔

ملاحظہ فرمائیں:

1. A.G. Noorani (ed): The Muslims of India: A Documentary Record; Oxford University Press; Fifth Impression: 2011
2. Basant & Shariff (ed): Handbook of Muslims in India: Empirical & Policy Perspectives; Oxford University Press: 2010
3. Gayer & Jaffrelot (ed): Muslims in Indian Cities: Trajectories of Marginalisation; HarperCollins Publishers India: 2012
4. Prof. Muhammad Mujeeb: The Indian Muslims: Last Two Chapters, George Allen & Unwin: London: 1967

انکشافات

۱۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ گزشتہ ساٹھ سالوں سے مسلسل انخطاط کا شکار ہے۔ رفتہ رفتہ یونیورسٹی میں آنے والا یہ انخطاط گزشتہ صدی کی ساٹھ کی دہائی میں انحدار شدید (Free Fall) کی صورت اختیار کر گیا۔ آج مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں فکری، علمی، تعلیمی، تدریسی، تحقیقی اور اخلاقی صورتحال ناگفتہ بہ ہے۔ یہ صورتحال نہ صرف مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے بلکہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے ہمہ گیر انخطاط کی عکاس ہے۔ یہ صورتحال اس بات کو بھی واضح کرتی ہے کہ انخطاط مسلم معاشرے میں کس درجہ راسخ ہو چکا ہے۔

۲۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ جا کر پچشم خود مشاہدہ اور برسر زمین (On the Spot) جائزہ یہ بتاتے ہیں کہ وہاں موجود تمام بارہ فیکلٹیوں اور ان کے تحت قائم تقریباً سوشیوں، اداروں اور مراکز میں مخلص، پیشہ ورانہ طور پر ذمہ دار اور جواب دہ، انتھک محنت کرنے والے، صاحب بصیرت، صاحب جودت، بے لوث، مستقبل آگاہ اور بیدار مغز اساتذہ اور برسرکار اہل فن کی تعداد کتنی سرعت کے ساتھ کم ہوتی جا رہی ہے۔ گزشتہ پچاس سالوں میں ان کے اعصاب پر مسلسل نہایت برے اثرات مرتب ہونے کا سلسلہ جاری ہے چنانچہ ایسے اشخاص اب برائے نام رہ گئے ہیں وہ بھی بے بس، مجبور، بے نوا، غیر موثر، محصور اور اچھوت (Untouchable)۔

۳۔ ان کے برخلاف گزشتہ ساٹھ سالوں کے دوران مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں بے علم، غیر مخلص،

پیشہ و رانہ طور پر غیر ذمہ دار اور غیر جوابدہ، ناکارہ، بے بصیرت، خود غرض اور تھڑولے اساتذہ کی تعداد تیزی سے بڑھتی چلی گئی۔ ظاہر ہے 'مسلم قیادت' کی ترجیحات، مسلم معاشرے کے بدلتے احوال، مسلم یونیورسٹی کورٹ، اکادمک کاؤنسل، ایکزکیوٹیو کاؤنسل اور سب سے بڑھ کر خود امیدواران کی اپنی طبع اس کی اصل ذمہ دار ہے۔ آج ایسے افراد یونیورسٹی سے باہر اور یونیورسٹی کے اندر تقریباً حاوی، بارسوخ، موثر اور ہمہ گیر ہو چکے ہیں۔

۴۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں گزشتہ ساٹھ سالوں میں علم اور تحقیق کی تمام اساسیات (Fundamentals) منجمد ہو کر رہ گئی ہیں۔ علم (Knowledge)، معلومات (Informations)، حساسیت (Sensitivity)، مستقبل آگاہی (Prescience)، ادراک (Perception)، تحقیق (Research) اور تخلیق (Creativity) کی دنیا میں خیال (Idea)، فرضیہ (Hypothesis) اور نظریات (Theories) دینے، دانشی اختراق (Intellectual Break-through) کرنے، مرجع گروہ (Reference Group) اور حکم (Referee) بننے اور بنے رہنے کی Potential Ability مفقود ہو گئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے اساسی (Fundamental) شعبے اپنی حرارت غریزی کھو چکے ہیں۔ شعبہ تاریخ، شعبہ السنہ، شعبہ لسانیات، شعبہ دینیات، شعبہ علوم اسلامیہ، شعبہ طبیعیات، شعبہ کیمیا، شعبہ حیاتیات، شعبہ ریاضی، شعبہ جغرافیہ، شعبہ ارضیات وغیرہ کم و بیش علم اور تحقیق کے اعتبار سے بظاہر گورستان (Graveyard) میں بدل چکے ہیں۔ ان شعبوں میں ایسے مضامین اور اصناف کی تعلیم و تدریس جن سے فرد اور معاشرے میں Potential استعداد پیدا ہوتی ہے، مضامین اور اصناف کے ایسے گوشوں پر تحقیق اور تحقیقی صلاحیت پیدا کرنا جن سے ان مضامین میں فرد اور معاشرے کو تحقیقی تخصص حاصل ہوتا ہے، ان تخصصات کے ایسے افادے جن سے کسی فرد، یونیورسٹی اور معاشرے کا 'علمی تفوق' یقینی ہو جاتا ہے رفتہ رفتہ ختم کر کے رکھ دیئے گئے ہیں۔

مسلمانوں میں عام طور پر یہ بات پھیلی ہوئی اور تسلیم شدہ ہو گئی ہے کہ ان تباہیوں کی سراسر ذمہ داری حکومت کی 'عدم توجہی' اور اکثریتی فرقے کے 'تعصب' پر جاتی ہے۔ 'مسلم قیادت' اور ملت میں پھیلے ان کے اعضاء، جو ارح اور ذرائع ابلاغ نے امت کو عام طور پر یہی تاثر دیا ہے۔ بہ نظر غائر مطالعہ، مشاہدہ اور تجزیہ اسے نادرست قرار دیتے ہیں۔ یہ سراسر خلاف واقعہ اور بے اصل بات ہے۔ سب سے افسوسناک بات یہ ہے کہ خود حکومت اور اکثریتی فرقے نے اس بے اصل الزام کی کبھی موثر اور مدلل تردید

نہیں کی۔ بفرض مجال اگر اس 'عدم توجہی' اور 'تعصب' کے الزام کو صد فی صد حقیقت واقعہ بھی تسلیم کر لیا جائے جب بھی ایسے بدترین نتائج جو مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ پر مرتب ہوئے اور اساسیات (Fundamentals) کی اس تباہی کا جو وہاں دیکھی جاسکتی ہے جواز ثابت نہیں ہوتا۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں اساسی شعبوں کی تباہی میں بنیادی ہاتھ خود 'مسلم قیادت' کا ہے۔

گزشتہ دو سو سالوں میں دنیا میں بعض قومیں ایسی 'عدم توجہی' اور 'تعصب' سے سو گنا بڑے مظالم کے باوجود محض اپنی بصیرت، عزم، دیانت داری، لگن اور قربانی سے اپنے اعلیٰ ترین مقاصد حاصل کر کے ترقی کے بام عروج پر پہنچ گئیں۔ کسی ظالم کا ظلم اور کسی معاند کی عدم توجہی ان کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکی۔

1848 اور بالخصوص 1872 سے 2000 عیسوی کی درمیانی مدت میں جس پیمانے کی قتل و غارت گری، انسانی گرد ہوں کی افراتفری میں ترک مکانی، جانی اور مالی تباہی اور افراد، خاندانوں، معاشرہ، معاشرتی اداروں اور قوموں کی تباہی کا مشاہدہ اور تجربہ بالخصوص یورپ نے کیا وہ بیسویں صدی میں برصغیر میں ہونے والے حوادث سے ہر اعتبار سے ہولناک تر نہ تھا؟ ان تمام قتل و غارت گری اور تباہی کے باوجود مغرب میں تعلیم، تحقیق اور تصنیف کے جملہ اساسی (Fundamental) شعبے اپنے سارے تخصصات کے ساتھ علیٰ حالہ کام کرتے رہے۔ بالخصوص جنگ عظیم اول سے قبل اور اس کے بعد، جنگ عظیم دوم سے پہلے اور اس کے بعد، اقوام متحدہ اور سلامتی کاؤنسل کے قیام سے پہلے اور اس کے بعد حتیٰ کہ انہدام سوویت یونین سے پہلے اور اس کے بعد۔ اساسیات پر یہ سارے تعلیمی، تحقیقی اور تصنیفی کام لندن، پیرس، برلن، موسکو، سینٹ پیٹرس برگ، ولنا، کراکاو، وارسا، بریلاؤ، پراگ، بوڈاپسٹ، برن، وین، اسٹاک ہوم، ایسلا، کوپن ہیگن، اوسلو، میونخ (مانش)، منسٹر (مانسٹر)، بلگرید، ہمبرگ، لاہزش، ڈبلن، بخارست، روم، نیویارک اور کیمبرج میسوجیٹ کہیں ہو بلا فصل اور بلا عدم ارتباط جاری رہے اور آگے بڑھے جب کہ انہیں ایام میں وہاں ایسی ایسی انقلابی تبدیلیاں اور تاریخ ساز واردات ہوئیں جن سے ساری دنیا تہہ و بالا ہو گئی لیکن خود وہاں کی زندگی اور اس میں جاری علم، تحقیق اور تصنیف کے کاموں میں کوئی فرق نہیں آیا۔

۵۔ ایسا لگتا ہے کہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں موجود فیکلٹیوں اور ان کے تحت قائم تقریباً سو

شعبوں، اداروں اور مراکز میں موجود اور برسر کار اساتذہ اور تحقیقی موجدین (Research Guides)

کی ذہنی، فکری، علمی، دماغی اور عقلی طبع میں درج ذیل امور غالب ہو چکے ہیں:

۱۔ کثیر انضباطی علمی اساس کا فقدان (Lack of Multi-Disciplinarian)

Knowledge Base)

۲۔ امتیازی خصوصیت کا فقدان (Lack of Excellence)۔

۳۔ عدم خلاقیت بلکہ خلاقیت متوحش طبع (Uninnovativeness or rather

Anti-Innovative Temperament)

۴۔ درسی کتب معلومات یعنی مثلثی، ثانوی اور اولین ماخذ سے براہ راست استفادہ معلومات کا

فقدان

(Text-Book Based Knowledge i.e., Lack of Knowledge based on tertiary, secondary and primary source materials)

۵۔ کمترین کام چلاؤ درسی کتاب فہم (Minimal working Text-Book understanding)

۶۔ وجودیات، نشویات اور علمیات کے میدان میں بدسلیقہ تخفیف پسندی

(Uncouth Reductionism in the field of Ontology, Ontogenesis and Epistemology)

۷۔ بدترین لسانی استعداد کا حامل ہونا (Poorest of the poor Language Aptitude)

۸۔ بدترین لسانی استعداد کا حامل ہونا (Poorest of the poor Linguistic Aptitude)

۶۔ (الف) مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں اردو زبان کے اساتذہ: مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ عالمی سطح پر اردو زبان اس سے متعلق سارے علوم، ان علوم میں درک، گہرائی اور گیرائی اور اردو زبان اور لسانیات کی تحقیق سے متعلق اعلیٰ ترین مرجع، مخزن، سرچشمہ اور مسند آخر کا درجہ رکھتی ہے۔ یہاں شعبہ اردو میں اتنی جامعیت یعنی سعت (Comprehensiveness)، عمق (Profoundness)، انشعاب (Ramification)، دست رس (Outreach) اور کثیر انطباطیت (Multi-Disciplinarianism) ہونی چاہیے تھی جو اردو زبان و لسانیات کی جملہ ضرورتوں کی تکمیل کرتی۔ ایسی جامعیت (Comprehensiveness) کا تقاضا تھا کہ شعبہ اردو کے اساتذہ کم از کم چہار لسانی استعداد کے حامل ہوتے۔ چہار لسانی استعداد سے

مراد ہے چار زبانوں کی مطولات سے واقفیت جن کے لئے کم از کم فی کس چار زبانوں کی متوسطات یا مبادیات کا لازمی علم۔ مثلاً ذیل کے خاکے سے ان کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

اردو کے چہار لسانی استعداد کا خاکہ:

مطولات	متوسطات و مبادیات
(۱) اردو	: اپ بھرنش، پراکرت، پالی، اگنی، ویدک سنسکرت، لوکک سنسکرت،
(۲) فارسی	: چینی، منگولی، باستانی، آذنتی، اشکانی، پہلوی، ترکی،
(۳) عربی	: عبرانی، نبطی، ارامی، سریانی، یونانی، کوننی، بطریق، قبطی، ایتھوپیائی،
(۴) انگریزی	: جرمن، فرینچ، اطالوی، اسپینی۔

انسانی تاریخ نے غلامانہ ذہنیت رکھنے والے افراد اور قوموں سے کبھی استعداد کا مطالبہ نہیں کیا۔ تاریخ صرف قائدانہ عزائم یا ذمہ داریاں رکھنے والے افراد اور قوموں سے استعداد کا مطالبہ کرتی ہے۔ اور ایسا مطالبہ صرف اعلیٰ ترین استعداد کا ہوتا ہے۔ چنانچہ جب انیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں برطانیہ کے رائل ہسٹاریکل سوسائٹی نے مشہور سیاح Vámbéry کو اپنے سفر مشرق [ملاحظہ فرمائیں: Armenius Vámbéry: Voyage d'un faux derviche en Asie Central, (Paris, 1862-1864)] کی روداد بیان کرنے کے لئے مدعو کیا تو سوال پیدا ہوا کہ Vámbéry جیسے قدیم و جدید سولہ زبانوں پر قدرت تامہ رکھنے والے ماہر زبان کے خطاب پر تبصرہ کرنے اور مجلس کی صدارت کرنے کے لئے کسے مدعو کیا جائے۔ چنانچہ برطانیہ کے اس وقت کی وزارت خارجہ کے سکرٹری کو اس مجلس کی صدارت کے لئے مدعو کیا گیا جو دنیا کی قدیم اور جدید اکیس زبانوں اور ان زبانوں میں موجود مواد پر غائرانہ نظر رکھتے تھے۔ عصر حاضر میں ہندوستان میں عام طور پر مسلمانوں کے مابین یہ شور سنائی دیتا ہے کہ مسلمانوں کے پاس علمی استعداد کی کمی ہے اس لئے انہیں مواقع (Opportunities) میسر نہیں۔ اس کے برعکس تاریخ بالکل ہی مختلف بات کہتی ہے۔ مسلمان بے عزم ہیں اس لئے ان کے یہاں علمی استعداد پائی نہیں جاتی۔

(ب) مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں فارسی کے اساتذہ: مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ عالمی سطح پر فارسی زبان، اس سے متعلق جملہ علوم، ان علوم میں درک، گہرائی اور گیرائی، فارسی زبان و لسانیات کی تحقیق سے متعلق ایران کے ہم پلہ اعلیٰ ترین مرجع، مخزن، سرچشمہ اور مسند ثنی کا درجہ رکھتی ہے۔ فارسی کو تین ایسی

خصوصیات حاصل ہیں جو اس یونیورسٹی میں اس کی تعلیم، تحقیق اور تصنیف کو خصوصی اہمیت کی حامل بنا دیتی ہیں۔ یہ تین خصوصیات درج ذیل ہیں:

۱۔ فارسی قدیم، فارسی متوسط اور فارسی جدید کے اعتبار سے ہندوستان ایران کے بعد یا ایران کی ہم سری کرتا ہوا دوسرا گہوارہ (Cradle) ہے۔

۲۔ ڈھائی ہزار سالہ انسانی تاریخ میں عالمی کردار ادا کرنے والے دو سو پر پاورس میں سے ایک کی یہ رابطہ کی زبان (Lingua Franca) رہی ہے۔

۳۔ تین سو سالوں سے عالمی سطح پر وقوع پذیر ہونے والے عظیم ایشیائی شکار (The Great Asian Game) کی اولین زبان ہے۔

اس اعتبار سے یہاں شعبہ فارسی میں اتنی جامعیت (Comprehensiveness) یعنی سعت (Amplitude)، عمق (Profoundness)، انشعاب (Ramification)، دست رس (Outreach)

اور کثیر انطباطیت (Multi-Disciplinarianism) ہونی چاہیے تھی جو فارسی زبان اور لسانیات کی جملہ ضرورتوں کی تکمیل کرتی۔ ایسی جامعیت کا تقاضا تھا کہ شعبہ فارسی کے اساتذہ کم از کم چہار لسانی استعداد کے حامل ہوتے۔ فارسی میں چہار لسانی استعداد یقیناً اپنی مخصوص توجیہات (Orientation) کی حامل ہوگی۔

(ج) مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں انگریزی کے اساتذہ: مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ عالمی سطح پر انگریزی زبان، اس سے متعلق جملہ علوم، ان علوم میں درک، گہرائی اور گیرائی، انگریزی زبان اور لسانیات کی تحقیق سے متعلق برطانیہ کے بعد بلکہ وسعت اور آبادی کے اعتبار سے برطانیہ سے وسیع تر، اعلیٰ ترین، مرجع، مخزن، سرچشمہ اور مسند ثنی کا درجہ رکھتی ہے۔ انگریزی کے حوالے سے پانچ ایسی خصوصیات ہیں جن کے سبب مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں اس کی تعلیم، تحقیق اور تصنیف خصوصی اہمیت کی حامل ہو جاتی ہیں۔ یہ پانچ خصوصیات درج ذیل ہیں:

۱۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے بعد سلطنت برطانیہ کے ماتحت ساڑھے تین سو سالہ ہندوستانی تاریخ کے حوالے سے انگریزی زبان کا مخزن ہونا۔

۲۔ گزشتہ ساڑھے تین سو سالوں کے دوران ساری دنیا میں پائے جانے والے بے شمار علوم اور ان کے ذخائر کا برطانیہ منتقل ہونا۔

۳۔ گزشتہ ساڑھے تین سو سالوں کے دوران ساری دنیا میں پائے جانے والے اسلام کے

80% علمی خزانوں اور اصل ماخذ کا برطانیہ منتقل ہونا۔

۴۔ عصر حاضر میں انگریزی کا عالمی ذریعہ مخاطبت (Lingua Franca) ہونا۔

۵۔ گزشتہ ساڑھے تین سو سالوں میں جرمن زبان کے بعد سب سے زیادہ اسلامی اور مسلم لٹریچر

کا تراجم، تحقیقات اور تصنیفات کی صورت میں انگریزی زبان میں پایا جانا۔

اس اعتبار سے یہاں شعبہ انگریزی میں اتنی جامعیت (Comprehensiveness) یعنی

سعت (Amplitude)، عمق (Profoundness)، انشعاب (Ramification)، دست رس

(Outreach) اور کثیر انطباطیت (Multi-Disciplinarianism) ہونی چاہیے تھی جو انگریزی

زبان اور لسانیات کی جملہ ضرورتوں کی تکمیل کرتی۔ ایسی جامعیت کا تقاضا تھا کہ شعبہ انگریزی کے اساتذہ

کم از کم چہار لسانی استعداد کے حامل ہوتے۔ انگریزی میں چہار لسانی استعداد بالخصوص مسلم یونیورسٹی،

علی گڑھ کے پس منظر میں اپنی مخصوص توجیحات (Orientation) کی حامل ہوگی۔

(د) مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں سائنسی علوم کے اساتذہ: مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ عالمی سطح پر عصر

حاضر میں مسلمانوں کے ذریعہ قائم کردہ سب سے پہلی اور سب سے بڑی یونیورسٹی ہے اس لئے جملہ

سائنسی علوم، ان میں درک، گہرائی اور گیرائی اور سائنسی علوم میں تعلیم اور تحقیق کے اعتبار سے سب سے

اعلیٰ ترین مرجع، مخزن، سرچشمہ اور مسند اعلیٰ کا درجہ رکھتی ہے۔ سائنسی علوم میں ایسی جامعیت کے لئے تین

علوم میں جامعیت یعنی درک، گہرائی اور گیرائی ناگزیر ہوتی ہے۔ یہ تین علوم ہیں:

۱۔ فلسفہ سائنس (Philosophy of Science)،

۲۔ تاریخ سائنس (History of Science) اور

۳۔ حقائق سائنس (Reality of Science)

مذکورہ ان تین علوم میں درک، گہرائی اور گیرائی کے لئے تین قسم کے ماخذ کا یکجا اور یک جان ہونا

لازمی ہے۔

۱۔ چہار لسانی ماحولیات: اس سے مراد ہے ویسا چہار لسانی ماحول جیسا اردو زبان کے عنوان کے

تحت بیان کیا گیا ہے۔

۲۔ پنج تہذیبی پس منظر: اس سے مراد ہے مثلاً عراقی، مصری، یونانی، اسلامی، چینی، بھارتی تہذیبی

پس منظر کا اولین ماخذ سے ادراک۔

۳۔ حقیقی سائنسی تحقیق کی تدریج: اس سے مراد ہے سائنس کی حقیقی تحقیق میں تدریج اور اس کا ادراک۔

جس یونیورسٹی اور اس کے ماحول میں چہارلسانی ماحولیات، پنج تہذیبی پس منظر اور حقیقی سائنسی تحقیق کی تدریج پائی نہیں جاتی ایسی یونیورسٹی سے اس بات کی توقع کیوں کر کی جاسکتی ہے کہ وہاں کے اساتذہ اور طلبہ سترھویں، اٹھارہویں، انیسویں، بیسویں اور اب اکیسویں صدی میں ظہور پذیر سائنس کی حقیقت سے کما حقہ واقف ہو سکتے ہیں۔

کیا —

(۱) نیکلس کوپرنیکس (Nicolaus Copernicus) (1473-1543) کے

(۱) Commentariolus (1510-1514) اور

(۲) De Revolutionibus Orbium Coelestium (1530)

(۲) ٹائکو براہے (Tycho Brahe) (1546-1601) کے

(۱) De nova Stella (1573)

(۳) سر آئزک نیوٹن (Sir Issac Newton) (1642-1727) کے

(۱) Philosophiae Naturalis Principia Mathematica (1687)

(۲) Two Notable Corruptions of Scriptures (1754)

(۳) De natura Acidorum (1710)

(۴) Optics (1704)

اور

(۴) البرٹ آئن سٹائن (Albert Einstein) (1879-1955) کے

(۱)

Über der von molekularkinetischen Theorie der wärme
geförderte Bewegung von in ruhenden Flüssigkeiten
suspendierten Teilchen (1908)

(مولیکولر کائینٹک نظریہ حرارت کے مطابق ساکن سیال میں معلق چھوٹے پارٹیکل کی

حرکت پر مقالہ

(۲)

Über einen die Erzeugung und verwandlung des Lichtes
betraf fenden heuristischen Gesichtspunkt (1905)

(روشنی کی تخلیق اور تبدیلی سے متعلق استکشافی نقطہ نظر پر مقالہ)

(۳)

Zur Elektrodynamik bewegter Körper (1905)

(حرکی اجسام کی الیکٹروڈائنامکس پر مقالہ)

(۴)

Ist die Tragheit eines Körpers von seinem Energieinhalt
abhängig? (1905)

(کیا کسی جسم کا سکون (Enertia) اس کی توانائی مافیہ پر منحصر ہے؟)

(۵)

Die Grundlage der allgemeinen Relativitätstheorie (1916)

(نظریہ اضافیت کی اساس)

(۶)

Can Quantum Mechanical Description of Physical Reality

Be Considered Complete? (EPR Experiment) (1935)

(کیا فزیکل ریالیٹی کے کوانٹم میکینیکل بیان کو مکمل سمجھا جائے؟)

سے براہ راست واقف ہوئے بغیر کوئی جدید سائنس کو سمجھ سکتا ہے؟ یہی سبب ہے کہ جب عالم اسلام

کے تین صف اول کے ماہرین سائنس سے عاجز نے چند سوالات کئے تو وہ جواب دینے سے عاجز رہے۔

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں آج موجود بعض اساتذہ سائنس کی مثال بعض معلومات، انکشافات

اور تجربات کی روشنی میں تراویح میں ان حفاظ قرآن جیسی ہے جن کی قرأت میں صرف یعلمون اور تعلمون

سمجھ میں آتے ہیں اور ایسے اساتذہ سے سائنسی علوم پڑھنے والے اکثر طلبہ کی مثال تراویح میں ان

مقتدیوں کی طرح ہے جو نیت باندھ لینے کے بعد انشا غفیل ہو جاتے ہیں اور رکوع، سجدہ اور سلام کے سوا انہیں کچھ یاد نہیں رہتا۔

(ہ) مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں آرٹس، سوشل سائنس اور دیگر علوم کے اساتذہ:

جامعہ (University) سے کیا مراد ہے؟ اس کی حقیقت اور ضرورت کیا ہے؟ کسی انسانی اجتماعیت (Society) کو کب جامعہ (University) کی ضرورت پیش آتی ہے؟

University لاطینی لفظ Universitas سے مشتق ہے جس کا مفہوم ہے: کُل۔ جامعہ سے مراد ایسی تعلیم گاہ ہے جہاں تمام بشری علوم یکجا اور یکجان ہو جاتے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بشر (انسانی معاشرہ) اور علوم (Oral+Written or Recorded) کے مابین ربط کی کیا نوعیت ہے؟

کیا یہ ربط منتخب (Selective) اور جزوی (Partial) ہے؟ یا باہم مربوط (Interconnected)، باہم متراکب (Intertwined) اور کُلی (Holistic) ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ بشر (انسانی معاشرہ) اور علوم کے مابین ربط کی نوعیت باہم مربوط (Interconnected)، باہم متراکب (Intertwined) اور کُلی (Holistic) ہی ہو سکتی ہے۔ منتخب اور جزوی قطعاً نہیں۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ غلامانہ ذہنیت کے افراد اور قوموں میں بشر (انسانی معاشرہ) اور علوم کے مابین اس ربط کو منتخب (Selective) اور جزوی (Partial) دیکھتی یاد رکھنا پسند کرتی ہیں۔ غلامانہ ذہنیت کا یہی رجحان تاریخ میں نظر آتا ہے۔ غلامانہ ذہنیت کے افراد اور قوموں کو کبھی جامعہ (University) کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف جامعہ (University) دنیا اور عالم انسانیت میں قائدانہ کردار ادا کرنے کے خواہش مند افراد اور قوموں کی اولین ضرورت ہوتی ہے۔

جامعہ کسی مخصوص مقام پر کئی اسکولوں یا کالجوں کے یکجا ہو جانے یا کر دیئے جانے کو بھی نہیں کہتے۔ جامعہ کسی عمارتی مجمع (Complex) کا بھی نام نہیں۔ جامعہ وہ اعلیٰ ترین تعلیم گاہ ہے جہاں علمی قالب (Knowledge Matrix) کا وجود یقینی بنایا جاتا ہے۔ سارے علوم جہاں باہم مربوط ہو کر حقائق کا ادراک کرنے میں مددگار ہوتے ہیں۔ غلامانہ ذہنیت کے افراد یا قوموں کو ایسے ادراک کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ اس کے برخلاف قائدانہ کردار ادا کرنے کے خواہش مند افراد اور قوموں کے لئے یونیورسٹی ایک ناگزیر ضرورت بن جاتی ہے۔

سر سید ہر چند کہ اپنی حیات میں جامعہ (University) دیکھ نہ پائے لیکن ان کے ذہن میں جو خاکہ تھا وہ ایک علمی قالب (Knowledge Matrix) کا خاکہ تھا جسے افسوس کہ سر سید کی وفات کے بعد نہ جنگ عظیم اول سے پہلے، نہ جنگ عظیم اول کے بعد، نہ جنگ عظیم دوم سے پہلے اور نہ ہی جنگ عظیم دوم کے بعد اب تک حقیقت کا جامہ پہنایا جاسکا۔

سر سید کے جانشین اور بالخصوص جنگ عظیم دوم کے بعد 'مسلم قیادت' سر سید کو اب تک سمجھ سکی اور نہ جامعہ (University) کی حقیقت کو۔ اس کی سب سے بڑی وجہ سر سید اور ان کے جانشینوں بالخصوص جنگ عظیم دوم کے بعد کی 'مسلم قیادت' کی ذہنی سطح کا فرق ہے۔ سر سید قائدانہ کردار کی ادائیگی کا تصور رکھتے تھے جب کہ ان کے بعد 'مسلم قیادت' غلامانہ ذہنیت کی حامل ہو چکی تھی۔ یہ بات سامنے آچکی ہے کہ 'بدترین ناموافق حالات' بھی کسی با بصیرت (Visionary)، پر عزم (Firm & Determined)، صاف گو (Unambiguous) اور با مقصد (Object-Bound) قیادت کے زیر سایہ کسی قوم کے لئے ایک قلیل مدتی ظاہرہ (Short-term phenomenon) سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ انتہائی نامساعد اور ناموافق حالات میں بھی با بصیرت (Visionary) اور خلاق (Innovative) قیادت ایسے اقدامات کر لیتی ہے جو اس قوم کی تاریخ میں انقلابی تبدیلی لا کر نئی تاریخ رقم کر دیتے ہیں۔ عاجز کی ناقص رائے ہے کہ اگر تقسیم ملک کے بعد پیدا ہونے والے ناموافق اور نامساعد حالات میں بھی 'مسلم قیادت' نے بصیرت (Vision) اور خلاقیت (Innovativeness) کا ثبوت دیا ہوتا تو وہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے حوالے سے ایسے فیصلے لینے میں کامیاب ہو جاتی جن سے نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ تمام نوع انسانی کے لئے نئے امکانات پیدا اور ترقی کے نئے ابواب کھل جاتے۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ ٹھیک اسی عہد میں ہندوستانی مسلمانوں سے زیادہ ناموافق حالات میں جینے والی قوموں نے با بصیرت (Visionary) اور خلاقانہ (Innovative) اقدامات کر کے اپنی تقدیر بدل ڈالی۔ اس موقع پر عاجز دو ماڈلس کی مثال پیش کرتا ہے:

۱۔ ناموافق ماحول میں غیر معمولی اہداف حاصل کرنے کا ماڈل:

۲۔ قلیل ترین انسانی اور مالی وسائل میں غیر معمولی اہداف اور منصوبوں کو پورا کرنے کا ماڈل:

پہلا ماڈل بیسویں صدی کی پچاس کی دہائی میں ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر ویسلی لیونٹیف

(Wassily Leontief) نے پیش کیا جسے Input-output یا Inter-Industry Analysis

Analysis کہا جاتا ہے۔

اسی قسم کے ماڈل کا استعمال کر کے مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کو ناموافق حالات میں بھی قائم نہ کر دار ادا کرنے والی مثالی اور عدیم النظیر یونیورسٹی میں تبدیل کیا جاسکتا تھا۔

ملاحظہ فرمائیں:

1. Wassily Leontief: The Structure of American Economy: 1951.

2. Princeton University Press: Input-output Analysis: An Appraisal: 1956.

دوسرا ماڈل بیسویں صدی کی چالیس کی دہائی میں جارج بی ڈینزگ (George B. Dantzig)

نے پیش کیا جسے Linear Programming یا Mathematical Programming

Activity Analysis کہا جاتا ہے۔

ملاحظہ فرمائیں:

1. Donald Stevenson Watson: Price Theory and Its Uses.

افسوس بے بصیرت اور غیر خلاق 'مسلم قیادت' نے سارے مواقع ضائع کر دیئے۔

آرٹس (Arts) اور سوشل سائنسز (Social Sciences) میں اساسی علوم دو ہیں۔ ان دو علوم اور

ان کی جامعیت یعنی سعت (Amplitude)، عمق (Profoundness)، انشعاب (Ramification)،

دست رس (Outreach) اور کثیر انطباطیت (Multi-Disciplinarianism) میں مہارت تامہ کے

بغیر قائم نہ کر دار ادا کرنے والے کسی فرد اور قوم کا تصور نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یہ دو اساسی علوم ہیں:

۱۔ زبان (Language) اور

۲۔ تاریخ (History)

غلامانہ ذہنیت کی حامل قوم یا اس کی قیادت اکثر ان دو اساسی علوم سے کلی صرف نظر کر کے اپنی

ساری توجہ یا توانائی ہنر (Technology) میں لگا دیتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ زبان (Language)

اور تاریخ (History) کے بغیر ہنر (Technology) کا حصول افراد اور قوموں کو غلامی میں پختہ تر بنا

دیتا ہے اور صدیوں کے لئے غلامی ایسے افراد اور قوموں کا مقدر بن جاتی ہے۔

ماضی قریب کا جائزہ بتاتا ہے کہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں 'مسلم قیادت' نے ان دو اساسی شعبوں

یعنی زبان (Language) اور تاریخ (History) اور ان کی جامعیت (Comprehensiveness)

کاملاً خاتمہ کر دیا۔ 'مسلم قیادت' کی بے بصیرتی (Visionlessness) کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا؟

۷۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ آج مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے اکثر اساتذہ کے حوالے سے خلافت (Innovation) اور تخلیقیت (Creativeness) کا ذکر از حد مضحکہ خیز (Ridiculous) ہے۔

اسی فیصد اساتذہ بوزینی نقالی (Mimesis & Mimicry) پر بھی قادر نہیں۔ یونیورسٹی کے اساتذہ کی اکثریت مغربی دنیا میں پائے جانے والے تیسرے درجے کے ماہرین فن کو بھی۔۔ جن کی باتیں عموماً مثلثی مآخذ اور مصادر (Tertiary Source Materials) پر مشتمل ہوتی ہیں۔۔ سمجھنے کی استعداد نہیں رکھتی چہ جائے کہ مغرب میں پائے جانے والے ماہرین فن کو جن کی باتیں ثانوی اور اول درجے کے مآخذ و مصادر (Secondary or Primary Source Materials) پر مشتمل ہوتی ہیں۔ رہے مغرب میں پائے جانے والے ایسے ماہرین فن کو جن کی باتیں ماورائے اول درجہ (Ultra-Primary Sources) سے متعلق ہوتی ہیں تو یہ اساتذہ ان کے وجود سے بھی واقفیت نہیں رکھتے۔ خواہ ان ماہرین کا تعلق شعبہ سائنس سے ہو یا سوشل سائنس یا آرٹس سے۔ یہی سبب ہے کہ عالمی سطح پر مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے مٹھی بھر اساتذہ کو چھوڑ کر بقیہ اساتذہ عموماً مغربی علوم کے جمالوں کی صف بندی میں تیسری صف کے آخر میں نظر آتے ہیں۔ چنانچہ حالیہ زمانے میں مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے اعلیٰ ترین اساتذہ کی باخبری یا بے خبری کا ایک واقعہ سامنے آیا:

ایک کتاب امریکہ میں 2011 میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے ماورائے اولین متن (Archetype Version) اور اولین متن (Prototype Version) پچھلے دس سالوں سے شائع ہو کر زیر بحث آرہے تھے۔ 2011 عیسوی میں اس کتاب کی باضابطہ اشاعت کے بعد بلا مبالغہ یورپ، شمالی امریکہ اور آسٹریلیا کے علمی اور فکری حلقوں میں تہلکہ مچ گیا۔ سینکڑوں ماہرین فن نے اس پر تبصرے کئے یا اپنے مضامین اور خطبات میں اس کے حوالے دیئے۔ جب اس کتاب میں زیر بحث آئے ایک مسئلے پر مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے اجل اساتذہ سے اظہار خیال کے لئے گزارش کی گئی تو یہ انکشاف ہوا کہ وہ کسی ایسی کتاب سے سرے سے واقف ہی نہیں۔

۸۔ دنیا میدانِ عمل ہے۔ اس میدان میں ہمہ وقت افراد اور قوموں کے مابین مسابقت (Competiton) جاری ہے۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ کوئی قوم راکب ہو جاتی ہے تو کوئی اس کا مرکب۔ لیکن انسانی تاریخ میں تضاد کبھی واقع نہیں ہوا۔ اس میدانِ عمل میں ہمیشہ وہی قوم راکب

ہوئی جو خلاق (Innovative) واقع ہوئی۔ جو قوم خلاق (Innovative) ہے اقدام (Initiative) کی کلید اسی کے ہاتھ میں ہوتی ہے خواہ احوال اس قوم کے موافق (Favourable) ہوں یا ناموافق (Unfavourable)۔ خلاق (Innovative) قوم دوسری قوم کے چبائے ہوئے لقموں کو چباتی ہے نہ ماضی کے بہاؤ کا مجرئی بنتی ہے۔ وہ میدان عمل سے راہ فرار بھی اختیار نہیں کرتی۔ ایسی خلاق قوم اپنی خلاقیت اور اقدام سے نئی دنیا خلق کر کے نئی تاریخ رقم کرتی ہے۔

گزشتہ ساٹھ سالوں میں 'مسلم قیادت' کے زیر سرپرستی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کورٹ (AMU Court)، اکادمک کاؤنسل (Academic Council)، ایگزیکوٹیو کاؤنسل (Executive Council) اور یونیورسٹی اساتذہ کے اکثر فیصلے، ان کی تعمیل اور ان کا مابعد احتساب (Accountability) خلاقیت (Innovation) سے کلیتہً عاری ہیں۔ ظاہر ہے کہ برسر زمین حقائق 'نظارہ مستحیلہ' نہیں بلکہ 'ٹھوس حقائق' ہوتے ہیں جو افراد اور اجتماعیات کو صرف نظر کرنے (Overlook) یا شتر مرغ کی روش اختیار کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ خلاقیت (Innovation) سے کلیتہً عاری 'مسلم قیادت'، یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد اور بالخصوص اساتذہ پر عارض اسی 'جبر' نے انہیں تین باتوں کے لئے مہمیز کیا۔ یہ تین باتیں ہیں:

۱۔ 'مسلم قیادت' کا اپنے عدم خلاقیت کے نتیجے میں رونما ہونے والی ناکارکردگی اور ناکامی کے لئے وجہ جواز پیدا کرنا (To rationalise the failure due to the

_'uninnovativeness of the 'Muslim Leadership')

۲۔ 'مسلم قیادت' کا اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لئے وجہ جواز پیدا کرنا (To acquire

_'self-contentment on the failure of their activities')

۳۔ 'مسلم قیادت' کی کھلی ناکامی رنکارکردگی سے مسلمانوں کے لئے بذریعہ اخراج جذبہ تسکین

کا سامان کرنا (To provide Catharsis for Muslims to escape

_'the pangs of failure')

۴۔ 'مسلم قیادت' کا اپنے حقیقی ہدف تک رسائی کو یقینی بنانا (To ascertain the reach

_'to the real target of the Muslim Leadership')

چنانچہ یہی وہ چار داعیے تھے جنہوں نے 'مسلم قیادت' کو بیسویں صدی کی بالخصوص ساٹھ کی دہائی

میں درج ذیل ترجیحات کے لئے ابھارا:

۱۔ سرکاری ظلم، حق تلفی، بے اعتنائی اور مداخلت کارونا—رونا،

۲۔ اکثریتی طبقے کے مظالم، تعصب اور معاندت کارونا—رونا—اور

۳۔ مسلمانوں کے لئے 'خصوصی مراعات' کے لئے پہلے ماورائے قانون و دستور اور بعد میں قانونی اور دستوری مطالبات کرنا۔ 'مسلم قیادت' اپنی مخصوص ذہنیت کے سبب ان ترجیحات اور مطالبات کے پس پردہ صرف 'انفرادی' اور طائفی (Sectional) 'خصوصی مراعات' جنہیں ذاتی اغراض کہنا زیادہ درست ہے چاہتی تھی۔ قوم کے تعلق سے ان کے پاس کوئی ٹھوس فکر اور منصوبہ بندی سرے سے تھی ہی نہیں۔ اس ذہنیت نے 'مسلم قیادت' کو پہلے بند کمروں میں اور بعد میں برسر عام چاپلوسی، کاسہ لیبسی، در یوزہ گری، زلہ ربائی، کفش برداری اور اُلش نصیبی کی روش اختیار کرنے پر آمادہ کر لیا۔ اس طرح 'مسلم قیادت' کی معروف ہستیاں مثالی 'Uncle Tom' بن کر رہ گئیں۔ اس صورتحال اور روش نے مسلمانوں کی جملہ آبادی کو دوسروں کی نظر میں 'Waste' بنا دیا۔ خود 'مسلم قیادت' حکومت کی نظر میں بے وقعت ہو گئی۔ چنانچہ پوری ملت بالعموم اور مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ بالخصوص جارج اور ویل (George Orwell) کے اینی مل فارم (Animal Farm) میں بدل کر رہ گئیں۔

۹۔ گزشتہ ساٹھ سالوں سے مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی اکادمک کاؤنسل (Academic Council) کے تعلیم، تدریس اور نصاب سے متعلق بطور سینٹ (Senate) لئے گئے اکثر فیصلے مسلم یونیورسٹی میں انحطاط کا اصل باعث ہوئے۔ بے بصیرت (Visionless)، کورنگاہ (Blind)، مردہ ذوق (Senseless) اور غیر خلاق (Uninnovative) مجلسوں کے فیصلے اکثر اسی نوعیت کے ہوتے ہیں۔

اس ضمن میں ایک واقعے کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے جس کا ذکر پروفیسر محمد شبیر خاں نے کیا ہے:

”اسی دوران میں ایک مرتبہ سائنس کے شعبہ جات کی فیکلٹی کی اعلیٰ تعلیم اور تحقیقات کی کمیٹی کی صدارت کر رہا تھا، تو اس میں ایک کیس ایسا آیا جس میں ایک شعبہ کے کسی ریسرچ اسکالر کے تحقیقی مقالہ کی ایک ملک کے باہر کے ممتحن نے بہت سخت الفاظ میں تنقید کی تھی۔ رپورٹ بہت لمبی تھی اور اس میں بہت سی غلطیوں کے متعلق بھی بیان کیا گیا تھا اور یہ بھی بتایا گیا تھا کہ کس طرح ان تمام چیزوں کی تصحیح کی جاسکتی ہے۔ باہر کے ملک کے پروفیسر نے یہ بھی لکھا تھا کہ میں اس سے قبل مسلم یونیورسٹی کے کئی ریسرچ اسکالرز کے کئی تھیسس دیکھ چکا ہوں جن کا معیار بہت ہی بلند ہوتا تھا اور اب میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ تحقیق کا معیار اتنا

کیسے گر گیا۔ میری رائے یہ ہے کہ یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کو خاص طور پر تحقیق کرنی چاہیے کہ تحقیق کے معیار کے اتنا کرنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ مزید یہ لکھا تھا کہ میں یہ سفارش کرتا ہوں کہ اس تھیسس کے بارے میں میں نے جو بہت سی رائیں دی ہیں، ان کی روشنی میں دوبارہ درست کیا جائے۔ اور اس کے بعد چونکہ میں کافی وقت تک بہت مشغول رہوں گا اور اس تھیسس کو دوبارہ جلدی نہ دیکھ سکوں گا اس لئے میری رائے یہ ہے کہ اس مقالہ کو درست کرنے کے بعد ہندوستان کے جو دوسرے ممتحن ہیں ان کے پاس بھیج دیا جائے تاکہ وہ دیکھ لیں کہ جب اس کی ساری غلطیاں درست ہو جائیں تو ریسرچ اسکالر کو پی ایچ ڈی کی ڈگری دے دی جائے۔ قارئین میں سے جو لوگ یہاں کے حالات سے واقف نہ ہوں ان کو میں یہ بتا دوں کہ اس قسم کی کمیٹی میں پوری فیکلٹی کے تمام شعبہ جات کے صدر ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ فیکلٹی کے متعدد ایسے اشخاص، جن کو تحقیقات کے کاموں میں نمایاں سمجھا جاتا ہے کمیٹی میں الیکشن کر کے بھیجا جاتا ہے۔ یونیورسٹی کا وائس چانسلر یا ان کی عدم موجودگی میں پرووائس چانسلر صدر ہوتا ہے۔ چنانچہ کمیٹی کی بڑی اہمیت سمجھی جاتی ہے اور اس لئے اس کی سفارش کبھی آگے چل کے کسی بھی جگہ رد نہیں کی جاتی۔ میری حیرت کی حد نہ رہی جب اس رپورٹ کے سن لینے کے بعد سائنس کے ہر شعبہ کے صدر، ڈین اور دوسرے نمائندے سب لوگوں نے سفارش کی کہ ریسرچ اسکالر کو فوراً ڈگری دے دی جائے اور ان تمام لغویات میں زیادہ وقت صرف نہ کیا جائے کہ وہ تمام غلطیاں اور کمزوریاں دور کرتا پھرے۔ اس لئے کہ ملک کے باہر کے ممتحن نے یہ تھوڑے ہی لکھا ہے کہ اس مقالہ کو اس کی نمایاں غلطیاں درست کرنے کے بعد میرے پاس بھی دوسری بار دیکھنے کو بھیجا جائے۔ اور جہاں تک ہندوستان کے دو ممتحنوں کا ذکر ہے تو وہ تو ڈگری دینے کی سفارش پہلے ہی کر چکے ہیں۔ یہ بات آپ لوگوں کے ملحوظ خاطر رہے کہ ہندوستان کے جو دو ممتحن ہوتے ہیں ان میں سے ایک تو شعبہ ہی کا ہوتا ہے جس کی نگرانی میں تھیسس لکھا جاتا ہے۔ میں نے حاضرین جلسہ سے بہت معذرت کے ساتھ درخواست کی کہ ہر چند کہ میں اس وقت اس میٹنگ کی صدارت کر رہا ہوں لیکن آپ لوگوں کی طرح میں بھی مسلم یونیورسٹی کا ایک استاد ہوں۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ دو باتیں قابل غور ہیں۔ ایک تو یہ کہ یونیورسٹی کے قوانین میں لکھا ہے کہ جب تک ڈگری دینے کی تینوں ممتحن سفارش نہ کریں اس وقت تک ڈگری نہیں دی جاسکتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ کیا آپ لوگوں کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ یہ بات انتہائی شرمناک ہے کہ غیر ملک کے ممتحن نے جو پہلے بھی اس یونیورسٹی کے ایسے کاموں سے متعلق رہ چکا ہے اور جس نے یہاں کے پہلے کے مقالات کی بہت تعریف بھی کی ہے۔ اس مقالے کی کڑی تنقید

کرتے ہوئے بہت سی تجویزیں کیوں پیش کیں اور یہ کیوں لکھا کہ یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کو اس بات کی تحقیق خاص طور سے کرنا چاہیے کہ مسلم یونیورسٹی میں تحقیق کا معیار اتنا زیادہ کیوں گر گیا ہے۔ میری ان باتوں کو سننے کے بعد بھی سائنس کے کسی صدر شعبہ، دوسرے نمائندہ اور ڈین نے میری بات نہ مانی اور اپنی ضد پر اڑے رہے کہ اس سے ریسرچ اسکالر کے وقت ضائع کرنے کے علاوہ اور کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اس پر آخر میں نے انتہائی صفائی سے کہہ دیا کہ آپ لوگ برامانیں یا اچھا لیکن کم از کم میں اپنی صدارت میں اس طرح ریسرچ اسکالر کو ڈگری نہیں تجویز کر سکتا۔ حالانکہ میں نہیں جانتا کہ یہ کون ہے اور اس کے کیا حالات ہیں۔ لیکن جو کوئی بھی ہو اور اس کے جو حالات بھی ہوں۔ میں اپنی یونیورسٹی کے معیار کے اس طرح گرتے رہنے کے حق میں نہیں ہوں۔ اور کم از کم میں آپ کا ساتھ نہ دے سکوں گا۔ جب وائس چانسلر صاحب کی موجودگی میں یا آپ کے مستقل پرووائس چانسلر کی موجودگی میں یہ میٹنگ ہو اس وقت آپ جو چاہیں منظور کروالیں۔ عارضی طور پر دو ماہ پرووائس چانسلر کی حیثیت سے میں نے کام کیا۔ میرے بعد اس کیس کا کیا حال ہوا مجھے اس کا علم نہیں۔ اس لئے کہ میں جس راستہ پر نہیں چلتا اس کے میل نہیں گنتا۔“

ملاحظہ فرمائیں

پروفیسر محمد شبیر خاں: ذاکر صاحب کی شخصیت میری نظر میں: صفحہ 115-116: خدا بخش لائبریری
جزل: 50: خدا بخش اور نیشنل پبلک لائبریری، پٹنہ 1989۔

۱۰۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں قائم ایکریوٹیو کاؤنسل (Executive Council) نہایت اہم مجلس ہے۔ بد قسمتی سے اس مجلس کو جس قدر پیشہ ورانہ اور مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی روح سے وابستہ ہونا چاہیے تھا یہ اسی قدر غیر پیشہ ورانہ اور روح سے عدم وابستہ واقع ہوئی ہے۔ یہ وہ اہم مجلس ہے جسے ہر لمحے اور ہر قدم پر تدبیری اجتہاد کا سامنا ہوتا ہے اور اس کی پیشہ ورانہ مہارت اور مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی روح سے وابستگی جیسے دوزاد راہ کے سوا اس کے پاس کوئی قوت کار میسر نہیں۔ اس کی قوت کار اور اس کا دائرہ کار دونوں محدود ہیں لیکن اس کے سامنے چیلنجز اس کے برخلاف لامحدود ہیں۔ اس صورت حال میں ہر لمحے یہ مجلس تدبیری اجتہاد کی سان پر چڑھی ہوتی ہے۔

بائیں ہمہ یونیورسٹی کی ایکریوٹیو کاؤنسل (Executive Council) کی حقیقی صورت حال کیا ہے اس کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے کیا جاسکتا ہے:

”دوسرا واقعہ جس کا مجھے صدمہ ہوا یہ تھا کہ میڈیکل کالج کے ایک صاحب جو اپنے مضمون میں جید

عالم سمجھے جاتے تھے اور یقیناً ہوں گے بھی ایک مرتبہ ایکزیکوٹیو کاؤنسل کے الیکشن کے سلسلہ میں ایک صاحب کو ووٹ دینے کی سفارش کرنے میرے یہاں تشریف لائے۔ میں اور میری بیوی ان کے پاس ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میری بیوی نے ان کی خاطر مدارات کے لئے خاص طور سے چائے اور دوسری چیزوں کا انتظام کیا تھا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب موصوف سے عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب! آپ اپنے مضمون کے بہترین استادوں میں سے ہیں، پڑھے لکھے اور کام کرنے والے ہیں اور ایسے آدمی کے لئے ووٹ مانگنے آئے ہیں جن کو پڑھنے لکھنے اور اپنے کام کرنے میں نہ کوئی دلچسپی ہے نہ تعلق۔ تو وہ ایکزیکوٹیو کاؤنسل جو قریب قریب ہر معاملہ کے لئے بہترین کاؤنسل سمجھی جاتی ہے وہاں جا کر کیا کریں گے۔ کہنے لگے جب میں انگلستان گیا تھا تو میں نے وہاں بہت اچھا کام کیا تھا۔ لیکن یہاں استاد ہونے کے بعد جب میں نے حالات دیکھے تو یقین ہو گیا کہ مسلم یونیورسٹی میں ہر کام پالکس سے ہوتا ہے۔ اب تو مجھے پالکس لڑنے اور لڑانے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ اور پڑھنا لکھنا تو اب صرف برائے نام ہے۔ اس کام کو میں نے بالکل چھوڑ دیا۔ جو سرمایہ جمع کیا تھا اس کے سود پر معاملہ چل رہا ہے۔ میں نے بہت تکلیف سے ان سے عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب یہ بات آپ کے لئے زیب نہیں دیتی اس لئے کہ استاد کا فرض تو یہ ہے کہ ہمیشہ تعلیمی کام میں مشغول رہے۔ بولے مسلم یونیورسٹی میں تو کام کرنے والے استادوں کی مٹی پلید ہو جاتی ہے۔ اس لئے اس سے کیا فائدہ۔ میں یہ سن کر سنانے میں رہ گیا۔ اور ڈاکٹر صاحب کی بات دل پر تازہ ہو گئی۔“

ملاحظہ فرمائیں:

پروفیسر محمد شبیر خاں: ڈاکٹر صاحب کی شخصیت میری نظر میں: صفحہ 116-117: خدا بخش لائبریری

جرنل: 50: خدا بخش اور نیشنل پبلک لائبریری، پٹنہ 1989۔

۱۱۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں قائم وہ مجلس جسے اس کی روح اور جسد کی سب سے بڑی محافظ ہونا چاہیے تھی وہی اس کی تباہی کا سب سے بڑا سبب بن رہی ہے۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کو فکری، علمی، ذہنی، اخلاقی زوال اور انحطاط کے قعر مذلت میں دکھیل دینے میں بالواسطہ اور بلاواسطہ اسی مجلس کا سب سے بڑا ہاتھ ہے۔ مسلم یونیورسٹی کی یہ باوقار مجلس ’یونیورسٹی کورٹ‘ (University Court) ہے جو دراصل ہندوستان میں ’مسلم قیادت‘ کی ’نمائندہ ایک چھوٹی مجلس‘ ہے۔ مسلم یونیورسٹی میں قائم یہ وہ عاملہ ہے جس کے ذریعہ رفتہ رفتہ ’قیادت‘ نے اپنی ساری ذہنی، فکری، علمی، عملی اور اخلاقی کثافتوں اور آلودگیوں کو بالآخر مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں Landfill کے بطور استعمال کر کے اس کے ماحول کو آلودہ (Contaminated) کر کے رکھ دیا۔

زہریلا دائرہ

۱۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے ریکارڈس، روایات، باخبر افراد کے ملفوظات اور بالمشافہ گفتگو اور ان کے تجزیے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ گزشتہ کئی دہوں سے یونیورسٹی میں 'استاذ' مقرر ہونے کے لئے 'حقیقی علمی استعداد' 'مطلوبہ لازمی استعداد' نہیں رہی۔ 'کاغذی سند مطلوبہ لازمی استعداد' اور 'رسوخ' (Approach) 'ترتیجی استعداد' (Ability of Preference) قرار پائے۔ اس طرح 'رسوخ' (Approach) کو یقینی اور موثر (Actual & Effective) بنانے والی دو چیزیں سامنے آئیں: اولاً: 'مفادات' (Interests) اور ثانیاً: 'عصبیت' (Prejudice)۔ چنانچہ امیدواران کے لئے حقیقی اور فنی علمی اور عملی یا تجرباتی استعداد عملاً بے معنی بن کر رہ گئیں۔ گزشتہ بیس پچیس سالوں میں صورتحال مزید تحلیل ہو کر ابتر ہو گئی۔ اب لیکچرار کے ریڈرا اور ان کے پروفیسر ہونے کی بنیاد مدت کا زقرار پا گئی چنانچہ کسی کا اب پروفیسر ہونا صرف اس بات کو ظاہر کرنے لگا کہ وہ کتنا مزمن، سن رسیدہ بلکہ گرگ باراں دیدہ ہے۔

۲۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کا ایک حالیہ سروے (2010) درج ذیل باتوں کو درست ثابت کرتا ہے:

۱۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں فی الوقت موجود پروفیسروں کی 50 فیصد تعداد ایسی علمی استعداد

رکھنے والوں پر مشتمل ہو چکی ہے جو مثلاً ڈی پی ایس (Delhi Public School) کے

دسویں درجے کے دس فائق (Top-Tens) کو پڑھانے، ان کے سوالات کا اطمینان بخش جواب دینے اور ان کے علمی افتق کو وسیع کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔

۲۔ یا بالفاظ دیگر فی الوقت موجود پروفیسروں کی 70 فیصد تعداد ایسی علمی استعداد رکھنے والوں پر مشتمل ہو چکی ہے جو مثلاً بلجیم، ہالینڈ اور جرمنی کے Höhere Schule اور فرانس کے Lycée کی آخری جماعت کے دس فائق (Top-Tens) کے ذریعہ پڑھائے گئے اسباق کو سمجھ کر ان کی تکرار (Repetition) کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔

۳۔ یونیورسٹی میں فی الوقت موجود لیکچرارز کی 50 فیصد تعداد ایسی علمی استعداد اور علمی افتق رکھنے والوں پر مشتمل ہو چکی ہے جو ساٹھ سال قبل اسی بھارت کے طول و عرض میں پائے جانے والے مڈل اسکول کے 'منتخب اساتذہ' کی علمی استعداد اور ان میں پائے جانے والے علمی افتق کے برابر بھی نہیں۔

اس مقام پر عاجز اپنے دو اساتذہ کرام کا ذکر بطور 'تقریب فہم' کرتا ہے۔ ساٹھ سال قبل کا یہ منظر نامہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ہی نہیں بلکہ پوری ملت کے زوال و انحطاط کی درست تفہیم کے لئے بھی معاون ہوگا:

۱۔ مولانا محمد رفیق: چھوٹا سا قصبہ، مولانا معلم، امام اور خطیب مسجد، چالیس روپے ماہانہ کفاف نفس، قصبے کے تیس خاندانوں سے ایک ایک دن صبح کا ناشتہ، دو پہر اور رات کا کھانا۔ عاجز کے قرآن، فارسی اور عربی کے اولین استاذ۔ سبع معلقات، حماسہ ابو تمام، شاہنامہ فردوسی، مثنوی معنوی، خمسہ نظامی گنجدی ای کے ہزاروں اشعار گویا ازبر۔ رودکی سے قاآنی تک کے سیکڑوں اشعار نوکِ زباں۔ والد محترم کے قول کے مطابق منطق اور فلسفہ میں طاق۔

۲۔ مولوی بدرالدین: قصبے سے ایک میل کے فاصلے پر واقع مڈل اسکول میں انگریزی، فارسی اور اردو کے استاذ۔ عاجز انگریزی، فارسی اور اردو میں اپنے ہم سبق رفقا سے ہر اعتبار سے فائق۔ ایک دن عاجز نے عرض کیا: میں انگریزی میں اعلیٰ استعداد پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ پل بھر عاجز کے چہرے پر نظر ڈالی پھر حکم فرمایا: کاپی لے کر آئیے۔ میں نے کاپی پیش کی۔

انہوں نے چند الفاظ لکھے اور فرمایا: انہیں یاد کر کے کل سناؤ۔ عاجز نے کاپی پر نظر ڈالی، کچھ نامانوس سے الفاظ لکھے تھے۔ میں نے دریافت کیا تو فرمایا: یہ لاطینی ہے۔ انگریزی میں اعلیٰ استعداد کے لئے لازمی۔ انہیں یاد کر کے کل سناؤ۔ اللہ ان دونوں پر رحمتیں نازل کرے۔

مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر مجور کے بعد دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

۳۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں قائم بارہ فیکلٹیوں کے سو سے زائد شعبوں، اداروں اور مراکز کے اساتذہ اور ماہرین کی موجودہ تحریری اور تصنیفی صورتحال نے Potential اور Actual استعداد کے تعلق سے ایسے سوال کھڑے کر دیئے ہیں جو حد درجہ تشویشناک معلوم ہوتے ہیں۔ انہیں ذیل میں یوں ملخص کیا جاسکتا ہے:

۱۔ اساتذہ کی 50 فیصد موجودہ تعداد تحریری اور تصنیفی میدان میں عالمی معیار (World Standard) کے مطابق Potential استعداد کی سرے سے حامل ہی نہیں۔

۲۔ اساتذہ کی 80 فیصد موجودہ تعداد تحریری اور تصنیفی میدان میں عالمی معیار (World Standard) کے مطابق Actual استعداد کی حامل نہیں۔

۳۔ اساتذہ کی 10 فیصد موجودہ تعداد کی تحریری اور تصنیفی کاوشیں دوسرے یا تیسرے درجے کی یا کسی دوسرے درجے کے ماخذ سے مستفاد ہوتی ہیں اگرچہ انہیں علانیہ 'سرقہ' (Plagiarism) کہنا مشکل ہے۔

۴۔ اساتذہ کی 10 فیصد تعداد محض برائے ضرورت یا اضطراراً (Under Compulsion) تحریری اور تصنیفی کاوشیں کرتی ہے وہ بھی اکثر Cut & Paste یا 'کھلا سرقہ' (Stark Plagiarism) ہوتی ہیں۔

۵۔ اساتذہ کی 1 فیصد موجودہ تعداد ایسے مصنفین پر بھی مشتمل ہے جو ہر چند کہ معمولی علمی و تحقیقی استعداد کی حامل ہے لیکن محض ہنرمندی سے ایسی تصنیفات اور تحقیقی کاوشیں کرتی نظر آتی ہے جن پر لوگ (?) حیران رہ جاتے ہیں۔ ایسے مصنفین تین مرحلوں میں ان تحریروں کو

تیار کرتے ہیں جنہیں علم میں رسوخ رکھنے والے افراد کے سوا کوئی عام حالات میں Detect نہیں کر پاتا۔ چنانچہ ایسے افراد کے ذریعہ پہلے مرحلے میں طویل کتابیات کی فہرست تیار کی جاتی ہے۔ دوسرے مرحلے میں ان کتابیات سے حوالے Annotated کئے جاتے ہیں۔ اور آخری مرحلے میں اصل متن لکھا جاتا ہے اور پھر یہ تینوں باہم مدغم کر دیئے جاتے ہیں۔

۴۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں اب چونکہ بہت بڑی تعداد ایسے اساتذہ کی موجودگی رکھتی ہے جو Potential استعداد سے بالکل عاری ہے لہذا ان حالات نے انہیں چند مذموم رویوں کا عادی بنا دیا ہے جن کے مظاہرے آئے دن ہوتے رہتے ہیں مثلاً:

۱۔ اندرون ملک اور بیرون ملک بالخصوص مغرب میں اپنی استعداد کو غلامانہ اور مغلوبانہ استعمال کے لئے بلا شرط پیش کر دینا۔

۲۔ اندرون ملک اور بیرون ملک 'استعداد' کو Misuse، Disuse یا Underutilize کر کے انہیں محض 'مالی منفعت' (Financial Gain) کا ذریعہ بنا دینا۔ مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ اور فارغین کا فوج در فوج مشرق وسطیٰ جانا بھی اسی ذہنیت کی عکاس ہے۔ قومی، معاشرتی اور انسانی سطح پر انسانی وسائل (Human Resources) کا بالخصوص مسلم انسانی وسائل جو اس ملک میں 'Highly Scarce' ہونے کے سبب انتہا درجے کے 'Constraint' شمار ہوتے ہیں کا بدترین زیاں کرنے والوں میں مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے اساتذہ اور ان کے تتبع میں وہاں کے فارغین سر فہرست ہیں۔

۳۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں ترقی (Promotion) اور استحکام کے لئے اساتذہ کا حالیہ چند برسوں میں بعض چھپھوری اور مضحکہ خیز حرکتوں اور اعمال پر اتر آنا مثلاً:

۱۔ اپنے تحریری، تصنیفی یا علمی تفوق کو ثابت کرنے کے لئے حقیقی علمی کارناموں کو انجام دینے کی بجائے ذرائع ابلاغ بالخصوص اردو اور ہندی اخبارات (Vernaculars) میں (الف) اپنے مغربی ممالک کے سفار کی خبر چھپوانا (ب) وہاں کے کسی غیر

معروف جیبی ادارے کی رکنیت دیئے جانے کی خبر چھپوانا (ج) وہاں کے کسی غیر معروف یا جیبی ادارے کی جانب سے خطاب، ایوارڈ یا انعام دیئے جانے کی خبر چھپوانا۔

۵۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے اساتذہ کا حقیقی سطح پر Actually یا Virtually ہر طرح کی علمی گفتگو، تبادلہ خیال، مباحثہ، مکالمہ، مراسلہ اور مکاتبتہ حتیٰ کہ مشافہہ سے مستقل، کلی اور حتمی گریز کرنا اور بد قسمتی سے اتفاقی طور پر Encounter ہو جانے کی صورت میں ایسے رویئے کا اظہار کرنا گویا انہیں غیر معمولی علمی، فکری، تصنیفی، تحقیقی اور تجرباتی امور نے اس قدر جذب اور مشغول کر رکھا ہے کہ ایسے ثانوی یا غیر ضروری امور کے لئے وقت فارغ کرنے سے وہ قاصر ہیں۔ انہیں اس بات کا قطعاً احساس نہیں ہے کہ ان کے استعداد سے عاری ہونے کے سبب علمی مباحثہ سے فرار اختیار کرنے کے لئے یوں Nerd بننے یا ظاہر کرنے کے عمل نے پوری دنیا میں انہیں 'ہدفِ تمسخر' یا 'ضحوک' (Laughing Stock) بنا کر رکھ دیا ہے۔

۶۔ علمی استعداد کا عمومی (Across the board) انحطاط اساتذہ اور ان کے نتیجے میں طلبہ و طالبات میں متعدد اقسام کی اخلاقی خرابیاں پیدا کرنے کا باعث ہوا ہے۔ ایسی متعدد اخلاقی خرابیوں میں سے سب سے بری اور دور رس نتائج کی حامل اور متعدی خرابی یونیورسٹی میں 'متحارب ماحول' (Intermecine Atmosphere) کا پیدا ہو جانا ہے۔ اس کے کئی ابعاد (Dimensions) ہیں جن میں چند درج ذیل ہیں:

(الف) برسرکار اساتذہ کی جو باہم خواہ متحارب ہی کیوں نہ ہوں مشترکہ کوشش ہوتی ہے کہ کوئی صاحب استعداد ان کے شعبے میں بحیثیت استاذ بحال نہ ہو حتیٰ کہ امیدوار ان کا شاگرد ہی کیوں نہ ہو۔

(ب) بعض مسند نشین اساتذہ (ہیڈ، چیرمین یا ڈین) سبک دوش اور بالخصوص ریٹائرڈ ہو جانے والے پیش رو مسند نشین کے ساتھ ذلالت کی حد تک بدسلوکی پر اتر آتے ہیں خواہ وہ ان کا استاذ اور محسن ہی کیوں نہ ہو۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک واقعہ درج کیا جائے:

سید محمد افضل تحریر فرماتے ہیں:

”سرور صاحب یونیورسٹی کے اسی دور میں استاد تھے کہ جب شعبے کا ہیڈ وظیفہ یابی تک شعبے کا ہیڈ رہتا تھا۔ ممکن ہے اس زمانے میں کچھ لوگ ان سے ناراض رہے ہوں۔ عموماً باختیار لوگوں سے جانے انجانے کچھ غلطیاں ہو جاتی ہیں مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کی علمی کاوشوں کو بھی بھلا دیا جائے۔ اس ضمن میں کچھ باتیں تحریر کر رہا ہوں۔ جب سرور صاحب کی شعبہ جاتی حکومت شعبہ اردو سے ختم ہوئی اور عنان اقتدار ان کے وارث کے پاس آئی تو ایک صاحب، جو سرور صاحب کے شاگردِ رشید رہ چکے تھے اور اپنی ایک تصنیف بھی ان کو معنون کر چکے تھے، انھوں نے سراج اور نگ آبادی کا مندرجہ ذیل شعر پڑھا۔

چلی سمتِ غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا

مگر ایک شاخ نہالِ غم جسے دل کہیں سوہری رہی

’سرور‘ اور ’شاخ نہالِ غم‘ کے پس منظر سے آپ بخوبی واقف ہوں گے۔ حالانکہ جنھوں نے نہالِ غم کی خوشبوؤں کے لئے یہ شعر پڑھا تھا، ان ہی کو نہالِ غم نے اسیرِ غم کر دیا اور ان کے مقابلے میں بظاہر ایک بے حد ناقابلِ شخص کو مرتبہ عطا کیا۔ اور پھر جس طرح وہ نہالِ غم زندگی کے آخری لمحات میں ذہنی اور جسمانی طور پر مفلوج و ماؤف ہوا، اللہ سب کو اس سے بچائے۔

یہ لمحہ موجود ہی وہ روز جزا ہے

جس پر تجھے کس درجہ یقیں تھا کہ نہیں ہے

تو منکر قانونِ مکافات عمل تھا

لے دیکھ ترا عرصہٴ محشر بھی یہیں ہے

میں علی گڑھ میں طالب علم تھا اور برادرِ بزرگ سید محمد اشرف وہاں انکم ٹیکس افسر تھے۔ یومِ آزادی کا مشاعرہ آئس فیکلٹی میں منعقد کیا گیا۔ مشاعرہ رات کو دیر تک چلا۔ سرور صاحب

اور بیگم صاحبہ بھی موجود تھے۔ مشاعرے کے بعد رات میں رکشے والے شدید سردی کی وجہ سے جاچکے تھے۔ اور صاحبِ ثروت لوگ اپنی گاڑیوں میں اپنے دوستوں کو لئے جا رہے تھے۔ یقین جانئے سب نے سرور صاحب کو ایسے نظر انداز کیا جیسے ان پر نظر ہی نہ پڑی ہو۔ اشرف بھائی کو میں نے تفصیل سے آگاہ کیا اور وہ منت سماجت کر کے دونوں کو اپنے ساتھ لے گئے۔ مگر اشرف بھائی نے سودا کا ایک شعر پڑھا تھا۔

کس ہستی موہوم پہ نازاں ہے تو اے یار

کچھ اپنے شب و روز کی ہے تجھ کو خبر بھی

[ملاحظہ فرمائیں: خبرنامہ شب خون: نمبر ۷۱: فروری تا اپریل ۲۰۱۲ء]

گزشتہ ساٹھ سالوں میں اس اخلاقی زوال کی بھرپور جھلک اطہر صدیقی کی خودنوشت ”میں کیا میری حیات کیا“ کے سطور اور اس سے زیادہ اس کے بین السطور میں مل جاتی ہے۔ (ج) اساتذہ یا ان کے ماتحتوں کے ذریعہ شعبے میں سینئرز، ہم رتبہ یا جونیئر اساتذہ کی ڈاک یا تو غائب کر دی جاتی ہیں یا غلط اطلاعات دے کر واپس کر دی جاتی ہیں۔ اس حوالے سے تین اقسام کے واقعات کا انکشاف ہوا:

۱۔ ایک خط مرسل کے پاس واپس آ گیا جس پر تحریر تھا: ’مرسل الیہ بیرون ملک گئے ہوئے ہیں لہذا خط واپس ہو جب کہ مرسل کو پورا علم تھا کہ مرسل الیہ دو دن قبل بیرون ملک گئے ہیں اور تیسرے دن واپس آ جانے والے ہیں۔

۲۔ ایک خط مرسل کے پاس واپس آ گیا مرسل الیہ شعبے کا چیرمین تھا۔ محکمہ ڈاک کی جانب سے شعبہ کے ہیڈ کے حوالے سے تحریر تھا: ’Retired, Left W/A یعنی مرسل الیہ وظیفہ یاب ہو کر اور بغیر پتہ دیئے چلے گئے ہیں۔ جب کہ مرسل کو خوب معلوم تھا کہ مرسل الیہ یعنی شعبہ کے چیرمین گزشتہ تقریباً چونتیس سالوں سے یونیورسٹی میں پڑھا رہے ہیں اور اس سے قبل اسکول سے پی ایچ ڈی تک وہ مسلم یونیورسٹی کے طالب علم اور ریسرچ اسکالر رہے ہیں گویا وہ گزشتہ پچاس سالوں سے مسلم یونیورسٹی میں رہتے

چلے آئے ہیں۔ یونیورسٹی سے 1000 میٹر کے اندر ان کا ذاتی مکان ہے۔ مرسل کی صرف اتنی سی خطا تھی کہ اسے معلوم نہ تھا کہ مرسل الیہ صرف چند ہفتوں قبل وظیفہ یاب ہو چکے ہیں اور انھیں یہ خط شعبے کے پتے پر بھیجنا نہیں چاہیے تھا۔ لیکن مرسل کے لئے اس سے بھی زیادہ عبرت ناک واقعہ وہ ہوا جو اس کے بعد رونما ہوا۔ اس نے اسی خط کو بغیر کھولے دوسرے لفافے میں اب مرسل الیہ کے رہائش گاہ کے پتے پر بھیج دیا۔ ایسا کرنے کی منشا یہ تھی کہ مرسل الیہ پچشم خود دیکھ لیں کہ ان کی ڈاک کے ساتھ ان کے 'خلفا' نے کیا سلوک کیا ہے۔ چند ہی دنوں میں ان کا جواب آیا اور مرسل حیران رہ گیا کہ اس واقعہ کا انھوں نے سرے سے ذکر ہی نہیں کیا یعنی نوٹس ہی نہیں لیا گیا یا ایسا ہونا ان کے نزدیک باعث حیرت تھا نہ افسوسناک۔ اس موقع پر عاجز کو وہ کہانی یاد آگئی ”جب ایک دن ایک اکلوتے بیٹے نے اپنے بوڑھے اور بیمار باپ کو کاندھے پر اٹھایا تو باپ نے پوچھا: بیٹے! مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟ بیٹے نے جواب دیا: باپو! شہر علاج کروانے لے جا رہا ہوں۔ بیٹا باپ کو پیٹھ پر لاد کر چلنے لگا۔ باپ نے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد بیٹا رک گیا۔ باپ نے آنکھیں کھولیں۔ دیکھا تو جنگل میں ایک سنان جگہ تھی جہاں نیچے گہرا کھڈ تھا۔ اس سے پہلے کہ بیٹا کچھ کہتا بوڑھے اور بیمار باپ نے کہا: بیٹا! تھوڑا اور آگے لے چلو۔ یہ جگہ تو وہ ہے جہاں میں نے تیرے دادا کو پھینکا تھا۔“

۷۔ روئے ارض پر موجود عام انسانی اخلاق کے مقابلے میں مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں علمی، فکری اور اخلاقی زوال کس نخلی سطح تک آچکا ہے اس کے موازنہ کے لئے عاجز ایک ایسے واقعے کا ذکر کرتا ہے جس کا اسے ذاتی تجربہ ہوا۔ یہ بات 1983-84 کے آس پاس کی ہے۔ عاجز ایک موقر علمی جریدے کی ایک خصوصی اشاعت کا ادارتی ذمہ دار تھا۔ اس نے عالمی سطح کے چند اہل علم سے جن میں بعض معروف مستشرقین بھی تھے، رابطے کی کوشش کی۔ اسی سلسلے میں عاجز نے ایک عنوان مشہور مستشرق ڈاکٹر ٹرال (Dr. Troll) کے لئے بھی تجویز کیا۔ مشکل یہ تھی کہ ان کا موجودہ پتا عاجز کو معلوم نہ تھا چنانچہ عاجز نے

دس سال قبل کے اس پتے پر انھیں خط بھیج دیا جو ہندوستان میں قیام کے دوران ان کا پتا تھا۔ تقریباً پندرہ دنوں بعد ایک صاحب ملاقات کو آئے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے ڈاکٹر ٹرال نے بھیجا ہے۔ رات ان کا فون آیا تھا۔ انہوں نے فرمایا ہے کہ میں آپ سے ملوں اور ضروری تعاون دوں۔ غالباً آپ نے انھیں خط لکھا تھا۔ جس پتے پر آپ کا خط گیا تھا وہاں کے ذمہ داروں نے وہ خط انھیں بھجوا دیا جس کے بعد انہوں نے آپ سے رابطہ کرنے کی تاکید کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ڈاکٹر ٹرال ہندوستان سے جرمنی چلے گئے تھے اور اس وقت وہ ویشیکن میں ہیں۔

فکری اور علمی اعتبار سے مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں آئے اخلاقی زوال کی صورتحال ناگفتہ بہ ہے۔ گزشتہ پچیس سالوں میں واقع ہونے والے ایسے چند واقعات 'مشتے از خروارے' صورتحال کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ہوں گے:

۱۔ عاجزان دنوں سیرت طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے بعض دقیق پہلوؤں پر کام کر رہا تھا۔ ظاہر ہے کسی ایسے عنوان پر کام کرتے ہوئے ہندوستان میں کسی بھی علمی تعاون کے لئے نہ صرف ہندوستان بلکہ عالمی سطح پر مسلمانوں کے سب سے عظیم الشان تعلیم گاہ کی جانب جہاں عدیم النظیر علمی منابع اور مصادر اور اہل علم پائے جاتے ہیں خیال کا جانا لازمی تھا۔ چنانچہ اس نے مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے کم از کم تیس اہل علم سے جن میں اکثر پروفیسرز تھے اور جو مختلف فیکلٹیوں سے تعلق رکھتے تھے متعلقہ عنوانات پر رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ ان میں سے ہر ایک نے ایک ہی بات کہہ کر کسی بھی قسم کے تعاون دینے سے معذرت کر لی۔ ہر ایک نے مطلع کیا کہ وہ از حد مشغول ہیں۔ سیرت طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دقیق پہلوؤں میں دو عنوانات اور ان پر عاجز کو ملے جو بات کا ذکر باعثِ عبرت ہوں گے۔ یہ دو عنوانات درج ذیل ہیں:

۱۔ "ساتویں صدی عیسوی میں اسلام اور سیرت طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے سنسکرت، انگریزی، پراکرت اور پالی لٹریچر میں موجود مواد۔"

۲۔ "پنجابی Folklore، شاہ مکھی اور گور مکھی لٹریچر میں سیرت طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

اثرات۔

دوسرے عنوان پر جب عاجز نے ایک ایسے سکھ دانش ور، صاحب طرز مصنف اور محقق سے جو عالم عربی میں بھی اپنی عربی تصنیفات کے لئے جانے جاتے ہیں رابطہ کیا تو وہ فوراً تیار ہو گئے اور اس عنوان پر اپنا مقالہ دو مہینوں کے اندر اندر ارسال کر دیا۔ سب سے بڑی مشکل اول الذکر عنوان سے متعلق تھی۔ ایک صاحب نے مشورہ دیا کہ کلکتہ میں رہنے والے ایک محقق ڈاکٹر مکھو پادھیالے سے رابطہ کروں۔ شاید وہ تیار ہو جائیں۔ وہ اعلیٰ درجے کے صاحب علم ہیں اور ان کا مطالعہ از حد گہرا اور وسیع ہے۔ عاجز نے انھیں خط لکھا۔ فوراً جواب آیا۔ انھوں نے لکھا کہ میرے لئے سعادت کی بات ہوگی کہ میں اس عنوان پر مقالہ لکھوں۔ لیکن میرے نزدیک دو موانع ہیں۔ اولاً آپ کی یہ قید کہ مقالہ ایک مہینے میں بھیج دیا جائے۔ اگر آپ اس مدت کو دو مہینے کر دیں تو مجھے آسانی ہو جائے گی۔ دوسرا مانع میری صحت ہے۔ میں بہت سن رسیدہ اور ضعیف ہو چکا ہوں۔ میں پوری کوشش کروں گا۔ اگر نہ لکھ سکا تو مجھے معذور سمجھیں۔ میں نے فوراً لکھا کہ آپ دو مہینے میں مقالہ ارسال فرمادیں۔ ان کے بیٹے کا جواب آیا کہ والد صاحب کا تین دنوں قبل دے ہانت ہو گیا۔ آپ کا خط دے ہانت کے دوسرے دن ملا۔ لہذا آپ کو صورتحال سے مطلع کیا جاتا ہے۔

۲۔ تقریباً تیس سال قبل عاجز ”بیسویں صدی میں اسلامی علمی پیش رفت“ کے عنوان سے ایک اشاعت کی تیاری کا ذمہ دار تھا۔ اس نے مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے اہل علم سے رابطہ کیا۔ کسی کا تعاون نہ مل سکا۔ معذرت کی کم و بیش دو صورتیں سامنے آئیں۔ اکثریت نے خط کا سرے سے جواب ہی نہیں دیا اور جواب دینے والوں نے یہ لکھا کہ وہ ضروری کاموں میں از حد مشغول ہیں لہذا تعاون دینے سے قاصر ہیں۔ اسی عنوان کے تحت عاجز نے برطانیہ کے مشہور مذہبی رہنما اور مستشرق Rev. Kenneth Cragg سے رابطہ کیا۔ اسی سلسلے اور اسی نوعیت کا خط جو مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے اہل علم کو بھیجا گیا تھا ریورینڈ کریگ

کو بھی بھیجا گیا۔ عاجز نے ان سے ایک نادر اور غیر معمولی عنوان پر مقالہ تحریر فرمانے کی درخواست کی۔ عنوان تھا:

”بائبل کے عہد ساز مفسر (J.H. Newman (1801-1890) اور قرآن کے بیسویں صدی کے معروف مفسر مولانا مودودی کی تفسیری تعبیرات و تاویلات (Exegetical Hermeneutics) کا تقابلی مطالعہ۔“

ریورینڈ کریگ کا جواب آیا۔ انہوں نے لکھا کہ ان کے لئے سعادت کی بات ہوتی کہ وہ اس عنوان پر تقابلی مطالعہ پیش کرتے۔ انہوں نے لکھا: ایسا لگتا ہے کہ آپ (عاجز) میرے موجودہ احوال سے واقف نہیں۔ میں Nonagenarian ہو چکا ہوں۔ ضعف انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ گزشتہ ایک سال سے صاحب فراش ہوں۔ کاش میں آپ کی خواہش پوری کر سکتا۔ مجھے معذور سمجھیں۔ تاہم کیا میں یہ درخواست کر سکتا ہوں کہ جب یہ کاوش شائع ہو جائے تو آپ مجھے اس سے استفادہ کا موقع عنایت فرمائیں گے۔ تقریباً پانچ چھ ہفتوں کے بعد خط موصول ہوا۔ لکھا تھا: ریورینڈ کافلاں تاریخ کو انتقال ہو گیا ہے۔ ان کے ٹیبل ڈائری میں ایک کاغذ پر آپ کا پتا تحریر تھا لہذا اس کی اطلاع آپ کو دی جاتی ہے۔

۳۔ اخلاقی زوال کے اسی سلسلے میں مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے اساتذہ کا ایک مخصوص طرز عمل قابل ذکر ہے۔ ایک صاحب نے جو مسلمانوں کے احوال کی حقیقت جاننے اور ان کی اصلاح حال کے لئے منصوبہ بندی کرنے پر کام کر رہے تھے بتایا کہ ایک ہمہ جہت سروے اور منصوبہ بندی سے قبل انہوں نے رابطے کے لئے صورت یہ اختیار کی کہ ایک رسالہ (Brochure) بطور بیک گراؤنڈ لکھ کر مطبوعہ شکل میں مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی بعض فیکلٹیوں کے تقریباً سواہل علم (لیکچررز، ریڈرز اور پروفیسرز) کو بھیجا۔ چونکہ یہ سارے رسالے رجسٹرڈ ڈاک سے بھیجے گئے تھے اس لئے ابتدائی چند رسالے وہاں موصول ہو گئے جن کی دوسرے ذرائع سے تصدیق ہو گئی۔ پھر رسالے ڈاک سے واپس آنے شروع ہو گئے۔ انہیں سخت حیرت ہوئی۔ ان کے دفتر میں بیسویں واپس شدہ رسالے رکھے ہوئے

تھے۔ ابھی عاجز سے وہ اس صورتحال کا ذکر کر رہے تھے کہ کلکتہ سے ایک شناسا جو ایک دن کے لئے مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں رکنے کے لئے اور صبح کی ٹرین سے تھوڑی دیر قبل دہلی تشریف لائے تھے داخل ہوئے۔ دوران گفتگو صاحب معاملہ نے فرمایا کہ رسالوں کا واپس آجانا بہت قابل ذکر نہیں ناقابل فہم دراصل وہ عبارت ہے جو تقریباً ہر رسالے پر تحریر ہے۔ پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ ہر رسالے پر لکھا ہے: 'Out of India' لہذا ڈاک واپس ہو۔ کلکتہ سے آنے والے شناسا نے دریافت کیا کہ کن کن لوگوں کی ڈاک واپس آئی ہے؟ انہیں چند نام بتائے گئے۔ اس پر انہوں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کل میں سارا دن یونیورسٹی میں ہی رہا۔ ان میں سے فلاں فلاں اساتذہ سے میری ملاقات ہوئی اور فلاں فلاں پر نظر پڑی۔ ان میں شاید ہی کوئی اس وقت بیرون ملک کے دورے پر ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ایسے تمام علمی تعاون سے انکار کرنے کے لئے ایسی ترکیب اختیار کی جاتی ہے تاکہ علمی وقار بھی برقرار رہے اور ان خرخشوں سے پیچھا بھی چھوٹ جائے۔ ممکن ہے اس سے یہ تاثر بھی دینا مقصود ہو کہ یہ بڑی علمی شخصیتیں ہیں جن کی بیرون ملک اور بالخصوص مغربی علمی دنیا میں بہت طلب ہے اور وہ ان اہم علمی مشاغل میں اتنے منہمک ہیں کہ انہیں غیر ضروری کاموں کے لئے فرصت میسر نہیں۔ ممکن ہے ایسا بھی ہو کہ ان کے رویوں نے محکمہ ڈاک کے تن آسان اہل کاروں کو جبری بنا دیا ہو اور وہ خود ایسا کرنے لگے ہوں۔

۸۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کا علمی اور اخلاقی زوال اب ایک نہایت خطرناک مرحلے میں داخل ہو گیا ہے۔ اگر یہ بات درست ہے جس کی تصدیق مختلف ذرائع، واقعات اور حادثات سے ہو رہی ہے تو پھر مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے لئے اس سے بری خبر اور اس سے بڑی ہلاکت کچھ اور نہیں ہو سکتی۔ گزشتہ تیس سالوں سے بالعموم اور بیس سالوں سے بالخصوص یونیورسٹی میں ایسی ذہنیت کو جو فروغ مل رہا ہے جو مسلم یونیورسٹی کو تباہ و برباد کر کے رکھ دے گی۔

جو اہل علم مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی تاریخی نازکی کا ادراک رکھتے ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اینگلو محمدان اور مینٹل کالج اپنے قیام سے آج تک پل صراط سے گزر رہا ہے۔ اس کی تاریخ میں سب سے بڑا اور

مہلک فساد 1906-1907 میں پیدا ہوا جس کا اصلی سبب وہ ذہنی تصادم تھا جو سر سید اور شبلی کے مابین گزشتہ بائیس سالوں سے ہو رہا تھا۔ محسن الملک اور وقار الملک بہر حال سر سید نہ تھے۔ چنانچہ اس فسادِ قلب و نظر نے انفجار کی شکل اختیار کر لی جس نے سر سید کی تحریک کالج کو جڑ سے ہلا کر رکھ دیا جس سے یونیورسٹی آج تک باہر نہیں آسکی ہے۔

ملاحظہ فرمائیں:

(۱) David Lelyveld: Aligarh's First Generation: Life of the Mind; Princeton University Press, 1978

(۲) محمد بدرالدین (علیگ): مرقع کالج: باب ہفتم: شورش ۱۹۰۷ء، طبع اول: مطبع مطوع العلوم، مراد آباد ۱۹۱۶ء، اشاعت ثانی ۲۰۰۵ء، باہتمام محمد قاسم صدیقی ابن محمد بدرالدین علیگ (1887-1936)

(۳) شبلی نعمانی: مقالات شبلی جلد دوم (مرتبہ سید سلیمان ندوی: سر سید مرحوم اور اردو لٹریچر: محمدن اینگلو اورینٹل کالج میگزین، علی گڑھ، مئی ۱۸۹۸ء)

(۴) شبلی نعمانی: خطبات شبلی: علما کے فرائض: اعظم گڑھ، معارف (1965)

(۵) شبلی نعمانی: مقالات شبلی جلد اول (مرتبہ سید سلیمان ندوی: اختلاف اور مسامحت اور اختلاف کے ساتھ اتحاد)

اسی فسادِ قلب و نظر نے 1920-21 کی شورش کو جنم دیا۔

ملاحظہ فرمائیں:

(۱) ڈاکٹر معین الحق: معین جی: پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی 1993

(۲) Dr. Ishrat Ali Siddiqui: Aligarh: Past and Present: 1992

(۳) ڈاکٹر ذاکر حسین: کچھوا اور خرگوش: نیشنل بک ٹرسٹ، 1970

(۴) ڈاکٹر ذاکر حسین: تعلیمی خطبات: مکتبہ جامعہ، 1988

(۵) پروفیسر محمد مجیب: خانہ جنگی: 1976

(۶) Prof. M. Mujeeb: The Indian Muslims, London:

George Allen & Unwin: 1967

(۷) ڈاکٹر ذاکر حسین: بنیادی قومی تعلیم: 1939

(۸) پروفیسر محمد شبیر خاں: ذاکر صاحب کی شخصیت میری نظر میں: صفحہ 118-111: جرنل خدا

بخش لائبریری، 50، 1989، پٹنہ

حالیہ دنوں میں متعدد واقعات اس کی تصدیق کر رہے ہیں کہ یہ فساد قلب و نظر مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں پھر سراٹھا کر مائل بہ انفجار ہے۔ خدا نخواستہ اگر ایسا ہوا تو اس بار مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ جاں بر نہ ہو سکے گی۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق: اگست ۲۰۱۲ عیسوی کا ادارہ یہ اسی ممکنہ انفجار کی جانب اشارہ کر رہا ہے:

”جلد اول (قرآن نمبر) کے ایک مقالہ ”آدم، حوا اور عیسیٰ کی پیدائش: قرآن کریم اور روایات کی روشنی میں“ پر ہمیں سخت دست، سب و شتم سے گزرنا پڑا، ہمارے کچھ اساتذہ کرام اور معدودے عزیز طلبہ نے ہمیں جن ناگفتہ بہ القاب و آداب سے نوازا انھیں لکھنا تو درکنار انہیں زبان پر لانا بھی ہمیں گوارا نہیں۔ اس سے تو اس درس گاہ اور تربیت گاہ کا وقار مجروح ہوا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ”سبب المسلم فسوق وقتالہ کفر“ سے ہم واقف نہیں ہیں۔ بارہا اساتذہ کرام اور طلبہ سے عجز و انکسار کے ساتھ ملتمس رہا کہ اس کا ایک ہی حل ہے کہ مدلل و مسکت جواب دیا جائے لیکن یہ التماس بے اعتنائیوں کا شکار رہی.....

”کیا سر سید کے اس علمی شہر میں تحقیق و تنقید کا یہ نہج مناسب ہے؟“

یہ صورت حال ایک ہولناک طوفان کی آمد آمد کی خبر دے رہی ہے۔

سفر نصیب

۱۔ نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات (632) کے بعد کی اسلامی تاریخ کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ واقعہ کربلا (680) کے بعد امت مسلمہ محمدیہ کی فکری، علمی، عملی اور ادارہ جاتی بحالی کے لئے سب سے توانا اور معجز آثار آواز انیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستان میں بلند ہوئی۔ یہ آواز تھی مرزا اسد اللہ خاں غالب (1797-1869) کی۔

مژدہ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند
رخ کشوند و لب ہرزہ سرایم بستند
دل ربوند و دو چشم نگرانم دادند
گہر از رایت شاہان عجم بر چیدند
بہ عوض خامہ گنجینہ فشانم دادند
افسراز تارک ترکان چشنگی بردند
بہ سخن ناصیہ فر کیانم دادند
گوہر از تاج گسستند و بہ دانش بستند
ہرچہ بردند بہ پیدا بہ نہانم دادند

(۱۸۴۷-۳۸)

680 عیسوی کے بعد امت مسلمہ ایک ایسے دور مظلمہ میں داخل ہو گئی تھی جس نے رفتہ رفتہ اس کی ساری توانائیاں سلب کر کے اس کے جسد کو معطل اور زندہ لاش میں تبدیل کر دیا تھا۔ اس تعطل اور نیم جانی

نے اسلام کو زندگی کے میدانِ عمل سے عملاً بے دخل اور قرآن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کو محبوب بنا کر رکھ دیا تھا۔ اصلاح کرنے، اسے قبول، جذب اور بار آور کرنے اور ایسی اصلاح کو استحکام بخشنے کی ہر قوت معدوم ہو چکی تھی۔ اسلامی تاریخ میں مرزا اسد اللہ خاں غالب وہ پہلی شخصیت ہے جو اس حقیقت سے آگاہ ہوئی کہ امت کی اس کیفیت کی کنہ کیا ہے؟ اور اس کیفیت سے نکلنے کی راہ کون سی ہے؟ غالب نے آگاہ کیا کہ 680 عیسوی کے بعد امتِ مسلمہ محمدیہ جس 'بیماری' میں مبتلا کر دی گئی ہے اسے 'تکلیف' (Conditioning) کہتے ہیں۔ اور اس 'تکلیف' سے نکلنے کی شاہ کلید 'علم' کی بازیافت ہے۔ 'علم' کی بازیافت سے مراد قرآنی انسان کی بازیافت ہے۔ یہ عرش کی آواز تھی جو غالب کے نطق سے بلند ہوئی۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں غالب صریح خامہ نواے سروش ہے غالب نے امت کو اور ان کے حوالے سے مظلوم انسانیت کو اصل زمینی حقائق سے آگاہ کیا۔ ان تبدیلیوں کی آگاہی دی جو روز روشن کی طرح سامنے تھیں۔ غالب نے انسانیت کو سنت اللہ سے ہم آہنگ ہونے، ارادۃ اللہ کا ادراک کرنے اور منصوبہ ربانی کا حصہ بننے کی ترغیب دی۔ چودہ سو سالوں کے قرونِ مظلمہ میں رہتے رہتے انسانی ذہن و فکر پر جو گھٹا ٹوپ تاریکی چھا گئی تھی اس سے نکلنے کی ہمت دلائی۔ معرکہ خیر و شر جس مرحلے میں داخل ہو چکا تھا اس کا حقیقی ادراک کرنے اور خیر کی قوتوں کا حصہ بننے کا احساس دلایا۔

سر سید غالب کے پہلے معنوی فرزند ثابت ہوئے۔ غالب کا لاہوتی انفجار واقعہ کربلا کے بعد واقع ہونے والا سب سے بڑا اور تو انا انفجار تھا جس نے یکے بعد دیگرے تین متسلسل انفجارات کو جنم دیا۔ یہ تین انفجارات درج ذیل ہیں:

۱۔ سر سید (1817-1898) کا فکری انفجار

۲۔ حالی (1837-1914) کا علمی انفجار

۳۔ اقبال (1875-1938) کا حرکی انفجار

امتِ مسلمہ کو اس تاریخی 'تکلیف' (Conditioning) سے باہر نکالنے کی سر سید کی کوشش سب سے عظیم الشان فکری، علمی، عملی اور ادارہ جاتی کوشش تھی۔ اس فکری، علمی، عملی اور ادارہ جاتی کوشش کا ہدف اولین ایسی 'فضا' (Environment) کی تشکیل و تعمیر تھا جہاں اس 'علم' کی بازیافت ہو جس سے قرآنی

انسان کی بازیافت ممکن ہو جائے۔

۲۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کا۔ (جس کا اولین خاکہ 'مدرستہ العلوم' اور پھر اینگلو محمدن اور نیشنل کالج کی شکلوں میں ظاہر ہوا) مقصدِ اولین ایک ایسے ادارے، نظامِ تعلیم، معلمین اور تعلیم گاہ کے معرض وجود میں لانے کا تھا جہاں 'قرآنی ذہن، قرآنی فکر، قرآنی علم اور قرآنی اخلاق سے مزکی' انسان پیدا کئے جائیں جنہیں بجا طور پر 'قرآنی انسان' یا 'مومنِ خالص' کہا جاسکے۔ ایسے انسان جن کے دماغ قرآنی علوم سے پرداختہ ہوں، جن کی رگ و پے میں قرآنی حکمت، قرآنی برہان اور قرآنی حرارت خون کی طرح رواں ہوں اور جو انسانوں کے مابین اس ذمہ داری کو اٹھانے کے اہل، اس کے لئے مستعد اور اس کی ادائیگی کے لئے برسر عمل ہوں جس کے لئے قرآن کا نزول ہوا ہے۔

۳۔ سرید کے ذہن میں جس 'قرآنی انسان' کا خاکہ تھا اس کی بہترین تفہیم وہ مراست کرتی ہے جو سرید اور نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی خاں کے مابین ہوئی تھی بالخصوص وہ خط جو سرید نے محسن الملک کے خط (مورخہ ۹ اگست ۱۸۹۲ بمقام حیدرآباد دکن) کے جواب میں (مورخہ ۱۷ اگست ۱۸۹۲ بمقام الہ آباد) ان کو لکھا۔ سرید بالیقین اپنی حیات میں وہ سب کچھ نہیں دیکھ پائے جن کے وہ خواہشمند اور جن کے لئے کوشاں تھے۔ چودہ سو سال کی تاریکی اور معطلی سے اتنی کم مدت میں باہر نکل آنا ممکن بھی نہیں تھا۔ اسی احساس کا اظہار اقبال نے یوں کیا ہے:

تو ابھی رہ گزر میں ہے قیدِ مقام سے گزر
مصر و حجاز سے گزر پارس و شام سے گزر

(اقبال: بال جبریل: حصہ دوم: ۵)

مسلمانوں کی تاریخ میں چودہ سو سالوں سے جاری زوال کا بنیادی سبب 'تکلیف' (Conditioning) ہے۔ مسلم معاشرے میں 661 عیسوی میں قائم کی جانے والی یہ 'تکلیف' (Conditioning) دو عناصر کے باہمی تعاون و تعاہد کا نتیجہ تھی۔ یہ دو عناصر تھے:

۱۔ حکمران۔۔۔ اور

۲۔ علما۔

چنانچہ ان دونوں عناصر نے مسلم معاشرے میں دو طرح کی تکلیفیں (Conditionings) قائم کر کے پوری ملت کو دو خانوں میں بانٹ کر قید کر دیا۔ ان دو تکلیف خانوں نے امت کو دو اقسام کی صورتحال میں مبتلا کر کے رکھ دیا:

۱۔ عمودی ثنویت (Vertical Dichotomy) اور

۲۔ افقی ترادفیت (Horizontal Dualism)

۴۔ سر سید ہر چند کہ اپنی کوششوں میں ناکام نہیں ہوئے لیکن وہ اپنی زندگی میں پوری طرح کامیاب بھی نہ ہو سکے۔ ان کی ناکامی کا واحد سبب 'مسلم تاریخ' کی وہ روایت (Legacy) ہے جس سے امت ابھی تک آزاد نہیں ہو سکی تھی۔ یہ روایت 'عمودی ثنویت' (Vertical Dichotomy) اور افقی ترادفیت (Horizontal Dualism) قائم کرنے اور اسے رکھنے والے دو تاریخی عناصر کا امت کے ذہن و فکر پر اب بھی موثر حیثیت سے باقی رہنا تھی۔ سر سید اپنی حیات میں مسلم حکمرانوں (?) اور علما کے سبب اس تکلیف (Conditioning) کو زائل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

۵۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی موجودہ صورتحال اسی ناکامی کی بھرپور عکاسی کرتی ہے کہ وہاں آج 'قرآنی انسان' یعنی 'قرآنی ذہن، قرآنی فکر اور قرآنی اخلاق سے مزکی انسان' عنقا ہے۔ آج وہاں سنی ہیں، شیعہ ہیں، مقلد ہیں، غیر مقلد ہیں، دیوبندی ہیں، بریلوی ہیں، سلفی ہیں، خانقاہی ہیں، تحریکی ہیں، تبلیغی ہیں، اشتہالی ہیں، اشتراکی ہیں، دُعا ہے، قضا ہے، بختا ہے، لسان ہیں، رسام ہیں، بٹا ہیں، زمین دار ہیں، تاجر ہیں، پیٹرو ڈالر والے ہیں، مغرب ہیں، مشرق ہیں، بہاری ہیں، ملیالی ہیں، بنگالی ہیں، آسامی ہیں، اودھی ہیں، پوربی ہیں، مصطفیٰ آبادی ہیں۔ غرض سب ہیں لیکن 'انسان کامل' کوئی نہیں۔ ہر طبقے کا اپنا مذہب ہے، مسلک ہے، شرب ہے۔ ہر طبقے کا اپنا مرشد ہے، اپنا موچہ ہے۔ ہر مذہب مکمل اور خود کفیل ہے۔ خود اختیار ہے، خود آشنا ہے۔ خود بین ہے، خود پسند ہے، خود رستہ ہے، خود رنگ ہے، خود کارہ ہے، خود کاشت ہے، خود کامہ ہے، خود مراد ہے، خود مان ہے۔ اسے زیست کے لئے کسی دوسرے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ ہر طبقے کے مطامح، اہداف اور ترجیحات جدا گانہ ہیں۔

مثنویت و ترادفیت

۱۔ انسانی تاریخ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ کسی صورتحال میں انسانی معاشرے میں۔۔ حکمراں، حکومت یا نظام۔۔ کی صورت میں ایسی کوئی قوت کبھی پیدا نہیں ہوئی جو کسی قوم کی بصیرت (Vision) پر قدغن لگا سکے۔ تفکیر کی سطح پر، نہ تدبیر کی سطح پر اور نہ ہی تعمیل کی سطح پر۔ ان حالات میں ایک بڑا سوال پیدا ہوتا ہے:

گزشتہ تین سو سالوں سے بھارت میں مسلمانوں کے زوال اور انحطاط کا بنیادی سبب کیا ہے؟ اس زوال و انحطاط کا منبع کہاں ہے؟ اصلاح احوال کی ہر کوشش کیوں ناکام ہو گئی؟ اور بالآخر لازماً یہ سوال کہ اس زوال و انحطاط کے منبع کو بند کرنے کی تدبیر کیا ہو؟

۲۔ زمانہ عرصہ عمل ہے جہاں ہر لمحے حوادث (Events) رونما ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہر حادثے (Event) کے پیچھے کچھ عوامل (Factors) اور کچھ اسباب (Reasons) لازماً ہوتے ہیں۔ روئے ارض پر رونما ہونے والا ہر حادثہ عموماً تین قسم کے اسباب کا نتیجہ ہوتا ہے:

۱۔ اصلی (Core)

۲۔ متجانبی (Collateral) — اور

۳۔ ضربی (Multiplex)۔

اسی طرح ہر سبب کے پیچھے کوئی عامل اصلی ضرور ہوتا ہے۔ ان تمام اسباب (Reasons) میں اصلی (Core) سبب بھی لازماً صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ بقیہ اسباب اس اصلی سبب کے ہم رکاب یا ریڈف ہو کر اپنا اثر ڈالتے رہتے ہیں تا آن کہ کوئی حرکت واقعہ/حادثہ (Event) کی شکل میں رونما ہو جاتی ہے۔

۳۔ چنانچہ سب سے اہم سوال یہ ہے کہ گزشتہ تین سو سالوں میں مسلمانوں کے لامتناہی (Unending) اور ناقابل انسداد (Unstoppable) زوال و انحطاط کا اصلی سبب (Core Reason) کیا ہے؟ اور اس کے پیچھے کون سا بنیادی عامل (Factor) کارفرما رہا ہے؟

(1700-2012) کی درمیانی تاریخ کا مطالعہ دو طرح کے اسباب کی نشاندہی کرتا ہے:

۱۔ روایتی و موروثی سبب (Traditional & Hereditary Reason) — اور

۲۔ معاصر سبب (Contemporary or Immediate Reason)

(الف) روایتی و موروثی سبب: اس سے مراد وہ سبب ہے جو مسلمانوں کو 1700 عیسوی میں اپنی

سابقہ تاریخ سے ورثے میں ملا۔ یہ روایتی و موروثی سبب ایک 'دو روئیہ شاخسانہ' (Two-Branched outgrowth) کے مانند تھا جس کی دو ظاہرات تھیں:

۱۔ مسلم معاشرے کی عمودی مثنویت کی ظاہرہ

(Phenomenon of Vertical Dichotomy of the Muslim Society)

۲۔ مسلم معاشرے کی افقی تراڈفیت کی ظاہرہ

(Phenomenon of Horizontal Dualism of the Muslim Society)

۱۔ مسلم معاشرے کی عمودی مثنویت کی ظاہرہ (Phenomenon of Vertical

Dichotomy of the Muslim Society): نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ

علیہ وسلم کی وفات انسانی تاریخ کا عدیم النظیر حادثہ تھی جس نے بالعموم نسل انسانی کو اور

بالخصوص مسلمانوں کو ایک عظیم نقص سے دوچار کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے

چند ہی سالوں بعد مسلم معاشرے میں دو طبقے اچانک نمودار ہوئے جنہوں نے دیکھتے

دیکھتے معاشرے کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ 661 عیسوی میں ان دونوں طبقوں کو کلی تمکن

حاصل ہو گیا۔ مسلم معاشرے میں اچانک نمودار ہو جانے والے یہ دو طبقات تھے:

۱۔ حکمران (Rulers) اور

۲۔ علما (Ulama)

ان دونوں طبقات میں ہم آہنگی تھی۔ ان کے مقاصد ایک تھے۔ چنانچہ ان کی باہمی معاونت نے دیکھتے دیکھتے مسلم معاشرے کو دو حصوں میں منقسم کر دیا۔ معاشرے کی یہ تقسیم عمودی (Vertical) تھی۔ چنانچہ اس عمودی تقسیم (Vertical Division) نے مسلم معاشرے میں ایک مخصوص قسم کی ثنویت (Dichotomy) قائم کر دی جسے 'مسلم معاشرے کی عمودی ثنویت' (The Vertical Dichotomy) کا نام دیا جاتا ہے۔

اس ثنویت (Dichotomy) کا باضابطہ آغاز 661 عیسوی میں ہوا۔ اس حادثے کے نتیجے میں مسلم معاشرہ عملاً دو طبقوں (Regimes) میں منقسم ہو گیا:

۱۔ حکمران موجہ طبقہ (Ruler-Oriented Regime)

۲۔ علما موجہ طبقہ (Ulama-Oriented Regime)

حکمران موجہ طبقے (ROR) کی کمان 'حکمران' کے ہاتھوں میں تھی جب کہ علما موجہ طبقے (UOR) کی کمان 'علما' کے ہاتھوں میں۔ 661 عیسوی سے یہ دونوں طبقات (حکمران اور علما) باہم معاون رہے۔ محض اس لئے نہیں کہ دونوں کے مقاصد ایک تھے بلکہ اس سبب سے بھی کہ ایک دوسرے کے تعاون کے بغیر ان دونوں کے اہداف پورے نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ آنے والے دنوں میں اس معاونت کے ذریعہ اٹھائے گئے اقدامات نے مسلم معاشرے میں ایک اور تقسیم کی بنا ڈال دی۔ یہ دوسری تقسیم افقی (Horizontal) تھی۔ اسے افقی دوہرے پن (Horizontal Dualism) کا نام دیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اس تقسیم (Division) سے مسلم معاشرہ افقی (Horizontally) طور پر بھی دو مزید کیفیات میں منقسم ہو کر رہ گیا: یہ دو افقی کیفیات تھیں:

۱۔ حکمران موجہ طبقے کا دوہرا پن

Dualistic Phenomenon of Ruler-Oriented Regime (ROR)

۲۔ علما موجہ طبقے کا دوہرا پن

Dualistic Phenomenon of the Ulama-Oriented Regime (UOR)

چنانچہ ہر طبقہ مزید تلے اوپر دو حصوں یا خانوں (Chambers / Compartments) میں

منقسم ہو گیا۔ اوپری حصہ ابتدائی عہد میں کھلا خانہ (Open or Unconditioned Compartment) تھا۔ اس طبقے کے افراد کی تعداد بے حد محدود تھی۔ یہ انحصار الخواص (Elite) تھے۔ اس کا نچلا حصہ بند خانہ (Closed Compartment) تھا۔ اس طبقے میں کثیر آبادی داخل تھی۔ یہ خانہ صد فی صد مکئیف (Hundred Percent Conditioned) تھا۔ اس طرح کل ملا کر مسلم معاشرہ چار خانوں میں بنٹ چکا تھا یا بانٹ دیا گیا تھا۔ ان چار خانوں میں دو شہوی (Dichotomic) تھے اور دو ترادنی (Dualistic)۔

۱۔ حکمران موجہ طبقہ

حکمران موجہ طبقہ

Ruler-Oriented Regime (ROR)

حکمران موجہ طبقے کا صد فی صد مکئیف خانہ
(Hundred Percent Conditioned
Compartment of ROR)

حکمران موجہ طبقے کا کھلا خانہ
(Open / Unconditioned
Compartment of ROR)

۲۔ علما موجہ طبقہ:

علما موجہ طبقہ

Ulama-Oriented Regime (UOR)

علما موجہ طبقے کا صد فی صد مکئیف خانہ
(Hundred Percent Conditioned
Compartment of UOR)

علما موجہ طبقے کا کھلا خانہ
(Open / Unconditioned
Compartment of UOR)

حکمران موجہ طبقے (ROR) کے صد فی صد مکئیف خانے (Hundred Percent Conditioned Compartment of ROR) میں کثیر آبادی ان طبقات کی تھی جو اگرچہ متوسط طبقے اور عوام سے ہی آتے تھے لیکن مخصوص احوال میں رہتے ہوئے وہ حکمرانوں کی دو اقسام کی ضروریات پوری کرتے تھے۔ یہ دو اقسام کی خدمات (Services) تھیں:

۱۔ عُمّالی خدمات (Administrative Services)

۲۔ عسکری خدمات (Military Services) ،

دوسری جانب علما مُوجِبہ طبقے (UOR) کے صد فی صد مکلف خانے (Hundred Percent Conditioned Compartment of UOR) میں بقیہ معاشرے کی کل عوامی آبادی داخل تھی جو بنیادی طور پر چھوٹے علما اور لاکھوں رکرڈوں عوام پر مشتمل تھا۔ گویا اس طرح 661 عیسوی کے بعد مسلم معاشرے میں حکمرانوں (Rulers) اور علما (Ulama) نے جارج اور ویل کے اینی مل فارم (Animal Farm) سے مشابہ دو اینی مل فارمز قائم کر دیئے۔ صد فی صد مکلف خانے (Hundred Percent Conditioned) یہ دو ذیلی افقی خانے (Horizontal Compartments) بنیادی طور پر نناوے فیصد امت مسلمہ پر مشتمل تھے۔ لیکن یہ دونوں صد فی صد مکلف خانے (H.P.C.C.) یکساں خانے نہیں تھے۔

ان میں اول الذکر یعنی حکمران مُوجِبہ طبقے کا صد فی صد مکلف خانہ (H.P.C.C. of ROR) صرف از روئے حقیقت روبوئی (Actually Robotic) تھا جب کہ ثانی الذکر یعنی علما مُوجِبہ طبقے کا صد فی صد مکلف خانہ (H.P.C.C. of UOR) از روئے قوت روبوئی (Potentially Robotic) بھی بنا دیا گیا تھا۔

چونکہ حکمران مُوجِبہ طبقے کے صد فی صد مکلف خانے (H.P.C.C. of ROR) کے افراد یعنی (نچلے) عمال اور افواج بھی دراصل متوسط طبقے یا عوام سے ہی آتے تھے اور وہاں قائم اداروں (Institutions) کے تعلیم و تربیت یافتہ ہوتے تھے لہذا ہر چند کہ حکمران مُوجِبہ طبقے کے صد فی صد مکلف خانے میں شامل ہو جانے کے سبب نسبتاً زیادہ مراعات (Privileges) اور مواقع (Opportunities) کے مستحق ہو جاتے تھے اس لئے از روئے حقیقت روبوئی (Actually Robotic) ہونے کے باوجود وہ اپنے اندرون میں پہلے سے از روئے قوت بھی روبوئی (Potentially Robotic) ہو چکے ہوتے تھے۔ لہذا ایسے افراد بہت جلد حکمرانوں کے لئے غیر مفید (Unuseful)، غیر پیداواری (Unproductive) حتیٰ کہ بعض اوقات پیداوار مخالف (Counter Productive) ثابت ہونے لگے۔ اس طرح مسلم معاشرے کے چار حصوں میں سے حکمران طبقے کے کھلے اور غیر مکلف خانے کو چھوڑ کر پوری امت مسلمہ از روئے قوت روبوئی (Potentially Robotic) ہو گئی۔ امت مسلمہ کے ان تینوں طبقات کو صد فی صد مضحک

(Degenerate) بنانے میں حکمرانوں (Rulers) اور 'علما' (Ulama) دونوں کا ہاتھ تھا جن میں 'علما' عاملِ حرکی (Active Factor) تھے جب کہ حکمراں ان کے پشتیان۔ چودہ سو سالہ مسلم تاریخ کا مطالعہ اور تجزیہ بتاتے ہیں کہ حکمرانوں نے پوری امتِ مسلمہ کو مضحل (Degenerate) کر دینے کا کام 'علما' سے لیا۔ 'علما' نے حکمرانوں کے اشاروں پر اور ان کے تعاون سے پوری امتِ مسلمہ کو مضحل (Degenerate) کر کے نیم انسانی یا حیوانی (Dehumanized) بنا دینے کا سارا مشن 'نظامِ تعلیم' (Educational System) اور اس سے متعلق اداروں (Institutions) اور اس کے ادوات (Tools) کے ذریعہ پورا کیا۔ حکمرانوں نے اس مشن کو کامیابی سے پورا کرنے کے لئے حکمرانی کے فرائض منصبی سے اور اس کی بنیادی ذمہ داریوں سے عملاً دست بردار ہو کر 'علما' کو اس بات کی نہ صرف اجازت دی بلکہ عملاً علانیہ اور براہِ راست ان کی بھرپور مدد کی تاکہ وہ مسلم معاشرے میں نظامِ تعلیم (Educational System) کا صد فی صد احتکار یا اس کی اجارہ داری (Monopoly) کر لیں۔ مسلم معاشرے میں نظامِ تعلیم پر 'علما' کی مکمل اجارہ داری صرف حکمرانوں کے دست بردار اور پشتیان ہو جانے سے ہی ممکن ہو سکی۔ نہ صرف یہ کہ حکمرانوں نے کبھی اس کی مخالفت نہیں کی بلکہ وہی اس کے سب سے بڑے پاسدار اور پشتیان بنے رہے۔ چنانچہ مدرسہ (Madresa) اور 'منبر' (Pulpit) میں 'علما' کی اجارہ داری (Monopoly) کو توڑ دینے کی کبھی اور کسی کو حکمرانوں نے اجازت نہیں دی۔ یہی وہ موقع تھا جب حکمرانوں (Rulers) اور علما (Ulama) نے باہمی تعاہد اور تعاون سے پوری امتِ مسلمہ کو عملاً غلام (Slave) بنا لیا۔ تاریخ کا اس سے بڑا المیہ کیا ہوگا کہ جو قوم ساری دنیا کے انسانوں کو ہر طرح کی غلامی اور ظلم سے آزاد کرانے کے لئے برپا ہوئی تھی وہ خود سرتا پا غلام (Slave) بنا دی گئی۔ جس قوم کا مقصد وجودِ فکِ رقبہ (90:13) تھا اس کے اندر 'غلامی' (Slavery) کے باضابطہ اور قانونی ادارے قائم کر دیئے گئے۔

ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ مولوی چراغ علی: مجموعہ روایات استرقاق و استامی: 1876: سیتا پور۔

۲۔ مولوی چراغ علی: تدبیر الاسلام فی تحریر الامۃ و الغلام: بحوالہ رسائل چراغ علی مرتبہ مولوی

عبداللہ خاں: کتب خانہ آصفیہ، حیدرآباد 1918۔

یہی وہ حادثہ فاجعہ ہے جس کی خبر دیتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

۱- عن أبي امامه الباهلي عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لينقضن
عرا الاسلام عروة عروة فكانما انتقضت عروة تشبث الناس بالتي تليها و
اولهن نقضا الحكم و آخرهن الصلاة (مسند احمد ج ۵- مرويات ابو امامه الباهلي)
ترجمہ: حضرت ابو امامہ الباہلی نے فرمایا: فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے: اسلام کے حلقے
میں سے ایک ایک حلقہ ٹوٹا جائے گا۔ تو جب ایک چیز ٹوٹے گی تو لوگ اس کی جگہ لینے والی
چیز سے وابستہ ہو جائیں گے چنانچہ سب سے پہلے ٹوٹنے والی چیز 'الحکم' ہوگی اور سب سے
آخری 'الصلاة'۔

۲- وعن عبدالله بن مسعود عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: تدور رحى
الاسلام لخمس و ثلاثين اوست و ثلاثين او سبع و ثلاثين فان يهلكوا
فسبيل من هالك وان يقيم لهم دينهم يقيم لهم سبعين عاماً: قلت: انما
بقي او مما مضى؟ قال: مما مضى. (رواه ابو داود)

ترجمہ: حضرت عبد اللہ ابن مسعود نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسلام کی چکی
پینتیس اور چھتیس اور سینتیس سال چلتی رہے گی۔ اور ہلاک ہو گئے تو یہ ہلاک ہونے والے
کا راستہ ہے۔ اور اگر یہ قائم رہے تو ان کا دین ستر سال ان کے لئے قائم رہے گا۔ میں نے
پوچھا: باقی سے یا گزرے ہوئے سالوں سے؟ فرمایا: گزرے ہوئے سالوں سے۔

۳- وعن أبي هريرة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم يتقارب الزمان و
يقبض العلم و تظهر الفتن و يلقي الشح و يكثر الهرج. قالوا: وما الهرج؟
قال: القتل. (متفق عليه)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا: فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے: زمانہ قریب ہو جائے گا۔
علم اٹھایا جائے گا۔ فتنے ظاہر ہوں گے۔ بخل ڈال دیا جائے گا۔ اور ہرج کی کثرت ہو
جائے گی۔ لوگوں نے پوچھا: ہرج کیا ہے؟ فرمایا: قتل۔

۴- وعن أبي هريرة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم هلكة امتي على
يدي غلظة من قريش. (رواه البخاري)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا: فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے: میری امت کی ہلاکت

قریش کے غلمہ کے ہاتھوں ہے۔

۵۔ وعن أبي هريرة ان النبي صلى الله عليه وسلم قال: ويل للعرب من شر قد

اقترب. افلح من كفيده. (رواه ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا: فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے: خرابی عرب کے لئے! اس شر سے جو قریب آ گیا۔ نجات پا گیا! جس نے اپنا ہاتھ روکا۔

لیکن حکمرانوں (Rulers) کے لئے امت مسلمہ کا اینی مل فارم (Animal Farm) میں رہنا جتنا لازمی، ضروری اور مطلوب تھا اسی قدر لازمی، ضروری اور مطلوب ایسے افراد کار کی فراہمی تھی جو باصلاحیت ہوں اور حکمرانی کے تقاضوں کی تکمیل میں ان کی معاونت کر سکیں۔

حکمران اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ اینی مل فارم (Animal Farm) میں رہنے والے مضحک (Degenerated) اور نیم انسان شدہ (Dehumanized) افراد حکمرانی میں ان کے مددگار اور معاون نہیں ہو سکتے ہیں۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ حکمرانی سے امت مسلمہ کو عملاً اور قوۃ دور رکھنے کی یہی صورت حکمرانوں کو مناسب اور حسب حال لگی۔ چنانچہ حکمرانوں نے حکمرانی کے تقاضوں کی تکمیل دو متبادل صورتوں یا ذرائع سے کرنے کا فیصلہ کر لیا:

۱۔ باطنی خارجی اخذ (Covert Outsourcing) اور

۲۔ ظاہری خارجی اخذ (Overt Outsourcing)

خارجی اخذوں (Outsourcings) کی ان دونوں شکلوں اور صورتوں کا آغاز 661 میں پوری شدت اور تغلب کے ساتھ شروع ہو گیا۔ جہاں تک خفیہ خارجی اخذ (Secret Outsourcing) کی بات ہے تو اس کا سلسلہ تو اس سے کئی سالوں قبل سے ہی جاری تھا۔

چنانچہ خلفائے بنی امیہ (661-750) نے نظام حکومت کے تمام اہم شعبوں میں یہودیوں اور معدودے چند شعبوں میں عیسائیوں سے خارجی اخذ (Outsourcing) کئے۔

جہاں تک خلفائے بنی عباسیہ کی بات ہے تو انھوں نے ساری حد پار کر دی اور نظام حکومت کے تقریباً تمام ہی بنیادی شعبے کلیۃً یہودی Outsourcing کے حوالے کر دیئے۔ وزارتِ تعلیم، وزارتِ قانون سازی، وزارتِ انصاف و عدل، وزارتِ مالیات، وزارتِ محصول، وزارتِ زراعت، وزارتِ تجارت، وزارتِ عالمی تجارت، وزارتِ دارالضرب، وزارتِ خارجہ، وزارتِ تربیت عمال، وزارتِ

صرف مال صد فی صد یہودی خارجی اخذ (Outsourcing) کے حوالے تھے۔ اسی تھوک خارجی اخذ (Wholesale Outsourcing) کا نتیجہ تھا کہ 780 عیسوی آتے آتے امت مسلمہ کی حیات کے ہر شعبے میں یہودیوں کی کلی اجارہ داری (Monopoly & Monopsony) قائم ہو چکی تھی۔

چونکہ یہ خارجی اخذ بیک وقت باطنی اور ظاہری دونوں تھا لہذا امت مسلمہ عملاً غلام ہو کر بدترین نظام استبداد کا شکار بن کر رہ گئی۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اس خارجی اخذ (Outsourcing) کی دو صورتیں رائج کی گئیں:

۱۔ باطنی خارجی اخذ (Covert Outsourcing)

۲۔ ظاہری خارجی اخذ (Overt Outsourcing)

ظاہری خارجی اخذ ہر چند کہ بے حد خطرناک تھا لیکن اس کی شاعت ظاہر اور خرابی قابل شناخت تھی۔ لیکن سب سے زیادہ خطرناک نتائج کی حامل اور امت مسلمہ کے لئے حد درجہ مہلک خارجی اخذ کی صورت وہ تھی جسے باطنی خارجی اخذ (Covert Outsourcing) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس خارجی اخذ (Outsourcing) نے آنے والے دنوں میں امت مسلمہ کو گھن کی طرح اندر اندر رکھا لیا اور دیمک کی طرح چاٹ لیا۔ یہی وہ خارجی اخذ ہے جس کے جدائل (Strands) کا پہچانا تاریخ میں بہت آسان نہیں۔ یہی وہ باطنی خارجی اخذ ہے جسے بدلتے زمانے میں تاریخ میں مختلف ناموں سے جانا جاتا ہے مثلاً موالی (Mawali)، مملوک (Mamluk)، غلام (Slave)، جان نثاری (Jannissari) وغیرہ۔ عہد بنی امیہ اور عہد بنی عباسیہ میں اس باطنی خارجی اخذ کو عموماً 'موالی' (Mawali) کہا جاتا تھا۔

ملاحظہ فرمائیں:

- (۱) أبو الفرج اصفہانی: کتاب الأغانی، طبع مصر
- (۲) البلاذری: فتوح البلدان، طبع مصر
- (۳) ابن عبد ربہ: العقد الفرید، طبع مصر
- (۴) ابن خلدون: مقدمہ ابن خلدون، دار القلم، بیروت
- (۵) الجاحظ: کتاب البیان والتبیین
- (۶) المسعودی: التنبیہ والاشراف
- (۷) قاضی ابو یوسف: کتاب الخراج، طبع مصر

- (۸) یحییٰ بن آدم: کتاب الخراج طبع لیڈن
(۹) الحاکم نیسابوری: معرفة علوم الحدیث: ذکر نوع الثالث و

الاربعین. طبع حیدرآباد

- (۱۰) السبعانی: کتاب الأنساب. طبع حیدرآباد

- (۱۱) السرخسی: شرح السیر الکبیر. طبع حیدرآباد

- David Ayalon: Outsiders in the Lands of Islam: Mamluks, Mongols, and Eunuchs (London: 1988). (۱۲)

- Fred.M. Donner: The Early Islamic Conquests: Princeton: Princeton University Press, 1981. (۱۳)

- Daniel, Pipes: Slave-Soldiers and Islam: The Genesis of a Military System: New Haven, Yale University Press, 1981. (۱۴)

- Norman A. Stillman: The Jews of Arab Lands: A History and Source Book, Philadelphia, 1979. (۱۵)

- Marion Woolfson: Prophets in Babylon: Jews in the Arab World, London & Boston, 1980. (۱۶)

- S.D. Goitein: Studies in Islamic History and Institutions, Leiden: Brill, 1966. (۱۷)

- E.I.J. Rosenthal: Judaism And Islam: London, NY, 1961. (۱۸)

- S.W. Baron: A Social and Religious History of the Jews; Vol-III-VIII, Philadelphia, 1957-58. (۱۹)

ان دونوں خارجی اخذوں کا نتیجہ امت مسلمہ کی حیویت (Vitality) اور معاشرت (Social Life) میں یہ برآمد ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے سو سال کے اندر اندر مسلمانوں کے سارے قوانین (Laws)، ضابطے (Rules)، ریگولیشنز (Regulations)، اسٹے چیوٹس (Statutes)، انتظامیہ کے سارے طریقے، عدلیہ کے سارے نامس (Norms)، فوج کی ساری ترجیحات (Priorities)، وزارت خارجہ اور وزارت داخلہ کی ساری پالیسیاں (Policies) اور سفارت کاری (Diplomacy) کے سارے پروٹوکولس (Protocols) قرآن اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عین مطابق مرتب ہونے کی بجائے مشنی (Mishna) اور تلمود (Talmud) کے

مطابق مرتب ہو کر قرآن اور سنت کے نام سے نافذ العمل ہو گئے۔ یہودی احادیث (Oral Laws) پر مبنی یہی وہ قوانین ہیں جنہیں آج دنیا 'اسلامی فقہ' (Islamic Fiqh) کے نام سے جانتی ہے۔

۴۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ 661 عیسوی میں مستحکم ہونے والا 'حکمرانوں' اور 'علماء' کا یہ معاہدہ یکساں مقاصد اور اہداف رکھتا تھا اس لئے اس خارجی اخذ (Outsourcing) نے جلد ہی بے حد خطرناک صورت، سرعت اور شدت اختیار کر لی۔ اس خارجی اخذ کے ذریعہ درآمد کئے گئے افراد نے جو اپنی جگہ بڑے بڑے جہا بڑہ اور عباقرہ تھے اور اپنے عہد کی ہارورڈ (Harvard)، ییل (Yale) اور کولمبیا (Columbia) جیسی یونیورسٹیوں سے منسلک تھے قرآن اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے مخصوص مقاصد کی تکمیل کے لئے ایسے خلاقانہ اصولیات اور قوانین (Innovative Principles & Laws) وضع کرنا شروع کر دیئے جو بالآخر امت مسلمہ کو ہلاکت سے دوچار کر دینے والے ثابت ہوئے۔

خود ساختہ اصولیات اور قوانین کے ایجاد سے قرآن اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے روئے ارض پر بسنے والے خلق خدا کو تقسیم کر دیا گیا۔ روئے ارض اور عالم انسانیت کو تقسیم کرنے کا یہ عمل اسلام اور امت مسلمہ کے مقصد بعثت کے خلاف کی گئی بدترین کارروائی اور سازش تھی۔ یہ بدترین سازش تھی:

۱۔ روئے ارض اور اس پر بسنے والی انسانی آبادی کو دارالاسلام اور دارالحرب میں منقسم کر دینا۔

یہ بات تصور میں بھی لائی نہیں جاسکتی کہ اللہ — رب العالمین، قرآن — ہدی للناس اور نبی آخر الزماں — رحمۃ للعالمین کسی ایسی تقسیم کی کیوں کراجازت دے سکتے ہیں۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ:

۱۔ جو اسلام: 'الدين عند الله الاسلام' (3:19) ہو

۲۔ جو رسول: 'رحمة للعالمین' (21:107) اور 'وما ارسلناك كافة للناس بشيراً و نذيراً' (34:28) ہو

۳۔ جو امت: 'اخرجت للناس' (3:110) اور 'شهداء على الناس' (2:143) ہو —

اور

۴۔ جو قرآن: 'يا ايها الناس' (2:121/4:1) جیسے الفاظ سے خطاب کرتا ہو — وہ ایسی تقسیم کی

کیوں کراجازت دے سکتے ہیں۔ ظاہر ہے اسلام کی روح اور مقصد وجود کو پھیل کر اور اس

کی علانیہ خلاف ورزی کر کے روئے ارض اور اس پر بسنے والی انسانی آبادی کو اس طرح تقسیم کر دیا گیا کہ انسانوں کے ان دونوں طبقوں کے مابین ہر سطح پر کلی مقاطعہ (Total Seperation) اور کلی عداوت (Total Enmity & Hostility) کی باضابطہ قانونی شکل قائم ہو گئی۔

صرف اتنا ہی نہیں کیا گیا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر روئے ارض پر ایک اور دارالحرب کا قیام کیا گیا جو از حد چونکا نے والا اور قرآن اور سنت رسول کی صریح خلاف ورزی ہی نہیں بلکہ اس کے خلاف اعلان جنگ تھا۔ یہ دارالحرب ’دارالاسلام‘ کے اندر قائم کیا گیا۔ گویا روئے ارض پر دو دارالحرب قائم کئے گئے ایک متحارب اور کلی مقطوع (Hostile & Totally Boycotted) اور دوسرا مامون اور کلی مربوط (Protected & Entirely Co-ordinated)۔

بے حد حیران کر دینے والی بات یہ ہے کہ پہلا دارالحرب ’حقیقی سرحدوں (Actual Borders) کے ساتھ قائم کیا گیا جب کہ دوسرا ’دارالحرب‘ تعبیری سرحدوں (Virtual Borders) کے ساتھ۔ ’دارالاسلام‘ میں قائم کلی مامون اور کلی مربوط (Exclusively Protected & Entirely Co-ordinated) ’دارالحرب‘ تھا آبادی کے ایک حصے کا ’ذمی تسلیم کر لیا جانا‘۔

اس ہمہ جہت (Across the Board) خارجی اخذ (Outsourcing) نے دو نتائج برآمد کئے:

۱۔ امت مسلمہ پر مسلط اور عارض طفیلیوں کا کلی تمکن قائم ہو جانا

(Unchallenged Total Domination of Parasites on the Ummah)

۲۔ امت مسلمہ کا کلی اضمحلال اور نیم انسان شدگی کا شکار ہو جانا

(Total Degeneration & Dehumanization of the Ummah)

۵۔ 661 عیسوی میں قائم ہونے والا حکمران۔ علما تعہد (Ruler-Ulama Nexus) اور اس

کے تحت قائم ہو جانے والی عمودی شہوت (Vertical Dichotomy) اور افقی ترادفیت

(Horizontal Dualism) نے امت مسلمہ کو دیکھتے دیکھتے لاش میں تبدیل کر کے رکھ دیا۔

اس انقلاب اور اس مفسدہ کے خلاف آوازیں اٹھیں۔ ظاہر ہے ایسی تمام آوازیں ’حکمرانوں‘ اور

’علما‘ کے لئے پیغام اجل لانے والی ہو سکتی تھیں لہذا جبر اور استبداد کا سہارا لیا گیا۔ ایسی تمام آوازوں اور

ان کے عواقب کو دبانے کے لئے سخت اور وحشتناک کارروائیاں کی گئیں۔ بالآخر انھیں بزور کچل کر یا تو

کلیہ ختم کر دیا گیا یا بے اثر اور محدود بنا کر حاشیہ نشیں (Marginalized) بننے پر مجبور کر دیا گیا۔ مسلم معاشرے میں اس مفسدہ کے خلاف اٹھنے والی مختلف آوازوں میں تین طبقات کی آوازیں قابل ذکر ہیں:

۱۔ صحابہ و تابعین: اس حکمراں۔ علما تعہد (Ruler-Ulama Nexus) کے خلاف بعض صحابہ اور ان کے بعد تابعین نے آواز اٹھائی چنانچہ مخالفت کرنے والے صحابہ کرام اور تابعین کو سختی سے کچل ڈالا گیا۔ (سنن نسائی۔ سنن ابوداؤد)

۲۔ اہل علم و دانش: اس کے خلاف معاشرے کے اہل علم و دانش نے بھی آواز اٹھائی۔ جن اہل علم و دانش نے اس حکمراں۔ علما تعہد کے خلاف آواز بلند کی انھیں ترہیب یا ترغیب اور بالآخر تعذیب کے ذریعہ حاشیہ نشیں (Marginalized) بنا کر بے اثر کر دیا گیا۔

۳۔ اہل تقویٰ اور اہل ورع: اہل تقویٰ اور اہل ورع نے عموماً 'تجنب' کا طریقہ اختیار کیا۔ بعد کی تاریخ میں امت مسلمہ میں اسی 'تجنب' کو تصوف کے 'گمراہ کن' نام سے پکارا جانے لگا۔ امت مسلمہ کے اہل تقویٰ اور اہل ورع کا یہ 'تجنب' بعینہ اسی طرح اور کم و بیش انھیں حالات میں ظاہر ہوا تھا جیسا 'نصرانیت' میں چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی میں 'صحرائی آبا' (Desert Fathers) کا ظہور ہوا تھا۔

حکمراں۔ علما تعہد (Ruler-Ulama Nexus) کے ذریعہ قائم کی جانے والی عمودی ثنویت (Vertical Dichotomy) اور افقی ترادفیت (Horizontal Dualism) بے حد طاقت ور تھیں چنانچہ مخالفت میں اٹھنے والے تمام طبقات یا تو اپنی روح کے اعتبار سے معدوم ہو کر آنے والے زمانوں میں 'انفرادی بروز' کی شکل میں ظاہر ہونے لگے یا پھر خود 'مقلوب' (Metamorphosed) ہو کر اسی تعہد (Nexus) کا حصہ بنتے چلے گئے۔ اس تعہد کے خلاف 'انفرادی بروز' کا سلسلہ مسلم معاشرے میں کبھی ختم نہیں ہوا اور ہنوز جاری ہے۔ حکمراں علما تعہد (Ruler-Ulama Nexus) کے خلاف آواز بلند کرنا 'جرم عظیم' قرار پایا۔ 661 عیسوی کے بعد عبداللہ بن مبارک (738-798) نے اس صورتحال کا یوں اظہار کیا ہے:

وَهَلْ أَفْسَدَ الدِّينَ إِلَّا الْمَلُوكُ
وَإِخْبَارُ سَوْءٍ وَرُهْبَانُهَا

جنہیں اس 'جرم عظیم' اور اس پر نازل ہونے والے عتاب کی تفصیلات جاننا ہو وہ

۱۔ اصفہانی (897:966) کی کتاب الأغانی

۲۔ حافظ (775:868) کی کتاب الحیوان

۳۔ غزالی (ف ۱۱۱۱) کی احیاء العلوم

۴۔ عمر خیام (ف ۱۱۲۳)، سعدی (ف ۱۲۹۲)، حافظ (ف ۱۳۹۱) کی غزلیں ملاحظہ کر لیں۔

حافظ نے فرمایا:

واعظاں کیس جلوہ بر محراب و منبری کنند چوں بہ خلوت می روند آں کار و دیگری کنند

مشکلی دارم زدانش مند محفل باز پرس تو بہ فرمایاں چرا خود تو بہ کتری کنند

گوئی باور نمی دارند روز داوری کیں ہمہ قلب و دغا در کار داوری کنند

مزید فرمایا:

دی دو پیتم چه خوش آمد که سحر می گفت بروز میکده بادف و فی ترسای

گر مسلمانی این است که حافظ دارد وای گر در پس امروز بود فردای

ماحول کے جبر کا یہ احساس جب ناقابل برداشت ہو جاتا ہے تو حافظ پکار اٹھتے ہیں:

چو در دست ست رودی خوش بزن مطرب سرودی خوش کہ دست افشاں غزل خوانیم و پاکو باں سر اندازیم

یکی از کفری لافد دگر طامات می باند بیایکس داوری ہارا بہ پیش داور اندازیم

اگر غم لشکر انگیزد کہ خون عاشقان ریزد من و ساقی بہم سازیم و بنیادش بر اندازیم

۶۔ طویل مدت (Long Term) میں امت مسلمہ کی طبع اور ذہن پر حکمراں۔ علما تعہد

(Ruler-Ulama Nexus) کے دو جانبہ اثرات مرتب ہوئے:

۱۔ جانب اول: حکمراں۔ علما تعہد دراصل امت مہوجہ (Ummah Oriented) تھا اس لئے

اس کے اصلی اہداف امت مسلمہ سے متعلق تھے۔ چنانچہ ان اہداف کے حصول میں یہ تعہد پوری طرح

کامیاب ہوا۔ امت مسلمہ صد فی صد مکثف (Conditioned) ہو کر مضحکل (Degenerated) اور

نیم انسان شدہ (Dehumanized) ہو گئی۔

جانب آخر: لیکن یہ بھی ایک تاریخی ستم ظریفی (Irony) ہے کہ ایسے کسی بھی اقدام کا جانب آخر

یعنی حکمراں۔ علما تعہد کے اصل عاملین (Factors) یعنی حکمرانوں اور علما پر بھی اثر پڑا۔ وہ طویل مدت

میں اس ثنویت اور ترادفیت کے اثرات سے اچھوتے نہیں رہ سکے۔

طویل مدت میں حکمراں اور علما بھی بالآخر امت مسلمہ کو محیط تکلیف (Conditioning) کے شکار ہو کر رہے۔ پہلے مرحلے میں حکمرانوں اور علما کی 'عمودی ثنویت' کے اندر موجود 'افقی ترادفیت' کے نچلے خانے کے افراد یعنی:

۱۔ حکمراں موجہ طبقے کا صد فی صد مکلف خانہ (Hundred Percent Conditioned Compartment of ROR) — پھر دوسرے مرحلے میں —

۲۔ علما موجہ طبقے کا صد فی صد مکلف خانہ (Hundred Percent Conditioned Compartment of UOR) اور — بالآخر تیسرے مرحلے — میں علما موجہ طبقے کا کھلا خانہ (Open / Unconditioned Compartment of UOR) اس تکلیف (Conditioning) کا شکار ہو کر رہے۔ مسلم تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ تینوں طبقات آٹھویں صدی عیسوی کے نصف اول میں باضابطہ اور بالا کثر مکلف (Conditioned) ہو چکے تھے۔ آٹھویں صدی عیسوی سے آج تک مسلسل یہ تکلیف (Conditioning) گہری اور سخت تر ہوتی جا رہی ہے۔

۲۔ 1250 عیسوی آتے آتے حکمرانوں کا اوپری طبقہ (Open / Unconditioned Compartment of ROR) صد فی صد مکلف (Conditioned) ہو چکا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تیرہویں صدی عیسوی کے آغاز میں ہی یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ یہ تکلیف (Conditioning) اب ہمہ گیر اور ناقابل شکست ہو چکی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اس 'تکلیف (Conditioning) کا انفرادی اور اجتماعی زندگی کے جملہ ابعاد (Dimensions) یعنی:

۱۔ کیفیاتی (Qualitative)

۲۔ تعبیری (Virtual)

۳۔ حقیقی (Actual) اور

۴۔ قوتی (Potential)

پر غلبہ تامہ ہو چکا تھا۔ ہر چند کہ امت مسلمہ میں حکمراں۔ علما تعہد قائم تھا اور اس اعتبار سے حکمرانوں اور علما کا معاشرے پر غلبہ بھی برقرار تھا لیکن فی الواقع کیفیاتی، تعبیری، حقیقی اور قوتی طور پر وہ امت مسلمہ کے بقیہ لوگوں کی طرح ہی مکلف ہو چکے تھے۔ ان کا وجود صرف ایک اعتبار سے قائم تھا یعنی

وجودی (Existentially) طور پر وہ 'موجود' تھے۔ یہ مسکورانہ صورتحال اٹھارہویں صدی عیسوی میں اچانک مغربیوں کے غلبے سے پاش پاش ہو گئی۔ امت میں اب تک صدیوں سے غالب چلے آ رہے — حکمرانوں کا 'وجود ختم' (Evaporate / Vanish) ہو گیا۔ ادھر حقیقی صورتحال یہ تھی کہ 1600 عیسوی میں امتِ مسلمہ کے چاروں خانے یعنی 'عمودی ثنویت' اور 'افقی تراڈفیت' کا Matrix صد فی صد ^{مفصل} (Degenerated) اور نیم انسان شدہ (Dehumanised) تھا۔

۳۔ تکلیف (Conditioning) ایک کیفیت ہے۔ اس کا احساس صرف انہیں ہوتا ہے جنہوں نے 'تکلیف' سے ماوراء فضا کا مشاہدہ یا تجربہ کیا ہو یا اس کا علمی و فکری ادراک کیا ہو۔ طویل عرصے تک تکلیف رہ کر امت نہ صرف ایسے کسی ادراک سے محروم ہو گئی تھی بلکہ اس کی قوتِ مددگار بھی اب ایسے ادراک کے قابل نہیں رہ گئی تھی۔ 661 سے 1700 تک دو ایسے اسباب رہے جنہوں نے مسلم معاشرے میں اس ادراک کے نہ ہونے کے ادراک کو بھی کامیابی سے روک رکھا۔ یہ دو اسباب درج ذیل ہیں:

۱۔ حکمرانوں کا قائم کردہ نظامِ خارجی اخذ (Outsourcing) حکمرانوں کے لئے اپنی ذمہ داریاں پوری شدہی سے ادا کر رہا تھا۔ ان عناصر کے لئے کوتاہی کرنے کی بظاہر کوئی وجہ نہ تھی۔ تفویض کردہ ذمہ داریوں کی ادائیگی کو ہر اعتبار سے آسان بنانے کے لئے حکمراں۔ علما تعہد نے اسے ناقابلِ تسخیر مامن (Impregnable Sanctuary) فراہم کر دیا تھا۔ یہ ناقابلِ تسخیر مامن تھا دارالاسلام کے اندر قائم کیا جانے والا 'Virtual' ذمیوں کا دارالکفر۔

یہ وہ 'دارالکفر' تھا جسے خود 'فقہا' نے 'دارالاسلام' کے اندر اپنے ہاتھوں سے قائم کیا تھا۔ چونکہ یہ 'دارالکفر' حقیقی (Actual) نہیں بلکہ تعبیری (Virtual) تھا اس لئے گویا اس کے حدود دارالاسلام کے برابر تھے۔ بالفاظ دیگر 'فقہا' نے دارالاسلام کو شرعاً دارالکفر میں تبدیل کر دیا تھا۔

۲۔ دوسرا سبب جیو پالیٹیکل (Geopolitical) تھا۔ گزشتہ چار ہزار سالوں سے نظامِ عالم ارض نہاد (Land-Based) تھا۔ اس ارض نہاد نظام کو 1700 عیسوی تک کسی حقیقی خطرہ (Actual Threat) کا سامنا نہیں ہوا تھا۔

یہی وہ دو اسباب تھے جن کے سبب امتِ مسلمہ تکلیف (Conditioning) کے ادراک کے نہ ہونے کے ادراک سے بھی غاری رہی۔

۱۷۰۰ سے بوجہ واضح طور پر ارض نہاد نظامِ عالم (Land-Based World) بدل کر رہ

گیا۔ یہی وہ گھڑی تھی جب مسلم حکمرانوں اور علما کو اپنے مکئیف (Conditioned) ہونے کا پہلا احساس ہوا۔ یہ پہلا جھٹکا (Shock) تھا۔ جب انہوں نے پلٹ کر دیکھا تو انہیں ایک اور ادراک کے نہ ہونے کا ادراک ہوا۔ انہیں پہلی بار احساس ہوا کہ اسلام دین اللہ جسے وہ اب تک اپنی اساس سمجھ رہے تھے اور جس کے حوالے سے اس مکئیف (Conditioning) کو مرغوب و مقبول بنا دیا گیا تھا اس کی حقیقی سمجھ کی قوت سے وہ محروم ہیں۔ یہ دوسرا جھٹکا ناقابل یقین تھا۔ پہلی بار 1700 عیسوی میں 'حکمرانوں' اور 'علما' کے انحصار الخواص کو ادراک ہوا کہ:

۱۔ وہ قرآنی تناظر علمی سے کلیتہً نابلد ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ —

۲۔ وہ انسانی تناظر علمی سے بھی کلیتہً نابلد ہیں۔

چنانچہ انہیں پہلی بار ادراک ہوا کہ ان دونوں 'تناظر علمی' سے کلی ناواقفیت نے انہیں صدیوں سے نام نہاد دارالاسلام کے خول میں مقید کر دیا تھا۔ اس 'کیفیاتی زندان' میں رہتے رہتے وہ فکری، علمی، معلوماتی، تجرباتی اور تقابلی علم اور صلاحیت سے ہر اعتبار سے کلی طور پر عاری ہو چکے ہیں۔ چنانچہ گزشتہ ایک ہزار سالوں میں در آنے والے روحانی، علمی اور اخلاقی انحطاط نے انہیں سیل بے پناہ کے حوالے کر دیا ہے۔ وہ اس 'خطہ انسانی' کی جوان کے 'فقہا' کے قائم کردہ دارالاسلام سے ماورا ہے — کچھ بھی واقفیت نہیں رکھتے۔ گزشتہ ایک ہزار سال سے دارالاسلام سے ماورا وہ 'خطہ انسانی' کن احوال سے گزرتا رہا ہے؟ وہاں فکری، علمی اور تجرباتی کیا کیا انقلابات آئے ہیں؟ اس خطہ انسانی نے ذہنی ارتقا کا کیسا سفر کیا ہے؟ ان کی موجودہ مساعی، مشاغل، حرکات اور تحریکات کیا ہیں؟ ان کی تحریکات اور ان کے تحریکات کے اہداف کیا ہیں؟ اس 'خطہ انسانی' میں افرادی، ادارہ جاتی، علمی اور نظریاتی کیسی استعداد پیدا ہو چکی ہے؟ وہاں اچھے اور برے افراد اور ان کی اجتماعیات کیا کیا عزائم رکھتے ہیں؟ — غرض وہ ان تمام باتوں سے پوری طرح ناواقف تھے۔

امت مسلمہ میں صدیوں سے غالب چلے آ رہے حکمران اور علما اس بات سے صد فی صد نابلد تھے کہ ان کے دارالاسلام سے باہر بقیہ 'خطہ انسانی' بالخصوص مغرب (West) میں کیا ہوتا رہا تھا۔ 1453، 1514، 1559، 1648 اور اس کے بعد (1715، 1788، 1814، 1846) کے انقلابات اور ان کے مضمرات نے کیا عواقب مرتب کئے ہیں جن سے عن قریب پوری دنیا بشمول ان کا دارالاسلام تہہ و بالا ہو جانے والی ہے۔۔۔ وہ ان تمام باتوں سے بالکل نابلد تھے۔ چنانچہ جب دارالاسلام سے ماورا وہ 'خطہ انسانی' متحرک ہوا اور اپنے اہداف کے حصول کے لئے اس نے اپنے افراد کار، علوم، مشاہدات، تجربات،

معلومات اور ان کے ادوات (Tools) اور Terminators کو برسر عمل (Activate) کیا تو مسلم حکمران اور علمائے ریت کی دیوار کی طرح ڈھ کر رہ گئے۔

۷۔ مسلم حکمرانوں اور علمائے انہدام کا بنیادی سبب یہ تھا کہ وہ:

۱۔ علم (Knowledge) سے عاری تھے۔

۲۔ معلومات (Information) سے عاری تھے۔

۳۔ افرادی قوت (Skilled Human Resource) سے عاری تھے۔

۴۔ علمی انضباط (Knowledge Discipline) سے عاری تھے۔

۵۔ علمی، تجرباتی اور تربیتی ادارہ (Institution) سے عاری تھے۔

۶۔ تجربہ (Experience) سے عاری تھے۔

۷۔ مہارت (Experties) سے عاری تھے۔

۸۔ استعداد (Preparedness) سے عاری تھے۔

۹۔ منصوبہ (Planning) سے عاری تھے۔

۱۰۔ ہدف (Target) سے عاری تھے۔

چنانچہ مسلم حکمران اور علمائے آنا فنا ڈھ کر رہ گئے۔

نئی صورت حال کے عارض ہو جانے کے بعد مسلم حکمرانوں اور علمائے یکساں رد عمل اور رویے کا اظہار کیا۔ یعنی کچھوے کی طرح سمٹ کر اپنے خول میں زیادہ مضبوطی سے بند ہو گئے۔ لیکن حوادث کا سیلاب بڑھتا جا رہا تھا۔ چنانچہ جلد ہی ان دونوں طبقات۔۔۔ 'حکمرانوں اور علمائے' کے مابین فرق واقع ہونے لگا اور پہلی بار یہ تعہد (Nexus) ٹوٹنے لگا۔ اس کے کچھ اسباب تھے۔ حکمرانوں اور علمائے کے 'قالب' میں فرق تھا۔ چنانچہ دونوں کے حجم (Girth) میں بھی فرق واقع ہوا۔ انیسویں صدی آتے آتے عالم اسلام کے 'عظیم حکمران' (Great Rulers) معدوم ہو چکے تھے۔ متوسط حکمران یعنی امرا (Aristocrates) اور عمال (Bureaucrates) اب حکمرانوں کی جگہ لے چکے تھے۔ ان حکمرانوں کا حجم (Girth) نہایت کم تھا۔ اس کے برخلاف 'علمائے' کا حجم (Girth) عوام سے مربوط ہونے کے سبب بڑا تھا۔

حجم (Girth) کے فرق نے دونوں کو بالآخر جدا کر دیا۔ جس طرح ساتویں صدی عیسوی کے اواخر

میں ان دونوں طبقوں کے درمیان قائم ہونے والا 'تعہد' سر تا سر خود غرضانہ تھا اسی طرح اٹھارویں صدی

عیسوی میں ان میں جدائی بھی سر تا سر خود غرضانہ تھی۔ مسلم حکمران طبقے نے چھوٹے حجم کے سبب عوام سے بالکل یہ انقطاع کر کے نئے حکمرانوں کے زیر سایہ پناہ لینے میں عافیت سمجھی۔

مسلم حکمرانوں کی نئے حکمرانوں کے زیر سایہ پناہ لینے کی یہ صورت حال معاصرانہ تھی نہ مفاہمانہ اور نہ ہمسرانہ۔ یہ پر عزم بھی نہیں تھی۔ یہ ایک سوچا سمجھا اور اپنے حالات پر غور کر کے پورے شعور کے ساتھ لیا گیا فیصلہ تھا۔ ایسا کہنا زیادہ درست ہوگا کہ یہ فیصلہ عین ان کی نفسیات اور ان کے تحت شعور کے مطابق تھا۔ وہ اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ تھے کہ اب صرف غلامانہ، کاسہ لیسانہ، زلہ ربا یا نہ اور اُلش نصیبانہ رویہ ہی ان کے اہداف پورے کروا سکتا ہے۔ صدیوں کی تکلیف (Conditioning) نے نہ صرف ان کے اعضا اور جوارح کو مفلوج اور معطل کر دیا تھا بلکہ ان کی نفسیات بھی مکثیف (Conditioned) ہو چکی تھی۔ انہیں اپنی ذمہ داریاں بالخصوص تاریخی اور منصبی ذمہ داریاں ادا کرنی چاہیے تھی۔ اگر تکلیف (Conditioning) نے ان کی طبع کو معطل و مفلوج نہ کر دیا ہوتا تو انہیں اپنی ان ذمہ داریوں کا ادراک ہو جاتا۔ ان کی اولین ذمہ داری تھی کہ 1600 عیسوی کے بعد بالعموم اور 1707 کے بعد بالخصوص اور بدرجہ آخر 1803 کے بعد نئے افکار کے منابع اور نئے افکار سے مزوڈ قوتوں کے مراکز ثقل رقت (Power Centres) میں اپنی موجودگی کو یقینی اور موثر بناتے۔ ظاہر ہے ایسی موجودگی درج ذیل اہداف رکھتی:

۱۔ نمودار ہونے والی فکر اور قوت کے ذخیرہ علم و معلومات تک رسائی کے لئے موجودگی۔

(Presence for the outreach to the knowledge of the Emerging Ideas and Forces)

۲۔ نمودار ہونے والی فکر اور قوت کے معاشرے کے Core تک رسائی کے لئے موجودگی۔

(Presence for the outreach to the Core of the Society of the Emerging Ideas and Forces)

۳۔ نمودار ہونے والی فکر اور قوت کے علوم، ادارہ جات اور ادوات کو Outpace یا Overtake کرنے

کے لئے رسائی۔

(Outreach for outpacing / overtaking the knowledge, Institutions and Tools of the Emerging Ideas & Forces)

۴۔ حاصل ہونے والے علوم، معلومات، تجربات، تاثرات اور مضمرات کو مخزون کرنے کے لئے

Vernaculars میں در آمد۔

(Import of the acquired knowledge, Informations, Experiences, Impressions and Implications to be deposited in the Vernacular Medium)

۵۔ نمودار ہونے والی فکر اور قوت کو Outsource کرنا۔

(To outsource the Emerging Ideas & Forces)

Outsourcing ایک دو دھاری تلوار ہے۔ بیدار قوم کے لئے استحکام کا بہترین ذریعہ اور غافل

یانا اہل کے لئے خود کشی۔

ان مسلم حکمرانوں کے پاس ایسے وسائل تھے کہ وہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں اپنے اعزہ کو روم (Rome)، وینس (Venice)، ملان (Milan)، آکسفرڈ (Oxford)، کیمبرج (Cambridge)، ایڈنبرا (Edinburg)، شوہون، پیرس (Sorbonne Paris)، اسٹراس برگ (Strasbourg)، برلن (Berlin)، لاپزش (Leipzig)، گوتینگن (Gottingen)، ٹوبن جن (Tubingen)، گیٹے برگ (Goteborg)، اپسلہ (Uppsala)، زائرش (Zurich)، لوزاں (Lausanne)، باسل (Basel)، بوخارست (Bucharest)، وینا (Vienna)، پراگ (Prague)، مانسٹر (Münster)، ہم برگ (Hamburg)، اترخت (Utrecht)، ایمسٹرڈم (Amsterdam) اور لاکدن (Leiden) بھیج کر اعلیٰ افرادی قوت (High Grade Human Resource) پیدا کروا سکتے تھے۔ عاجز کے علم کی حد تک نئے حکمران بھی اس میں قطعاً مزاحم نہیں تھے۔ اور اگر ہوتے تو کامیاب نہیں ہوتے۔ یہ بات بظاہر ان کے حق میں جارہی تھی لیکن انھوں نے ایسے افراد کار (Work Force) پیدا کرنے کی باضابطہ اور منصوبہ بند کوئی جدوجہد نہیں کی۔

دوسری جانب مسلم علما نے دوسری ترکیب اختیار کی۔ انہوں نے خود کو اور عوام الناس کی جتنی بڑی تعداد کو وہ متاثر کر سکتے تھے انھیں اس کی ترغیب دی کے ماحول سے کلی انقطاع کرتے ہوئے مزید تنگ خول میں سمٹ جایا جائے۔

۸۔ مسلم حکمران اور علما اپنی مذکورہ خصوصیات کی بنا پر ادراک کے باوجود تین عارضوں میں مبتلا ہو کر

رہ گئے۔ یہ تینوں عارضے دراصل عارضہ سے زیادہ ان کی 'طبع' کے عکاس یا ان کا رد عمل تھے۔

۱۔ وہ 'بصیرت' سے خالی (Visionless) تھے۔

۲۔ وہ 'خلاقت' سے خالی (Uninnovative / Innovation Less) تھے۔

۳۔ وہ 'پہل' سے خالی (Initiativeless) تھے۔

دونوں کی 'طبع' دفاعی (Defensive)، رجعی (Regressive) اور خود غرضانہ (Selfish)

تھی۔ ایسی طبع فرد اور اس پر مشتمل اجتماعیت کو بے بصیرت، غیر خلاق اور بے اقدام بنا کر رکھ دیتی ہے۔

نامردی و مردی قدمی فاصلہ دارد

چنانچہ احوال واقعی کے فرق نے دونوں طبقات کو یکساں 'طبع' کے باوجود دو الگ الگ صورتوں میں

اپنے مفادات کے حصول کی راہ دکھلائی۔ حکمرانوں نے نئے حکمرانوں کے سائے میں پناہ لے لی اور 'علما' عوام کے مابین 'قلعہ بند' ہو گئے۔

۹۔ 661 عیسوی سے قائم تکلیف (Conditioning) امت میں اس قدر راسخ ہو چکی تھی کہ مسلم

تاریخ میں بعض مسلم حکمرانوں نے اگر خیر خواہانہ، اضطراراً یا ضرورتاً بھی اس خارجی اخذ

(Outsourcing) کا خاتمہ کرنا یا اسے محدود (Limited) یا محدود (Restricted) کرنا چاہا تو وہ

اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ خارجی اخذ (Outsourcing) کے انسداد میں ان قوتوں کا غلبہ تامہ

اور اکثر خود امت مسلمہ کی عدم صلاحیت و استعداد جو اس تکلیف کا لازمی نتیجہ تھیں مانع آئے۔ مسلم تاریخ

میں ایسی جسارت کرنے والے حکمرانوں کو معطل یا معزول کر دیا گیا یا ہلاک۔ بعض اوقات انھیں اس کی

بڑی بھاری قیمت چکانی پڑی۔ اس حوالے سے عہد قریب میں سلطنت مغلیہ میں اکبر سرفہرست ہے۔

جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب کی مختلف وزارتوں حتیٰ کہ ضلعی سطح تک جاری خارجی اخذ

(Outsourcing) کے حوالے سے Innovations, Deviations, Machinations,

Manipulations, اور Initiatives اور اس کے مضمرات و عواقب اس بات کے غماز ہیں کہ مسلم

معاشرہ صدیوں کے حکمرانوں نے۔ علما تہجد کے ذریعہ کس درجہ مضحک (Degenerated) اور نیم انسان شدہ

(Dehumanized) بنا کر رکھ دیا گیا تھا۔ یہ صورتحال کس درجہ راسخ تھی کہ ایسے ایسے عظیم اور اولوالعزم

دور بین اور بیدار مغز حکمرانوں میں بھی اتنی قوت نہ تھی کہ وہ مسلم معاشرے میں فوری اور یکسر تبدیلی لاسکیں۔

صحیح نخت

۱۔ امت مسلمہ پر طاری 'ممنویت' اور 'ٹراڈفٹ' کی وہ 'ظاہرات' جو 1700 عیسوی سے قائم ہیں 'معاصر سبب' کہلاتی ہیں۔ اس سبب کے عامل حقیقی (Actual Factor) 'علما' ہیں۔ یہ وہ دور ہے جب جنوبی ایشیا میں سلطنت مغلیہ کے 'عظیم حکمران' ختم (Vanish) ہو چکے تھے۔ متوسط اور چھوٹے امرا (Aristocrates) اور عمال (Bureaucrates) ہی اب اس عامل کے نمائندہ بنے تھے۔ حکمرانوں کے ان مابقیہ نمائندوں کا عوام سے کوئی حقیقی ربط نہیں رہ گیا تھا۔ عوامی ربط کے عنوان سے جو بھی ربط تھا وہ یک طرفہ (One-Sided) اور حاکمانہ (Arbitrary) تھا۔ یوں بھی امت مسلمہ میں (سلطنت مغلیہ کے عظیم حکمرانوں کو چھوڑ کر) حکمرانوں کی کوئی فکری، علمی، تجرباتی، تربیتی اور ادارہ جاتی وراثت نہیں تھی۔ صدیوں پہلے وہ اس کے نصف حصے سے خارجی عناصر کو Outsourced کر کے دست بردار ہو گئے تھے اور بقیہ حصے سے علما کو اجارہ داری (Monopoly) عطا کر کے دست بردار ہو گئے۔ لے دے کر باقی رہ جانے والے متوسط اور چھوٹے حکمرانوں کی ساری وراثت ان کی منقولہ اور غیر منقولہ جائدادیں اور دولت تھی جن کی حفاظت کے حوالے سے انھیں عوام سے مربوط ہونے یا رہنے کی اب (اٹھارہویں صدی میں) چنداں ضرورت نہ تھی۔ لیکن اس سے زیادہ اہم بات خود ان کی 'طبع' تھی۔ وہ صدیوں سے جاوے جا طور پر عوام سے اس طرح غیر مربوط رہتے آئے تھے کہ ان کی 'طبع' ایسے کسی ربط کا ابا کرنے والی بن کر رہ گئی

تھی۔ نبی امی (The Prophet of the Masses) کی امت جو امتِ وسط (The Regulator of The Mankind) اور شہداءِ علی الناس (The Witnesses on the Mankind) کی ذمہ داریوں کے ساتھ برپا کی گئی تھی تاکہ انسانوں کو ہر طرح کی غلامی (Salavery)، افلاس (Poverty)، محرومی (Deprivation) اور استحصال (Exploitation) سے آزاد کرائے اور روئے ارض پر عدل، محرومی (Justice) کے قیام کو یقینی بنائے اس کے حکمراں زمین پر ظلم (Injustice) کے دو ستونوں میں سے ایک ستون بن کر رہ گئے تھے۔ جس امت کا مقصد وجود (Raison d'etre) تھا: فک رقبتہ۔ او اطعم فی یوم ذی مسغبۃ۔ یتیمًا ذامقربۃ۔ او مسکینًا ذامتربۃ۔ ثم کان من الذین آمنوا و تواصوا بالمرحۃ۔ (90:13-17)

وہ امت خود حکمراں۔ علما تعہد کے ذریعہ صد فی صد مکلف بن کر رہ گئی تھی۔ ایسی حالت میں حکمرانوں کے ان مابقیہ کو عوام سے مربوط ہونے یا رہنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اب ان کے مفادات کی حفاظت صرف اور صرف معاصر حکمرانوں سے وابستہ ہو کر اور انہیں کی رضا سے ہو سکتی تھی۔

۲۔ 1600 عیسوی سے عصر حاضر تک کی مدت کو اس حوالے سے دو حصوں میں منقسم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ 1600-1765

۲۔ 1765-1858

زمانے کے یہ دو فیصلہ کن مرحلے درحقیقت دو قطعے (Segments) ہیں۔ ان دونوں عرصوں کے دوران 'علمائے' نے جن کی 'نظامِ تعلیم' پر مکمل اجارہ داری (Total Monopoly) صدیوں سے قائم تھی۔ ایک ایسے رویے (Behaviour) کا اظہار کیا جو بلاشبہ انسانیت کے خلاف 'جرمِ عظیم' (Great Crime Against Humanity) کہلانے کا مستحق ہے۔ اس 'جرمِ عظیم' کا عنوان ہے:

"احوال و ظروف کے بدلتے منظر نامے میں امتِ مسلمہ کو منجمد رکھنا۔"

'منجمد رکھنے' کا جرم 'چار مظالم' کے ارتکاب سے عبارت ہے۔ یہ چار جرائم دراصل مظالم کا ایک مجمع

(Matrix) ہے۔

- ۱۔ امتِ مسلمہ کو گم گشتہ قرآنی تناظرِ علمی فراہم کرنا اور نہ ہی فراہم کر دینے کی کسی کو اجازت دینا۔
- ۲۔ امتِ مسلمہ کو گم گشتہ انسانی تناظرِ علمی فراہم کرنا اور نہ ہی فراہم کر دینے کی کسی کو اجازت دینا۔
- ۳۔ امتِ مسلمہ کو گم گشتہ ارتقائی اسلامی تعلیمی نظام فراہم کرنا اور نہ ہی فراہم کر دینے کی کسی کو

اجازت دینا۔

۴۔ امت مسلمہ کو گم گشتہ تحقیقی اور تعبیری نصاب فراہم کرنا اور نہ ہی فراہم کر دینے کی کسی کو

اجازت دینا۔

”احوال و ظروف کے بدلتے منظر نامے میں امت مسلمہ کو منجمد رکھنے“ کا ’جرمِ عظیم‘ ’علما‘ نے دو

مرحلوں میں انجام دیا:

۱۔ مرحلہ اول: 1600-1765

۲۔ مرحلہ دوم: 1765-1858

پہلا مرحلہ اس عہد سے تعلق رکھتا ہے جب عالمی سطح پر Great Tectonic Power Shift واقع ہو رہا تھا اور نظامِ عالم (World Order) ’ارضِ نہاد‘ (Land-Based) رہنے کی بجائے ’بحرِ نہاد‘ (Ocean-Based) ہونے لگا تھا جس کے اثرات، مضمرات اور عواقب پوری دنیا بشمول ہندوستان پر مرتب ہوتے جا رہے تھے۔ جب کہ دوسرا مرحلہ اس عہد سے تعلق رکھتا ہے جب عالمی سطح پر Great Tectonic Power Shift نے حتمی اور حقیقی شکل لے لی تھی اور ہندوستان میں مغلیہ حکمرانوں کو مجبور ہو کر کارہای حکمرانی ان ’بحرِ نہاد‘ (Ocean-Based) قوتوں کو عملاً Outsourced کر دینی پڑی۔ مذکورہ ہر دو عہد میں ’علما‘ نے اپنے مکئیف تعلیمی، مذہبی اور معاشرتی نظام کو صد فی صد مکئیف (Hundred Percent Conditioned) رکھنے پر اپنا سارا زور صرف کر دیا۔ ماحول میں طوفانی رفتار سے واقع ہونے والی تبدیلیوں کے باوجود وہ بالکل پتھر بن گئے اور اپنے زیر اثر پورے مسلم معاشرے کو ان تبدیلیوں کے سامنے عملاً آنکھ موند لینے اور پتھر بن جانے کی ترغیب، تحریص اور ترہیب دی۔ عالم واقعہ میں پے در پے تبدیلیاں ہو رہی تھیں لیکن یہ ”زمین جنبہ نہ جنبہ گل محمد“ کے مصداق بن گئے۔ یہ ’علما‘ حقائق سے منہ موڑ رہے تھے ایسا نہیں تھا۔ انہیں حقائق کا علم تھا۔ ’علما‘ حقائق سے بے خبر کیسے ہو سکتے تھے؟ یہ کھلی آنکھوں سے ان تبدیلیوں کو دیکھ اور سمجھ رہے تھے۔ ’علما‘ کے ’روئے‘ کی اصلی حقیقت تب واضح ہوئی جب انہوں نے اعلانِ پتھر بن جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ’علما‘ دراصل ’سنت اللہ‘ کے خلاف اعلانِ جنگ کر چکے تھے۔ وہ ’سنت اللہ‘ کے اس اصول کو قبول کرنے کے لئے قطعاً تیار نہیں تھے جس میں کہا گیا تھا:

وتلك الايام ندا ولها بين الناس (آل عمران ۱۴۰)

ترجمہ: اور یہ دن باری باری بدلتے رہتے ہیں ہم ان کو لوگوں میں۔

’علماء اللہ کے خلاف سینہ سپر ہو گئے۔‘ سنت اللہ کے تحت لائی جانے والی ہر تبدیلی کو عالم واقعہ میں ہونے والی تبدیلی ماننے اور اس کی روشنی میں اپنا احتساب کرنے سے انھوں نے صاف صاف انکار کر دیا۔ بلاشبہ اس ’جرمِ عظیم‘ اور اس کے تحت روار کھے جانے والے ’چار مظالم‘ کے ارتکاب کی جز تھی وہ روایتی اور موروثی ذہنیت جو 661 عیسوی سے امت پر عارض تھی جس کے تحت امت ’عمودی ثنویت‘ اور ’افتی ترادفیت‘ کا شکار چلی آئی تھی۔

۳۔ کوئی قوم کسی نظامِ جبر کے سائے میں، صد فی صد مکیف حالت میں صدیاں گزار کر بھی وجود کے اعتبار سے خالص اور بے آمیز زندہ رہ سکتی ہے، خواہ ایسی صورت میں اس کی تمدنی حیات اور اس میں پائے جانے والے معاشرتی ادارے صفحہ ہستی سے مٹ کر ہی کیوں نہ رہ جائیں لیکن کوئی قوم ’ذہنی ثنویت‘ اور ’معاشرتی ترادفیت‘ کے ساتھ غیر مکیف حالت میں اپنے تشخص کو مجروح یا متاثر کئے بغیر چوتھائی صدی بھی گزار لے ممکن نہیں۔

1765 عیسوی سے برصغیر میں واقع ہونے والی تبدیلیاں ’احوال و ظروف‘ کی حقیقی تبدیلیاں تھیں۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا منظر نامہ عالم تصور میں اور صورتِ متخیلہ میں متبدل نہیں تھا بلکہ برسر زمین اور علی رؤس الأشہاد متبدل تھا۔ اب تک مسلمانوں کے فکری، علمی، تجرباتی اور معلوماتی ماخذ (Source Materials)، ان کا تعلیمی و تربیتی نظام، اس کے تمام متعلقہ ادارے، ان اداروں میں رائج فکری، علمی، تدریسی، تعلیمی اور تدریسی نصاب، طریقہ تعلیم اور ان کی اخلاقیات اور ان کے اہداف صد فی صد اور بغیر کسی ادنیٰ مداخلت کے مکمل طور پر ’علماء‘ کے ہاتھوں میں تھے۔

یہی ’تعلیمی نظام‘ اب تک معاشرے کی جملہ ضرورتوں، تقاضوں اور مطالبات کو پورا کرتا تھا۔ یہی ’تعلیمی نظام‘ مسلم معاشرے کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے اہداف اور رخ متعین کرتا تھا۔ یہی ’تعلیمی نظام‘ مسلم معاشرے کی جملہ ضرورتوں، تقاضوں اور مطالبات کی تکمیل کرنے والے افراد اور طبقات کے مطمح نظر (Vision) کو متعین، موجد اور مقدر کرتا تھا۔

چنانچہ ’متبدل احوال و ظروف‘ اور ان کی حقیقت اور ناقابلِ صرف نظر ضرورتوں، تقاضوں اور مطالبات کی فراہمی کی اولین اور مکمل ذمہ داری اسی ’تعلیمی نظام‘ اور اس کے ذمہ داران کی تھی۔ یہ ذمہ داری ’علماء اور ان کے کلی Monopolized‘ ’تعلیمی نظام‘ کی تھی کہ وہ معاشرے کے متبدل احوال و ظروف کی

ضرورتوں، تقاضوں اور مطالبات کی تکمیل کی استعداد رکھنے والی افرادی قوت (Workforce) فراہم کرتے۔ یہ ذمہ داری 'علما' کی تھی کہ وہ برسر زمین واقع ہونے والے احوال و ظروف کا ادراک کرنے اور ان کی حقیقی اور برسر زمین ضرورتوں کی تکمیل کرنے کے لئے افرادی قوت (خصوصی، متوسط اور عمومی) کی فراہمی کرتے۔ وہ اخلاقی طور پر اپنی ان ذمہ داریوں سے پہلو تہی نہیں کر سکتے تھے۔ 661 عیسوی سے حکمراں۔ علما تعہد کے نتیجے میں 'تعلیمی نظام' کی اجارہ داری (Monopoly) ان کے ہاتھوں میں آگئی تھی جسے حکمرانوں نے اپنے خصوصی مفادات کے پیش نظر سند جواز عطا کیا تھا۔ اگر برسر زمین 'احوال و ظروف' بدل گئے تھے اور نئی ضرورتیں، نئے تقاضے اور نئے مطالبات سامنے آگئے تھے جب بھی یہ ذمہ داری سرتا سر 'علما' اور ان کے 'تعلیمی نظام' کی تھی کہ وہ نئے احوال اور ان کے مطالبات کو Accomodate کرتے۔ اگر اس Accomodation کے دوران وہ محسوس کرتے کہ بڑی تبدیلیوں یا انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہے تو اپنے علمی افق (Intellectual Horizon)، تعلیمی نظام اور تعلیمی، تدریسی اور تدریسی اداروں کے نصاب اور طریقہ تعلیم میں ضروری (Required)، کافی (Adequate) اور خلاقانہ (Innovative) تبدیلیاں کرتے۔

۴۔ 1765 میں بالخصوص انگریزوں (ایسٹ انڈیا کمپنی) کے کاندھوں پر بنگالہ جیسے وسیع و عریض صوبے کے نظم و نسق کی برسر زمین حقیقی اور دشوار ذمہ داریاں آن پڑی تھیں۔ مغربی بالخصوص برطانوی تاریخ کا عمیق مطالعہ رکھنے والے کسی بھی فرد کے لئے یہ بات ناقابل فہم ہے کہ اتنی 'عظیم اور دشوار ذمہ داری' سلطنت مغلیہ نے انھیں کیسے دے دی؟ اور اس سے بھی زیادہ ناقابل فہم یہ بات ہے کہ سب کچھ جانتے ہوئے ایسٹ انڈیا کمپنی نے اتنی 'عظیم اور دشوار ذمہ داری' اپنے کاندھوں پر کیسے لے لی؟ لیکن ان دونوں باتوں سے بھی زیادہ ناقابل فہم بات یہ ہے کہ سلطنت برطانیہ نے اپنے چارٹر (Charter) کی اتنی بڑی خلاف ورزی کیسے نظر انداز کر دی؟ کیا ایسٹ انڈیا کمپنی کے بعض ذمہ داروں نے انھیں لاعلم اور دھوکے میں رکھا۔ ان تمام ناقابل فہم باتوں کی اساس یہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی یا اس عہد کی کوئی بھی یورپی قوت خواہ وہ فرانسیسی ہوں، ڈچ ہوں یا پر تغالی اس کی استعداد رکھتے ہی نہیں تھے کہ وہ اتنا بڑا انتظام سنبھال لیں۔ سلطنت مغلیہ کے پاس جتنے انتظامی Constraints تھے ان سے گنی گنا زیادہ Constraints سے خود ان ملکوں کو سامنا تھا۔ رہی ایسٹ انڈیا کمپنی تو وہ سلطنت بھی کب تھی؟ ایسا لگتا ہے کہ مسلمانوں کا صد فیصد مکیف معاشرہ (Hundred Percent Conditioned Society)

مکمل لاعلمی میں کام کر رہا تھا۔ یا پھر 'علما' کے ہاتھوں میں Monopolized 'نظامِ تعلیم' نئے احوال میں سلطنتِ مغلیہ کی ضرورتوں کی تکمیل کرنے سے بالکل قاصر ہو چکا تھا۔ سلطنتِ مغلیہ کے بادشاہان ذہن رساتھے۔ بلند فکری اور آفاقی وسعتِ نظری میں انسانی تاریخ میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ اس کے عظیم المرتبت حکمرانوں کی بات جانے دیجئے ان کا سب سے کمزور اور بے بس بادشاہ بھی اپنی بلند فکری میں اپنا نظیر نہیں رکھتا تھا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی عظیم الشان سلطنت کیوں کرتباہ ہو گئی؟ اس سوال کا صرف ایک ہی جواب ہے۔ سلطنتِ مغلیہ کو 'علما' نے تباہ کر دیا۔ سوال کیا جاسکتا ہے کہ آخر 'علما' نے سلطنتِ مغلیہ کو کیسے تباہ کر دیا؟ اس کا جواب ہے: 'علما' کی نظر میں سلطنتِ مغلیہ نے تین ناقابلِ معافی جرم کئے تھے۔ یہ تین جرائم تھے:

۱۔ امت کو صدیوں کی تکلیف (Conditioning) سے نجات دلوانے کی کوشش کرنا۔

۲۔ امتِ مسلمہ کی امتِ وسط کی حیثیت کو بحال کرنے کی کوشش کرنا۔

۳۔ امتِ وسط اور شہداءِ علی الناس کی بحالی کے ذریعہ بنی نوعِ آدم کے لئے غلامی سے

نجات کی راہ ہموار کرنا۔

۵۔ بادشاہانِ مغلیہ تاریخ میں سکندر اعظم کے بعد وہ پہلے مثالی حکمران تھے جنہوں نے نظامِ حکومت

کی چھوٹی سے چھوٹی معاملات کو شفاف (Transparent) اور جوابدہ (Accountable) بنانا چاہا۔

اس لئے سلطنتِ مغلیہ دنیا کی تاریخ میں پہلی عظیم الشان ایسی حکومت ہے جسے حقیقی معنوں میں 'مضبوط

نظامِ حکومت' (Government of Records) کہلانے کا استحقاق حاصل ہے۔ سلطنتِ مغلیہ ملک

میں ایسا ہی شفاف اور جوابدہ نظام نافذ کرنا چاہتی تھی۔ ایسے نظام کے لئے حکومت کو ہر شعبے میں انتہائی

لائق و فائق اہل کار درکار ہوتے۔ یہی وہ مطالبہ تھا جس کے سامنے 'علما' پہاڑ کی طرح مزاحم ہو گئے۔ اس

مطالبے کی تکمیل مسلم معاشرے کو تکلیف (Conditioning) کی قید سے آزادی کے بغیر ممکن نہیں

ہوتی۔ 'علما' اس کے لئے قطعاً تیار نہ تھے۔ وہ ایسے اہل کار تیار کرنے کے لئے نظامِ تعلیم میں ذرہ برابر بھی

تبدیلی کرنے کو تیار نہ ہوئے۔

۶۔ سلطنتِ مغلیہ کا ہندوستان میں قیام ایک معجزہ تھا۔ یہ ربانی مداخلت تھی۔ انسانوں کو ہر طرح کے

'ظلم اور غلامی' سے آزادی دلانے کی یہ ایک عظیم پیش رفت تھی۔ ایسی منضبط سلطنت پہلی بار وجود میں آئی

تھی۔ سلطنتِ مغلیہ کا خاتمہ بھی حیرتناک اور انسانی فلاح (Human Welfare) کے حوالے سے

حادثہ عظیم (Great Disaster) تھا۔

۷۔ ہندوستان میں جب سے مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی اسے ہر چہار طرف سے گونا گوں خطرات (Dangers) اور تحدیات (Threats) کا سامنا رہا۔ لیکن تاریخ کا تجزیہ بتاتا ہے کہ سلطنت کو سب سے بڑا خطرہ ہمیشہ 'علما' اور 'مشائخ' سے رہا۔ یہ عنوان اب بھی از حد گہرائی سے غیر جانبدارانہ تحقیق کا تقاضا کرتا ہے۔ تاریخ کا یہ ایک حیرتناک معما (Paradox) ہے: 'علما' اور 'مشائخ' ہر باشعور مسلم حکومت کو تباہ کر دینے کے درپے کیوں رہے؟ ہر باشعور حکومت سے ان کی کشمکش کیوں واقع ہوئی؟ اس پیٹرن کا قصص چند باتوں کو نمایاں کرتا ہے:

۱۔ حکومت اور 'علما' اور 'مشائخ' ہمیشہ ایک دوسرے کے دشمن رہے۔

۲۔ حکومت اور 'علما' اور 'مشائخ' کے درمیان گونا گوں نوعیتوں کی کشمکش برابر جاری رہی۔

۳۔ حکومت اور 'علما' اور 'مشائخ' کے مابین تعلق ہمیشہ تناسبی (Proportionate) رہا۔ حکومت

مضبوط ہوئی تو 'علما' اور 'مشائخ' سے تصادم میں شدت آگئی۔ حکومت کمزور ہو گئی تو 'علما' اور 'مشائخ' سے تصادم میں کمی آگئی۔ کمزور ترین ادوار میں 'علما' اور 'مشائخ' بہت مضبوط اور با اثر ہو گئے۔ کمزور ترین ادوار میں

مساجد، مدارس اور خانقاہوں میں بے حد اضافہ ہو گیا۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی (تاریخ مشائخ چشت، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات وغیرہ) کا تجزیہ تاریخی اصولوں کے برخلاف ہے۔ ان کی تحقیق کی پہلی اینٹ ہی غیر جانبدارانہ اور محققانہ نہیں۔ فرانسس روبنسن (Francis Robinson) نے پہلی بار اس جانب

تحقیق کی جس کے تتبع میں گیل منالٹ (Gail Minault) اور باربرا منکاف (B.D. Metcalf) نے تحقیق جاری رکھی۔ عاجز کو امید قوی ہے کہ آندرے ونک (Andre Wink) کی الہند کی تیسری جلد اگر آئی تو اس میں کچھ مزید پیش رفت ہوگی۔ تاہم عاجز کو اندیشہ ہے کہ مغربی محققین اس عنوان پر تحقیق کا بوجہ حق ادا نہ کر سکیں۔

سلطنت مغلیہ کو اپنے قیام کے پہلے دن سے 'علما' اور 'مشائخ' کی مخالفت کا زبردست سامنا رہا۔

سلطنت مغلیہ ہندوستان میں مسلمانوں کے ذریعہ قائم ہونے والی سب سے پہلی اور بڑی منضبط اور محفوظ

(Well Disciplined & Recorded) حکومت تھی۔ حیرتناک امر یہ ہے کہ حکومت سے 'علما' اور

'مشائخ' کی کشمکش کا یہی دور نقطہ عروج بھی ثابت ہوا۔ سلطنت مغلیہ انسانی تاریخ میں پہلی مثالی

(Ideal)، عملی (Pragmatic)، بے انتہا روادار (Extremely Accomodative)، عوامی

(Popular) اور دانش ورانہ (Intellectual) حکومت تھی۔ اس کے بادشاہان اعلیٰ ترین اوصاف کا نمونہ تھے۔ دنیا کی تاریخ میں اتنے وسیع و عریض مخلوط معاشرے (Pluralistic Society) میں قائم حکومت کی کوئی دوسری مثال نہیں۔ عصر حاضر کی نام نہاد جمہوری حکومتیں بھی ان اصولوں پر اب تک کھری اتر نہ سکیں اور نہ اتنی طویل مدت تک کامیاب رہیں۔ تاریخ کا ایک معمہ ہے کہ آخر ایسی مثالی، عملی، روادار، عوامی اور دانش ورانہ حکومت سے 'علماء' اور 'مشائخ' کا تصادم نقطہ عروج پر کیوں پہنچ گیا؟ [ہر چند کہ پروفیسر سید اطہر عباس رضوی نے یہ نکتہ اٹھا کر حبیب الرحمن خان شروانی، مناظر احسن گیلانی، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، ڈاکٹر ریاض الاسلام اور زیڈ اے فاروقی کے نقطہ ہای نظر پیش کر دیئے ہیں لیکن وہ اس گتھی کو پھر بھی سلجھانہ سکے۔]

ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ S.A.A. Rizvi: Muslim Revivalist Movements In Northern India in the Sixteenth & Seventeenth Century: Munshiram Manoharlal Publishers, New Delhi: (1995 Edition).

۲۔ مناظر احسن گیلانی: ہزارہ دوم یا الف ثانی: تذکرہ مجدد الف ثانی، لکھنؤ۔

۳۔ Dr. I.H. Qureshi: Introduction to "A History of the Freedom Movement.

۴۔ Dr. Riazul Islam: Symptoms of Decline: A History of the Freedom Movement.

۵۔ Z.A. Farooqui: Aurangzeb And His Times: Bombay, 1935.

لہذا ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ جن تحریکوں کو مؤرخین 'احیا کی تحریکیں' (Revivalist Movements) قرار دے رہے ہیں وہ اسلام کی احیا کی تحریکیں تھیں یا اس کے انہدام کی تحریکیں (Exterminatory Movements)؟

۸۔ سلطنتِ مغلیہ چونکہ عدیم النظیر مثالی، عملی، روادار، عوامی اور دانش ورانہ حکومت تھی اس لئے ڈھائی سو سال برقرار رہ گئی اور چونکہ اس کی پالیسیاں مبنی بر حقیقت اور ہمہ گیر انسانی فلاح کے لئے برسر عمل تھیں اس لئے ان کے بعد آنے والی حکومتوں کے پاس ان 'بنیادی اصولوں' کو اختیار کئے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ اسی مقام پر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ گزشتہ پونے دو سو سالوں میں برصغیر میں صرف انھیں

موقعوں پر تباہیاں آئیں جب جب سلطنتِ مغلیہ کی قائم کردہ ان 'بنیادی پالیسیوں' کی صریح خلاف ورزی کی گئی خواہ تفکیر کی سطح پر یا تدبیر کی سطح پر یا پھر تعمیل کی سطح پر۔

۹۔ سلطنتِ مغلیہ کو اپنے قیام کے پہلے دن سے تین Threats کا سامنا رہا۔ پہلا: اندرونی، دوسرا: ملکی اور تیسرا: خارجی۔ ان تینوں خطرناک Threats میں سب سے خطرناک اور مہلک Threat اندرونی تھا۔ سلطنتِ مغلیہ کو درپیش یہ اندرونی خطرہ کیا تھا؟ سلطنتِ مغلیہ کو یہ اندرونی Threat تھا 'علما' اور 'مشائخ' کا 'Threat'۔

اس Threat کی تین سطحیں اور دو محاذ تھے۔ یہ تین سطحیں تھیں:

۱۔ اشرافیہ

۲۔ علما اور

۳۔ مشائخ۔

دو محاذ تھے:

۱۔ علما کی تحریکات اور

۲۔ مشائخ کی تحریکات۔

تین سطح: Threat کی تین سطح سے مراد تین سطحوں میں Moles اور Fifth Columnists کا

Implantation اور ان کے خیالات کی معاشرے میں Threat Embedding۔

پہلی سطح: مسلم معاشرہ بالخصوص اس کی اشرافیہ میں Moles اور Fifth Columnists کا

Implantation۔ اسلام اور امتِ مسلمہ مخالف ایک خارجی، مضر اور مہلک عنصر تھا جو اشرافیہ میں منصوبہ

بند طریقے اور رفتار سے Implant کیا جا رہا تھا۔ عام طور پر یہ 'ادخال' مسلمانوں کے ان طبقات میں کیا

جاتا تھا جو بعض وجوہ سے معاشرے میں باعزت اور مراعات یافتہ تھے۔ ان طبقات میں چار قابل ذکر

ہیں:

۱۔ سادات

۲۔ صدیقی

۳۔ فاروقی اور

۴۔ عثمانی۔

چنانچہ یہ خارجی عنصر مسلم معاشرے میں سادات، صدیقی، فاروقی اور عثمانی کی شکل میں تیزی سے داخل ہو کر بار سوخ ہو رہے تھے۔

دوسری سطح: پھر اسی طبقے کے افراد جو معاشرے میں بحیثیت سادات، صدیقی، فاروقی اور عثمانی معروف اور بااثر ہو چکے ہوتے تھے 'علما' کے اعتبار سے ظاہر ہو کر الگ الگ نوعیتوں کی 'تحریکات' کا آغاز کرتے تھے۔ مساجد، مدارس، منبر اور علوم کے ذریعہ ان تحریکوں کو معاشرے میں بار سوخ بناتے تھے۔

تیسری سطح: معاشرے کا یہی طبقہ جو بحیثیت سادات، صدیقی، فاروقی اور عثمانی معروف اور بااثر ہو چکے ہوتے تھے 'روحانی' اعتبار سے ظاہر ہو کر الگ الگ نوعیتوں کی 'روحانی تحریکات' کا آغاز کرتے تھے۔ عہد سلطنت میں یہ خارجی مشائخ عام طور پر چشتیہ میں داخل ہوئے اور عہد مغلیہ میں نقشبندیہ میں۔ ظاہر ہے ان تینوں سطحوں — اشرافیہ، علما اور مشائخ میں معروف اور بار سوخ ہو جانے والا یہ طبقہ نہ تو اصلاً سادات تھا نہ صدیقی، نہ فاروقی اور نہ عثمانی۔

دو محاذ: ان تین سطحوں کے علاوہ دو محاذ تھے۔

۱۔ علما اور ان کی تحریکات کا محاذ

۲۔ مشائخ اور ان کی تحریکات کا محاذ۔

۱۰۔ سلطنت مغلیہ کو اول روز سے اس عظیم Threat کا سامنا تھا۔ یہ Threat مقامی تھا اور نہ سادہ بلکہ عالمی تھا اور پیچیدہ۔ یہی وجہ ہے کہ جب پروفیسر خلیق احمد نظامی اور پروفیسر سید اطہر عباس رضوی جیسے مؤقر تاریخ دانوں نے بھی Exclusive اور Insular ہو کر باہر نامہ، تزک بابری، اکبر نامہ، آئین اکبری، تزک جہانگیری، رقعات عالمگیری، احکام عالمگیری، دستور العمل اور کلمات طیبات پڑھے تو ان کے رموز، غوامض اور مقاصد ان کی سمجھ سے باہر تھے۔ جب یہ حضرات بدایونی، بایزید بیات اور نظام الدین کی عبارتوں کو سمجھنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں تو پھر انسانی تاریخ کے اس عدیم النظیر سلطنت کے ان عظیم حکمرانوں (The Great Mughals) کے اپنے قلم سے لکھی عبارتوں کو نہ سمجھ سکے تو اس میں حیرت کی بات نہیں۔ یہ حکمران جوامع الکلم تھے۔ ان کی عبارتیں مختصر مگر اپنے اندر جہان معنی رکھتی تھیں۔ مثلاً جب ایک حکمران اپنے پیش رو کے لئے کوئی لقب استعمال کرتا تھا تو اس کے اندر پنہاں معانی اور پیغامات کا سمجھنا بڑے سے بڑے زبان داں کے لئے آسان نہ تھا۔ کیا مغلیہ حکمران اپنے پیش روؤں کے لئے 'عرش آشیانی'، 'جنت مکانی' اور 'خلد مکانی' جیسے القاب تحریر کرتے تو اس کا سمجھنا اتنا آسان ہے! ایسا نہیں بلکہ یہی عبارت

جہاں تک استعمال کرے تو کچھ اور معانی ہوں گے، شاہجہاں کرے تو کچھ اور عالمگیر کرے تو کچھ اور معانی۔
داخل ہونے والے یہ 'علما' 'سنی' بھی تھے اور 'شیعی' بھی۔ یہ 'ادخال' (Implantation) اور
'ترسیخ' (Embedding) منصوبہ بند طریقے سے سنیوں میں بھی ہو رہا تھا اور شیعوں میں بھی۔ بلکہ ان
میں بعض حسب ضرورت سنی سے شیعی ہو جاتے تھے تو کبھی شیعی سے سنی۔

علما کی طرح روحانی مشائخ سنی بھی تھے اور شیعی بھی۔ معاشرے میں 'مشائخ' کا 'ادخال'
(Implantation) اور ان کی 'ترسیخ' (Embedding) بحیثیت سنی بھی ہو رہا تھا اور بحیثیت شیعی بھی۔
'علما' اور 'مشائخ' میں ان طبقوں کا ظہور حیرتناک تھا جو اس راہ سے داخل ہو کر سلطنت کو مسلسل
متزلزل اور مسلم معاشرے کو فساد آلودہ کر رہے تھے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ یہ مقامی اور ملکی نہیں تھے بلکہ ان کی جڑیں عالمی تھیں۔ یہ بیک وقت عالم
اسلام کی دو عظیم سلطنتوں میں سرگرم تھے۔ 'سلطنت عثمانیہ' جہاں خلافت قائم تھی اور 'سلطنت مغلیہ' جو
دوسری سب سے بڑی حکومت اور پہلی کی پشتیبان تھی۔ مغلیہ حکمران عثمانی خلفا سے زیادہ بیدار مغز تھے۔
اس لئے سلطنت مغلیہ کو منہدم کئے بغیر خلافت عثمانیہ کو منہدم کرنا ممکن نہ تھا۔ مغلیہ حکمران زیادہ بیدار مغز اور
ذہین تھے۔ لہذا ان قوتوں کے خلاف انہوں نے عثمانی حکمرانوں سے زیادہ کامیاب کارروائیاں کیں
جب کہ سلطنت مغلیہ سلطنت عثمانیہ کے مقابلے میں زیادہ غیر مستحکم زمین پر کھڑی تھی۔ سلطنت عثمانیہ میں
یہ علما اور مشائخ زیادہ رسوخ پا گئے اور قانونی شکل اختیار کر لی جب کہ سلطنت مغلیہ کے عظیم حکمرانوں نے
انہیں کبھی مستحکم ہونے نہیں دیا۔

ملاحظہ فرمائیں:

Marshall G.S. Hodgson: The Venture of Islam: III, The
Gunpowder Empires and Modern Times: Chicago: 1974.

۱۱۔ سلطنت مغلیہ اور علما اور مشائخ کے تصادم کے پانچ ادوار ہوئے۔

۱۔ پہلا دور : 1526-1587

۲۔ دوسرا دور : 1587-1656

۳۔ تیسرا دور : 1656-1713

۴۔ چوتھا دور : 1713-1803

۵۔ پانچواں دور 1803-1857

ان تمام ادوار میں 'علما' اور 'مشائخ' نے سلطنتِ مغلیہ کو اکھاڑ پھینکنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ان واقعات کے نقوش اب بھی نمایاں ہیں چنانچہ سلطنتِ مغلیہ کے عظیم حکمرانوں نے چند مخصوص الفاظ کا استعمال کبھی عمومی اور کبھی خصوصی معنوں کے ساتھ کیا ہے۔ لیکن جب جب انہوں نے ان الفاظ کا استعمال خصوصی معنوں میں کیا ان کی مراد یہی 'علما' اور 'مشائخ' رہے تھے۔ ان خصوصی الفاظ میں دو قابل ذکر ہیں: (۱) خانہ بر انداز سلطنت اور (۲) کافرانِ نعمت۔ جہانگیر نے ایک اور لفظ کا استعمال کیا ہے وہ لفظ ہے 'شیاذ'۔ ایسے 'علما' اور 'مشائخ' نے عہدِ مغلیہ میں دو جگہ مراکز قائم کئے۔ عہدِ اول یعنی 1526-1650 آگرہ میں اور عہدِ دوم یعنی 1650-1858 دہلی میں۔ مذکورہ پانچ ادوار میں سلطنتِ مغلیہ نے 'علما' اور 'مشائخ' کے Threat سے بٹنے کے لئے تین عظیم الشان پالیسیاں وضع کیں۔

پہلی پالیسی: پہلی پالیسی بابر نے وضع کی۔ اس کا دور 1526-1556 تھا۔

دوسری پالیسی: دوسری پالیسی کے دو ادوار ہیں اولاً تجرباتی دور 1556-1587 اور دوسرا دوسری

پالیسی کے باضابطہ نفاذ کا دور 1587-1656۔ اس پالیسی کو وضع کرنے والا اکبر تھا۔

تیسری پالیسی: تیسری پالیسی کو وضع کرنے والا عالمگیر تھا اور اس کا دور 1656-1713 تھا۔

ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ : بابر نامہ

۲۔ ابوالفضلِ علّامی : آئینِ اکبری

۳۔ ابوالفضلِ علّامی : اکبر نامہ

۴۔ عبدالقادر بدایونی : منتخب التواریخ

۵۔ : دستور العمل آگہی

۶۔ شاہ نواز خاں خوانی : آثار الامراء

۷۔ غلام حسین خان طباطبائی : سیر المتاخرین

۱۲۔ حبیب الرحمن خان شروانی نے ایک سوال اٹھایا ہے۔ مناظرِ احسن گیلانی اس کا ذکر کرتے

ہوئے رقم طراز ہیں:

”احسان فراموشی ہوگی، اگر میں اس کا اظہار نہ کروں کہ سب سے پہلے اس مسئلہ کی طرف جس کا

میں آج ذکر کرنا چاہتا ہوں نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی مدظلہ العالی سابق صدر الصدور ممالک محروسہ آصفیہ نے توجہ دلائی تھی آپ نے ایک تقریر میں یہ سوال اٹھایا تھا کہ کیا وجہ تھی کہ مغل حکومت کے تخت پر چار بادشاہ مسلسل ایسے بیٹھے کہ ان میں دو پہلوں کو دو پچھلوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ نواب علامہ کا اشارہ اس طرف تھا کہ شاہجہاں اور عالمگیر ان دو پچھلوں کو جہانگیر اور اکبر سے مقابلہ کر کے دیکھئے۔ دونوں میں کوئی مناسبت ہے؟ یہاں پر اس سے بحث نہیں کہ ان چاروں میں کون سے دو آسمان تھے اور کون زمین۔ لیکن نسبت دونوں طبقوں میں وہی تھی جو آسمان و زمین میں ہو سکتی ہے۔ آخر بجای گندم کے گندم سے جو کی روئیدگی کس طرح ہوگی۔ وہی دریا جو شاہنشاہی قوتوں کے ساتھ ایک سمت بہ رہا تھا ایک پلٹ کر اس کا بہاؤ بالکل مخالف رخ کی طرف کن اسباب کے تحت ہو گیا۔“

[ملاحظہ فرمائیں: گیلانی: تذکرہ مجدد الف ثانی، لکھنؤ، 1959ء، محولہ رضوی]۔

یہ اظہار خیال تاریخ کے بالعموم اور سلطنت مغلیہ کی تاریخ کے بالخصوص یکسر غلط فہم اور غلط تعبیر (Total Misreading) کا نتیجہ ہے۔ لیکن آگے جانے سے قبل ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے:

آخر بعض انگریز مورخین (برطانوی شاہی مورخین نہیں) اور 'علماء' اور 'مشائخ' کے مابین عہد مغلیہ کے حوالے سے عبدالقادر بدایونی مصنف منتخب التواریخ کی پسندیدگی میں اس قدر ہم آہنگی کیوں ہے؟

سلطنت مغلیہ کی تینوں پالیسیوں — بابر پالیسی، اکبری پالیسی اور عالمگیری پالیسی میں تفکیری کوئی فرق نہیں بلکہ جو کچھ فرق واقع ہو وہ تدبیر یا تعمیلی فرق ہے۔ یہ سمجھنا کہ فلاں آسمان ہے اور فلاں زمین سراسر سوئے فہم کا نتیجہ ہے۔ اس خانہ ہمہ آفتاب است۔

۱۳۔ بلاشبہ یہاں ایک امر کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ علما اور مشائخ کے تعلق سے سلطنت مغلیہ کی پالیسی کا غائر مطالعہ عاجز کو اسی نتیجے تک لے جاتا ہے کہ سلطنت کی علما اور مشائخ کے تعلق سے بابر، اکبری اور عالمگیری پالیسی میں تفکیر کی سطح پر کوئی فرق یا انحراف (Deviation) پایا نہیں جاتا۔ جو کچھ فرق نظر آتا ہے اور ہے، وہ تدبیر اور تعمیل کی سطح کا فرق ہے۔ تاہم تدبیر یا تعمیل کی سطح پر تبدیلی بعض خارجی عوامل سے مل کر جداگانہ نتائج برآمد کرنے کا باعث ضرور ہوئی۔ بابر پالیسی اصلاً عالمی پالیسی تھی۔ ہندوستان کی سطح پر سب سے کامیاب اکبری پالیسی تھی جس نے حکومت کو استحکام بخشا۔ ملکی سطح پر سب سے ناکام عالمگیری پالیسی ثابت ہوئی۔ تاہم عالمگیری پالیسی کا تجربہ غیر معمولی تجربہ ہے۔ عالمگیری پالیسی کے تجربے کے نتائج بتاتے ہیں کہ تدبیر یا تعمیل کی سطح پر حتیٰ کہ وقتی طور پر بھی یہ پالیسی از حد Counter-

Productive ثابت ہوتی ہے۔ عالمگیر کے تجربے کے باوجود حیرت ہے کہ ضیاء الحق (1924-88) نے یہ پالیسی اختیار کی۔ ضیاء الحق عالمگیر کی طرح وسیع المطالعہ اور ذہین تھے نہ ان کے پاس اتنی اخلاقی طاقت تھی جتنی عالمگیر کو میسر تھی۔ عالمگیر کے نزدیک اس مسئلے کی دقیق باریکیاں زیادہ واضح تھیں۔ وہ اس کے Chemical Bonds اور Vectorisation کے Facts اور Data کا زیادہ بڑا ذخیرہ رکھتے تھے جن کا عشر عشر بھی دوسروں کو میسر نہیں۔ ضیاء الحق کے اقدامات آئندہ سو سالوں تک امت کو کس قیامت صغریٰ سے دوچار کریں گے اس کے تصور سے ہول آتا ہے۔

سلطنتِ مغلیہ کا زوال ایک دردناک حادثہ اور Mischance ہے۔ بلاشبہ اس سلطنت کا خاتمہ مغربی قوتوں نے نہیں کیا۔ تاریخ کا دقیق جائزہ بتاتا ہے کہ مغربی قوتیں اسے قطعاً ڈھانے کی حالت میں نہیں تھیں۔ وہ اگر ان کو ڈھاتیں تو ان کی بنیادی پالیسیوں کو وارث کی طرح نہ ڈھوتیں اور نہ سلطنتِ مغلیہ سے اصول حکمرانی میں کسب فیض کرتیں۔ سلطنتِ برطانیہ پورا ادراک رکھتی تھی کہ سلطنتِ مغلیہ کیا معنی رکھتی ہے۔ یہی وہ ادراک ہے جس کا اظہار ان دو دستاویزات سے ہوتا ہے۔ یہ دو دستاویزات ہیں:

۱۔ 1858 میں ہندوستان کی سلطنت کی ذمہ داریاں لینے کی قانون سازی کی دستاویز: اس دستاویز میں سلطنتِ برطانیہ نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ہم نے ملک فتح کر لیا ہے۔ اس نے برطانوی پارلمان میں یہ قانون پاس کیا کہ ہم اب ان ذمہ داریوں کو اپنے کاندھوں پر لیتے ہیں جو اب تک ایسٹ انڈیا کمپنی ادا کرتی تھی اور اس کا مقصد نظم و نسق کو درست کرنا ہے۔ چنانچہ 75 دفعات پر مشتمل یہ ایکٹ جس کا نام تھا: "Act For the Better Government of India 1858"

۲۔ یکم نومبر 1858 کا وہ اعلان جو ہندوستان کے طول و عرض میں ملکہِ برطانیہ و کٹوریہ کی جانب سے کیا گیا۔ جس کا عنوان ہے:

"Proclamation By The Queen in Council To The Princes,
Chiefs, And the People of India."

۱۳۔ بلاشبہ سلطنتِ مغلیہ کا خاتمہ اسلامی، انسانی اور مسلم تاریخ کا دردناک باب ہے لیکن بنیادی طور پر اس کے لئے دو عوامل ذمہ دار ہیں۔ اس سلطنت کو انھیں دو عوامل نے ڈھایا۔ ان میں پہلا عامل حرکی اور اقدامی تھا اور دوسرا منفی اور سلبی۔ یہ دو عوامل تھے:

۲۔ بد عنوانی (Corruption)

سلطنتِ مغلیہ بد عنوانی اور اہل کاروں کا متبادل فراہم کرنے میں ناکام ہو گئی اس لئے کہ 'علماء' اور 'مشائخ' نے مسلم معاشرے میں اس کی ہر صورت کو منجمد کر دیا تھا۔ ملکی خارجی اخذ کی طبعی خصوصیات بالآخر ان احوال پر غالب آ گئیں جن کا خطرہ سلطنت کو ابتداء سے ہی تھا۔

ملاحظہ فرمائیں:

1. C.R. Wilson : The Early Annals of The English in Bengal; Vol.II, Part II, The Surman Embassy, The Asiatic Society, Calcutta: 1911, P-141-43.
2. : Drake to Fort William Council, Jan-17-25, 1757, Hill's Collection, Vol.III, P- 136.
3. : Law's Memoirs, Vol.III, Hill's Collection, P-165.
4. S. Bhattachary : The East India Company & the Economy of Bengal; 1704-40, Luzac & Co., London, 1954.
5. : Hill's Collection Vol. II, P-104 etc.
6. : A Statistical Account of Bengal, London, Trubner & Co., 1875-77, Vol. V, P-123.

دوسری جانب 'علماء' اور 'مشائخ' نے اس بحران سے نکلنے اور ان بد عنوانی عمال کا اہل متبادل فراہم کرنے کی ہر راہ بند کر دی تھی۔ 'علماء' اور 'مشائخ' کا یہ عمل حرکی، اقدامی اور بنیادی تھا۔ بلاشبہ اس کے لئے مسلم معاشرہ بھی براہ راست ذمہ دار ہے جس نے 'علماء' اور 'مشائخ' کی اندھی تقلید کی اور سلطنتِ مغلیہ کے حکمرانوں کی اصلاحی کوششوں کی علانیہ مخالفت کر کے ان حکمرانوں کو بالآخر ناکام بنا دیا۔ ظاہر ہے یہ 'انسانیت کے خلاف جرم' (Crime Against Humanity) تھا جس کے لئے مسلم معاشرہ راست ذمہ دار تھا۔ 'قدرت' نے اس جرم کی عبرت ناک سزا دی۔ 1737 سے آج تک برصغیر کے مسلمانوں کو ملنے والی مسلسل سزا اس کی پاداشت ہے۔

صحیح

۱۔ عاجز کا خیال ہے کہ محض ان دونوں اسباب کے باوجود سلطنت مغلیہ اتنی کمزور نہ تھی کہ ٹوٹ جاتی۔ خود اس کا ادراک ایسٹ انڈیا کمپنی اور سلطنت برطانیہ کو بھی تھا۔ یہی ادراک 1858 کے ایکٹ کی عبارتیں طے کرنے میں بھی غالب رہا۔ سلطنت مغلیہ ختم ہو چکی تھی لیکن سلطنت برطانیہ پھر بھی باور کرنے کو اور ایسی عظیم تاریخی غلطی کرنے کو تیار نہ تھی جیسی عام طالع آزمایا بادشاہان یا حکومتیں کر بیٹھتی ہیں۔ لہذا سلطنت برطانیہ نے خود کو تاریخ کے سامنے جوابدہی سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی اور خود کو فاتح اعلان کرنے سے گریز کیا۔

۲۔ 1713 سے سلطنت مغلیہ کے خلاف 'علما' اور 'مشائخ' کی 'انہدامی سازش' نے نیارخ اختیار کر لیا تھا۔ یہی وہ دور ہے جب ہندوستان کے طول و عرض میں 'علما' اور 'مشائخ' اور ان کے 'اداروں' کو سب سے زیادہ وسعت اور رسوخ حاصل ہوا۔ اسی حقیقت کا اظہار مؤکاف یوں کرتی ہیں:

"In general, the religious leadership profited from the decline in central authority in the eighteenth century. This was true not only of the 'Ulama' but also of the 'Sufi Pirs' of the medieval shrines who had continued to form the religious leadership in the areas of Sind and the Punjab, in particular."

ملاحظہ فرمائیں:

Barbara Daly Metcalf: Islamic Revival in British India:
Deoband, 1860-1900; Oxford University Press, 1982.

۳۔ 1713ء سے علما اور مشائخ اس عالمی Club سے براہ راست مربوط ہو گئے جو عالمی پیمانے پر اسلام اور امت مسلمہ کا خاتمہ کرنے میں کوشاں تھا۔ چنانچہ ہندوستان میں اس عالمی تحالف کا مرکز 1713ء کے بعد دہلی میں مستحکم ہو گیا۔ ان عالمی قوتوں نے علما اور مشائخ کی Pump-Priming کی اور اس طرح سلطنت مغلیہ کا خاتمہ کر دیا گیا۔

۴۔ کیسی ستم ظریفی ہے کہ 1858ء میں جب کہ مغلیہ سلطنت فی الواقع ختم کر دی گئی، قلعہ فتح ہو گیا، آخری مغل حکمراں مجرم (?) قرار دے کر جلا وطن کر دیا گیا اور چین چین کر سلطنت کے ہر ممکنہ دعویدار کو عالمی شکار (International Witchhunting) کے ذریعہ ختم کر دیا گیا بایں ہمہ سلطنت برطانیہ خود کو علانیہ حاکم کہنے سے گریز کرتی ہے۔ چنانچہ 1858ء کا ایکٹ ان جملوں سے شروع ہوتا ہے:

"The territories of the East India Company were vested in her Majesty the Queen, and the powers exercised by the East India Company and the Board of Control were vested in the Secretary of State for India. He was to have a council for fifteen members who would hold office during good behaviour, and each member was to have a salary of £1200 a year out of the revenues of India. The pay of the Secretary of State and all his establishment would similarly be charged to India."

۵۔ مغلیہ سلطنت کی بین الاقوامی قانون (International Law) کے مطابق عملی، حقیقی اور قانونی حیثیت اور حالت کیا تھی اس کا اندازہ 1843ء کے ایک واقعے سے لگائیے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل ایلن برا (E.L. Ellenborough 1790-1871) نے مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ کیا اور بادشاہ سے درخواست کی کہ انھیں بادشاہ چند لمحوں اپنی بارگاہ میں بیٹھنے کی اجازت دے دیں۔ جسے بادشاہ نے ٹھکرا دیا۔ تفصیل سنیے:

"بسال یک ہزار و ہشت صد و چہل و سہ از مستحی نواب نامدار گورنر جنرل بہادر وزیر ہند مسٹر لارڈ ایلن برا را سر حضوری در بار در دل برخاست و چنان خواہش رفت کہ اگر رخصت نشستن بدر بار یابد (بہ بندگی

حاضر آید) بدر بار شتابد و لوازم دربار بجا آورده کورنش شاہانہ پیش گرفته نذر (غلامانہ) گزارده لختے زیر تخت قائم شدہ قہقری گرویدہ بجای کرسی آید و ساعتی برو نشیند و اس را پایہ والا شناسد و نیایش کنناں..... دخل دولت گراید و بمقتضای سلطانی رضا پردازد، وہم طریقہ نذر گزاری جاگیرد..... مسدودی یافتہ مرعی داشتہ، معلومی را ازاں بانتظام آورد و انجام دوام دہد کہ.....

..... شاہ بآبروی بزرگان خود نظر نموده رضا نداد۔ و گزارش نشست او بدر بار مطبوع خاطر نیفتاد۔ (فرمود کہ امداد تو..... و بی عرض مکرر و سفارش دگر فرمان نفاذ یافت کہ الاہ بارگاہ والا گاہی چنین توقع مدار)

ترجمہ: ”1843 میں نواب نامدار گورنر جنرل بہادر وزیر ہند مسٹر ایلین برانے دربار میں حاضری کا ارادہ کیا اور انہیں یہ خواہش ہوئی کہ اگر دربار میں بیٹھنے کی اجازت مل جائے تو (آداب بندگی بجالائیں)، دوڑ کر وہاں پہنچ جائیں اور لوازم دربار بجالا کر، آداب شاہی ادا کریں اور نذر (غلامانہ) پیش کرنے کے بعد، اٹھے پاؤں واپس آکر کرسی پر زیر تخت کچھ دیر بیٹھیں، اور اس امر کو ”مرتبہ عظیم“ سمجھیں۔ پھر مدح و ثنا کرتے ہوئے داخل دولت ہوں اور احکام سلطانی پر سر تسلیم خم کریں اور نذر بھی پیش کریں..... مسدود پا کر..... ملحوظ رکھ کر..... اس کے زرد نقد کو..... انتظام سے لائے۔ اور مدامت کے ساتھ پیش کرتا رہے..... بادشاہ نے اپنے بزرگوں کی آبرو (روایات) کا خیال کرتے ہوئے اس کی اجازت نہ دی، اور دربار میں بیٹھنے کے متعلق ان کی گزارش مرغوب خاطر نہ ہوئی۔ فرمایا کہ تیری امداد..... اور اس کا موقع دیئے بغیر کہ دوبارہ اس سلسلہ میں کوئی گزارش یا سفارش کی جائے، فرمان نفاذ کیا کہ بارگاہ والا میں ایسی (یعنی بیٹھنے کی) توقع نہ رکھی جائے۔“

ملاحظہ فرمائیں:

خلیق احمد نظامی (مرتب): عبداللطیف کا قلعہ دہلی کا ۱۸۵۷ کا تاریخی روزنامہ: ندوۃ المصنفین، دہلی، 1971۔

۶۔ ایک جانب سلطنت برطانیہ کا رویہ 1858 اور اس کے وزیر ہند لارڈ ایلین برا کا رویہ 1843 اور دوسری جانب ’علما اور مشائخ‘ کا مشہور و معروف رویہ بالکل ویسا ہی ہے جیسا مدعی ست گواہ چست۔ خاندان ولی اللہی کے صدر نشین شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے 1803 میں ایک ’غیر معمولی فتویٰ‘ جاری فرمایا۔ آپ فرماتے ہیں:

”در ایں شہر حکم امام المسلمین اصلاً جاری نیست و حکم روساء نصاریٰ بے دغدغہ جاری ست و مراد از اجراء احکام کفرانیت کہ در مقدمہ ملک داری و بند و بست رعایا و اخذ خراج و باج و عشور اموال تجارت و سیاست قطاع الطریق و سراق و فیصل خصومات و سزائے جنایات کفار بطور حاکم باشند آرے اگر بعضے احکام اسلام را مثل جمعہ، عیدین و اذان و ذبح تعرض نہ کنند نہ کردہ باشند، لیکن اصل این چیز ہا نزد ایشان ہباء و ہدرست زیرا کہ مساجد را بے تکلف ہدم می نمایند و بیچ مسلمان یا ذمی بغیر استیمان ایشان دریں شہر و نواح نمی تواند آمد و برائے منفعت خود از واردین مسافرین و تجار مخالفت نمی نمایند اعیان دیگر مثلاً شجاع الملک و ولایتی بیگم بغیر حکم ایشان دریں بلاد داخل نمی تواند شد و ازیں شہر تا کلکتہ عمل نصاریٰ ممتد است۔ آرے در چپ و راست مثل حیدرآباد، لکھنؤ و رام پور احکام خود جاری نہ کردہ اند سبب مصالحت و اطاعت مالکان آں۔“

[ملاحظہ فرمائیں: شاہ عبدالعزیز: فتاویٰ عزیز یہ ج۔ ۱ ص۔ ۱۷۱]

شاہ عبدالعزیز نے 1803 میں ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا۔ شاہ عبدالعزیز کو یہ 'Locus Standi' کہاں سے حاصل ہوا؟ اس 'غیر معمولی' اور 'پراسرار' فتویٰ کے اجرا کا وقت سب سے بڑا سوال پیدا کرتا ہے۔ یہ فتویٰ ٹھیک اس واقعے کے بعد جاری کیا گیا جب جنرل لیک (1744-1808) نے دہلی میں کارروائی (1803) کی۔ ایسے ثبوت اب میسر ہیں جو یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ شاہ صاحب کا گھرانہ اس عالمی سازش کا مرکز تھا اور یہ فتویٰ اس عالمی طاقت کی سازش کا حصہ تھا تا کہ مسلمانوں میں افراتفری پیدا ہو اور وہ کوئی ایسی کارروائی کریں تا کہ انھیں ملک پر قبضہ کرنے کا موقع مل جائے۔

'علماء اور مشائخ' کے احوال کے لئے ملاحظہ فرمائیں:

1. C.F. Andrews : Zaka ullah of Delhi: Cambridge; 1929.
2. J. Sarkar : Fall of the Moghul Empire.
3. Munshi : Travels in Punjab, Afghanistan, Turkistan
Mohanlal etc.; 1846.
4. Munshi : Journal of a Tour Through the Punjab,
Mohanlal Afghanistan etc., with Lt. Barnes; 1834.
5. Percival Spear : Twilight of the Mughuls: Studies in Late
Mughul Delhi: Cambridge; 1951.

6. Percival Spear : A History of Delhi under the Later Mughuls.

چنانچہ یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ سلطنتِ مغلیہ کا خاتمہ 'علما' اور 'مشائخ' کی بدترین سازش اور مسلم معاشرے کی 'علما' اور 'مشائخ' کی اندھی تقلید کا نتیجہ تھا۔

۷۔ سلطنتِ مغلیہ ہوا پر قائم نہیں ہوئی تھی۔ وہ برسر زمین ایک حقیقت (1556) تھی۔ اسے فوری طور پر اور مسلسل ایسے اہل کاروں کی ضرورت تھی جو سلطنت کو شفاف، مضبوط اور منضبط حکومت دے سکیں۔ مسلم معاشرہ اور اس میں قائم 'علما' کے تعلیمی نظام کی اجارہ داری ایسا کرنے سے قاصر تھے۔ چنانچہ مجبور ہو کر اس نے ملک کے اندر ان لوگوں کی طرف دیکھا جو ایسے صاحب صلاحیت اہل کار فراہم کر سکتے تھے۔ [ملاحظہ فرمائیں: ابوالفضلِ علامی: آئین اکبری: آئین ۲۵] اکبر کی اصلاحات کے اندرونی محرکات یہی تھے۔ چنانچہ 'علما' نے اکبر کے خلاف وہی حربے آزمانے شروع کر دیئے جو امت میں بے حد مقبول اور ان کے آزمودہ تھے۔ انھوں نے اکبر کو بددین اور کافر قرار دے دیا۔ 'علما' نے نعرہ بلند کیا:

پادشاہ امسال دعویٰ نبوت کردہ اند گرخدا خواہد پس از سالے خدا خواہد شدن

۸۔ سلطنتِ مغلیہ بے حد محتاط تھی۔ اس کی پہلی ترجیح یہی تھی کہ اسے ایسے معتمد اہل کار مسلم معاشرے سے میسر آئیں لیکن 'علما' اس سے مس ہونے کو تیار نہ تھے۔ مغلیہ حکمران ملکی تاریخ، یہاں کے Anthropological Strands اور ان کی پیچیدگیوں سے بخوبی واقف تھے اس لئے اس کے مضمرات و عواقب کے حوالے سے ان کی پریشانی اور ان کا محتاط ہونا قابل فہم تھا۔ لیکن ان کے سامنے کوئی راہ نہیں تھی۔ انہوں نے اسی احتیاط کو ملحوظ رکھا اور ایسے فیصلے کئے جن سے اوق اور اعلیٰ کوئی دوسری Anthropological Engineering نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن طویل مدت میں وہ اس کے منفی عواقب کے حوالے سے ہمیشہ پریشان رہے۔ ان کے اندیشے بالآخر سچ ثابت ہوئے۔ ملک کے اندر کے Anthropological Strands نے منفی اثرات قائم کرنا شروع کر دیئے تھے۔ بہادر شاہ اول (1707-12) سے شاہ عالم (1759-1806) کے ذریعہ دیوانی کی منتقلی (1765) تک سارے ملک میں ان اہل کاروں کے سبب بد عنوانی کا راج ہو چکا تھا۔ سلطنتِ مغلیہ کے پاس کوئی راہ نہیں تھی۔ ایک جانب مسلم معاشرے سے اہل عمال فراہم ہونا ناممکن تھا اس لئے کہ 'علما' معاشرے کو Deconditioned کرنے کو بالکل تیار نہ تھے اور تعلیمی نظام میں انقلابی تبدیلیوں کے بغیر ایسا ہونا ممکن نہ تھا۔

۹۔ دوسری جانب ملکی Anthropological Strands بے قابو ہو کر سارے ملک کو بدعنوانی (Corruption) کے جہنم میں جھونک چکے تھے۔ سلطنت مغلیہ بالخصوص اس کے عالی ہمت بادشاہ اپنی ذمہ داریوں سے پہلو تہی نہیں کر سکتے تھے۔ انھیں اس نظام کو درست کرنے کے لئے قابل اعتماد اور صاحب صلاحیت متبادل کی تلاش تھی۔ مغلیہ بادشاہ دنیا سے بے خبر بھی نہیں تھا۔ تاریخی تفصیلات بتاتے ہیں کہ اسے برطانوی سلطنت کی گہری واقفیت تھی۔ بدعنوانی (Corruption) کے حوالے سے اس وقت ہندوستان اور برطانیہ میں کوئی بڑا فرق نہ تھا۔ برطانیہ ہندوستان کی طرح بدعنوانی (Corruption) کی آگ میں جھلس رہا تھا۔ ہندوستان کی طرح برطانیہ کے سلاطین بھی اس بدعنوانی کا خاتمہ چاہتے تھے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں ہندوستان اور برطانیہ میں ایک جوہری فرق دریافت ہوا۔ برطانیہ میں 'منبر' (Church) سلطنت کے تابع تھا۔ ہندوستان میں 'منبر' خود سر اور بے قابو تھا۔ مغلیہ بادشاہ کو اس کی خبر تھی کہ برطانیہ میں ایسی قوتیں بھی ہیں جو اس ہمہ گیر بدعنوانی کو ختم کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ بادشاہ کو یہ بھی معلوم تھا کہ ہندوستان اور برطانیہ میں ایک اور جوہری فرق ہے۔ برطانیہ میں 1688 کے بعد ایک عوامی پارلمان موثر طور پر قائم ہے جہاں بدعنوانیاں فوراً سامنے آ جاتی اور ان کے تدارک کی راہ نکلنے کی امید باقی رہتی ہے۔ جب کہ ہندوستان میں 'علما' اور اس کے زیر اثر معاشرے نے امرا (Aristocrates) کی تادیب کی ہر راہ بند کر دی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ بادشاہ کے کانوں میں ولیم پٹ اول (William Pitt-I- The Earl of Chatham, 1708-78) کی برطانوی پارلمان میں بلند ہونے والی صدا پہنچی تھی:

"I am sure that I can save the country, and that no one else can."

لارڈ چیچم تھم نے اپنا عہد پورا کیا۔ اس نے 1757-1761 کے دوران اپنے دور اقتدار میں برطانیہ کو بدعنوانی سے پاک کر دیا جس پر آج سلطنت برطانیہ کھڑی ہے۔ اسی طرح مغلیہ بادشاہ کو یہ بھی معلوم تھا کہ برطانیہ اور ہندوستان کے بدعنوان عناصر نے باہم مل کر ہندوستان میں قیامت برپا کر رکھی ہے۔ کمپنی کے اہل کاروں نے سلطنت مغلیہ کے ہندوستانی اہل کاروں کے ساتھ مل کر بدعنوانی کا راج قائم کر رکھا ہے۔ یہ بھی لگتا ہے کہ بادشاہ کو اس کی بھی خبر تھی کہ کمپنی کے ایماندار اور بدعنوان انگریز اہل کاروں میں باہم کیسی جنگ برپا ہے۔ بادشاہ کو اس کی بھی خبر تھی کہ کمپنی کے ایماندار اہل کار کس جدوجہد میں سرگرداں ہیں۔ بادشاہ کی اپنی حالت کیا تھی؟ 'علما' اور امرا نے اس کی کیا حالت بنا رکھی تھی؟ اس کے اظہار کے لئے صرف ایک اصطلاح

جو اس کے ایک ہم عصر تاریخ داں نے استعمال کی تھی کافی ہوگی: *A Homeless Wanderer*۔
تاریخ داں نے لکھا:

"The feeble descendent of the Emperor of Delhi was a homeless wanderer, but was still recognised as a titular sovereign of India."

'اردووی معشئی' میں زندگی بسر کرنے والے اولوالعزم مغلیہ حکمرانوں کے لئے یہ اصطلاح کیسی عبرت ناک کہی جاسکتی ہے؟

۱۰۔ ایسا لگتا ہے کہ رابرٹ کلائیو (1725-1774) کے ذہن (Mind) کی خبر بادشاہ کو تھی اور برطانیہ میں ولیم پٹ اول کی وزارت عظمیٰ اور رابرٹ کلائیو کی ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی سربراہی میں اسے ہندوستان کے بدترین حالات میں اصلاح حال کی روشنی نظر آرہی تھی۔ رابرٹ کلائیو کا وہ خط جو اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے Court of Directors کو 30 ستمبر 1765 کو لکھا تھا اس کی تصدیق کرتا ہے۔
رابرٹ کلائیو نے لکھا:

"2. Upon my arrival, I am sorry to say, I found your affairs in a condition so nearly desperate as would have alarmed any set of men whose sense of honour and duty to their employers had not been estranged by the too eager pursuit of their own advantage. The sudden, and among many, the unwarrantable acquisition of riches, had introduced luxury in every shape and in the most pernicious excess. These two enormous evils went hand in hand together through the whole Presidency, infecting almost every member of each Department; every inferior seemed to have grasped at wealth that he might be able to assume that spirit of profusion which was now the only distinction between him and his superior..... It is no wonder that the lust of riches should readily embrace the proffered means of its gratification, or that the instruments of your power should avail themselves of their authority, and proceed even to extortion in those cases where

simple corruption could not keep pace with their rapacity. Examples of this sort, set by superiors, could not fail of being followed in proportionable degree by inferiors; the evil was contagious, and spread among the civil and military, down to the writer, the ensign, and the free merchant.....

"9. Two paths were evidently open to me; the smooth one, and strewn with abundance of rich advantages that might be easily picked up; the other untrodden, and every step opposed with obstacles. I might have taken charge of the government upon the same footing on which I found it; that is, I might have enjoyed the name of Governor, and have suffered the honour, importance, and dignity of the post to continue in their state of annihilation..... An honorable alternative, however, lay before me; I had the power within my breast to fulfil the duty of my station, by remaining incorruptible in the midst of numberless temptations artfully thrown in my way; by exposing my character to every attack which malice or resentment are apt to invent against any man who attempts reformation; and by encountering, of course, the odium of the settlement. I hesitate not a moment which choice to make; I took upon my shoulders a burden which requires resolution, perseverance, and constitution to support. Having chosen my part, I was determined to exert myself in the attempt, happy in the reflexion that the honour of the nation, and the very being of the Company would be maintained by success.....

"12. The sources of tyranny and oppression, which have been opened by the European agents acting under the authority of the Company's servants, and the numberless black agents and sub-agents acting also under them, will, I fear, be a lasting reproach to

the English name in this country..... I have at last, however, the happiness to see the completion of an event which, in this respect as well as in many others, must be productive of advantages hitherto unknown, and at the same time prevent abuses that have hitherto had no remedy: I mean the Dewanee, which is the superintendency of all the lands and the collection of all the revenues of the Provinces of Bengal, Behar and Orissa. The assistance which the Great Moghal had received from our arms and treasury made him readily bestow this grant upon the Company; and it is done in the most effectual manner you can desire. The allowance for the support of the Nebob's dignity and power, and the tribute to His Majesty [The Great Moghal] must be regularly paid; the remainder belongs to the Company....."

(House of Commons Committee's Third Report, 1773, Appendix, PP. 391-398)

۱۱۔ غور کیا جائے تو اس صورتحال میں سلطنتِ مغلیہ کے پاس کوئی راہ نہ تھی۔ ایسی حالت میں اس کا یہ فیصلہ انتہائی دانشمندانہ تھا۔ حالات کا دقیق جائزہ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے درج ذیل اسباب بیان کرتے ہیں:

۱۔ بے حساب خارجی اخذ (Outsourcing) ہونا یا کرنے کے لئے مجبور ہونا۔
۲۔ 'علماء' کے سبب خارجی اخذ (Outsourcing) کا متبادل فراہم کرنے سے مسلم معاشرے کا معذور ہو جانا۔

۳۔ بے حساب خارجی اخذ (Outsourcing) کے ذریعہ پیدا کردہ ہمہ گیر بدعنوانی کا دور دورہ ہو جانا۔

۴۔ مسلم معاشرے کے مکیف (Conditioned) ہونے کے سبب بدعنوانی سے نجات کی راہ کا بند ہو جانا۔

۱۲۔ 'علماء اور مشائخ' کی سازش (?) کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ شاہ ولی اللہ (1703-1762) کو

سلطنت مغلیہ کا مسئلہ پونے میں اور اس کا حل قندھار میں نظر آیا۔ چنانچہ شاہ صاحب کے حل 1761 نے پیدا شدہ وقتی عدم استحکام کو دائمی عدم استحکام میں بدل دیا۔ کیا نجیب الدولہ (ف۔ 1770) جنہیں شاہ صاحب نے رئیس المجاہدین، امیر الغزاة اور منبع الحسنات لکھا تھا اور جن پر ابدالی (ف۔ 1773) نے اس دور بدر بھٹکنے والے بادشاہ کی حفاظت کی ذمہ داری ڈالی تھی ان کے لائق فرزند ضابطہ خاں (ف۔ 1783) نے وہ ذمہ داری ادا کی؟ شاہ ولی اللہ کے ممدوح کے پوتے اور ضابطہ خاں کے فائق بیٹے غلام قادر خاں (ف۔ 1788) نے 10 اگست 1788 کو شاہ صاحب کے ذریعہ پیدا کردہ دائمی عدم استحکام کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ناقابل رجوع (Perpetually Irreversible) بنا دیا۔

ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ محمد عاشق پھلتی: القول الحلی فی ذکر آثار الولی: حضرت شاہ ابوالخیر اکادمی: دہلی۔

۲۔ خلیق احمد نظامی: شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات: ندوۃ المصنفین، دہلی۔

۳۔ Dr. Ganda Singh: Ahmad Shah Durrane: Father of Modern Afghanistan: 1959.

۴۔ J.N. Sarkar: Fall of the Moghul Empire:

۵۔

۵۔ غلام حسین خان طباطبائی: سیر المتاخرین۔

۱۳۔ بلاشبہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بعض ذمہ داروں نے استعماری جسارت (Colonial

Entrepreneurship) کا مظاہرہ کیا لیکن وہ خوب جانتے تھے کہ وہ اتنی بڑی ذمہ داری کے

سنجھانے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس ضمن میں انھیں Walkover مل گیا۔ جب ذمہ

داریاں ان کے پاس آگئیں یا ان کے اوپر تھوپ دی گئیں تب انھیں اس کا ادراک ہوا۔ 1824 تک ان

کا رویہ یہی بتاتا ہے کہ وہ تجارتی اور پھر زیادہ سے زیادہ استحصالی (Commercial &

Exploitative) جذبہ ہی سے سرشار تھے۔ حکمرانی کی انھوں نے کبھی خواہش نہیں کی تھی۔ صرف اتنا کہا

جاسکتا ہے کہ انھیں بلاشبہ اس نئی صورتحال کے قبول کر لینے میں اپنے تجارتی اور استحصالی عزائم کی بہتر تکمیل

کی صورت نظر آئی ہوگی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت کرنے کے اختیارات 1833 کے بعد ہندوستان میں

سلب کر لئے گئے۔ 1837 کے بعد صورتحال میں نمایاں تبدیلیاں آنے لگیں۔ تاریخ کے کسی طالب علم

کے سامنے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر برطانیہ میں لارڈ چٹھم اپنے ملک سے بدعنوانیاں ختم کرنے میں

اور ملکہ و کٹوریہ (حکمرانی: 1837-1901) اسے ترقی یافتہ اور فلاحی مملکت بنانے میں کیوں کامیاب ہو گئے جب کہ سلطنت مغلیہ ہندوستان میں اس میں ناکام ہو گئی؟ دونوں ملکوں کے تقابلی مطالعے کے بعد اس کے دو اسباب سمجھ میں آتے ہیں:

۱۔ برطانیہ میں منبر [Pulpit (Church)] سلطنت کے تابع فرمان تھا جب کہ سلطنت مغلیہ میں 'علما' خود مختار، خود سر اور بے قابو تھے۔

۲۔ برطانیہ میں نظام تعلیم سلطنت کے تابع یا آزاد تھا جب کہ سلطنت مغلیہ میں حکومت کی کوششوں کے باوجود 'مسلم نظام تعلیم' پر 'علما' کی اجارہ داری ہنوز برقرار تھی اور انہوں نے پورے مسلم معاشرے کو ذہنی اور علمی اعتبار سے صد فی صد مکئیف (Conditioned) بنا رکھا تھا اور مسلم معاشرہ 'علما' اور 'مشائخ' ہی کے زیر اثر اور ان کے سحر میں مبتلا تھا۔

۱۴۔ انگریز اپنے Constraints سے پوری طرح واقف تھے۔ چنانچہ 1765 سے ان کے کاندھوں پر آئی ذمہ داریوں کے ادراک نے انہیں پریشان کر دیا۔ انہیں ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں نظم و نسق کے لئے افراد کار اور مخصوص صلاحیتیں درکار تھیں۔ ان کے اپنے Constraints تھے۔ ان کی مجبوریاں زیادہ شدید تھیں۔ اعلیٰ ہنرمند انسانی وسائل (Highly Skilled Human Resources) کی بات ہو یا متوسط اور عمومی ہنرمند انسانی وسائل (Medium & Lower Skilled Human Resources) کی وہ سخت قلت (Constraint) کے شکار تھے۔ برطانیہ کی پوری قابل کار (Workable) آبادی کو بھی اگر وہ یہاں درآمد کر لیتے جب بھی یہاں کی ضرورت پوری نہیں ہوتی۔ ان کے Constraints قلیل مدتی یا طویل مدتی منصوبہ بندی سے ختم ہونے والے نہیں تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کے لئے کئی طویل ترین منصوبہ بندیوں (Perspective Plannings) کی ضرورت تھی۔ سچ یہ ہے کہ اگر ان کی حقیقی صورتحال اور ان کی نفسیات کا تجزیہ کیا جائے تو وہ ہندوستان میں حکمرانی کرنے کے جنجال میں پھنسا ہی نہیں چاہتے تھے۔ یہ بلا تو ان کے سر آگئی تھی۔ وہ محض تجارتی اور زیادہ سے زیادہ استحصالی جذبہ کی تکمیل چاہتے تھے۔ وہ یہ بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ ہندوستان شمالی امریکہ یا افریقہ نہیں۔ ہندوستان دنیا کی عظیم سلطنتوں میں سے ایک تھا۔ وہ یہاں ویسا سلوک روا نہیں رکھ سکتے تھے جیسا امریکہ میں رکھا گیا تھا۔ پھر انہوں نے اٹھارہویں صدی کے اواخر میں یورپ سے نقل مکانی کرنے والے لوگوں کا رد عمل بھی دیکھ لیا تھا جو ریاست ہائے متحدہ کی تشکیل (1776) کی شکل میں

ان کے سامنے آیا۔ 1833 میں جب سلطنت برطانیہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان میں تجارت کرنے سے روک دیا حتیٰ کہ 1858 میں جب حکمرانی کی ذمہ داری خود سلطنت برطانیہ نے عبوری طور پر اپنے کاندھوں پر لے لی تب بھی یہ بات ان کے سامنے واضح تھی اور انہوں نے 1858 کے ایکٹ کے عنوان میں ہی اسے واضح کر دیا تھا کہ وہ یہاں حکمرانی کا ارادہ نہیں رکھتی۔ یہ ذمہ داری چونکہ اس کے سر آگئی تھی لہذا وہ اس سے پہلو تہی بھی نہیں کر سکتی تھی۔ سلطنت برطانیہ خوب جانتی تھی کہ اس کے Constraints اس کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ یہاں باضابطہ حکمرانی کرے۔ چنانچہ انہوں نے 1877 تک اسے عملاً ایک Police State رکھا جہاں انہوں نے صرف Policing کی۔ چنانچہ 1765 میں ایسٹ انڈیا کمپنی بالکل اس قابل نہیں تھی کہ وہ ہندوستان کا نظم و نسق چلا سکے۔ اس نے اب تک چلے آ رہے عمال اور اہل کاروں کو صرف موجد (Orient) کرنا چاہا۔ اس سلسلے میں انہوں نے اہل ہند بالخصوص مسلمانوں کو ابتداء اس توجیہ (Orientation) میں شامل ہونے یا رہنے کی کھلی دعوت دی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے از حد انتظار کیا۔ خواہ کسی تزویر (Machination) سے ہی سہی قوتہ (Potentially) اور حقیقتہً (Actually) غالب ہو جانے والی قوت کے لئے قانوناً (Legally) غالب ہو جانا محض لمحاتی رسم کی ادائیگی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا لیکن اس کے باوجود ایسٹ انڈیا کمپنی نے تحمل کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ حقیقی اور برسر زمین ضرورتیں اور مطالبات انہیں بحران میں مبتلا کرنا شروع کر چکی تھیں۔ اپنی ان نئی ذمہ داریوں کی باحسن ادائیگی کے لئے انہوں نے اپنی ساری قوت جھونک دی۔ انہوں نے اپنے لوگوں کو ایسے کام کرنے پر مجبور کیا یا اس کی بھاری قیمت ادا کر کے ترغیب دی جن کا کرنا ان کے لئے آسان نہ تھا۔ انہوں نے اپنے لوگوں کو عربی، فارسی اور اردو پڑھوائی۔ امور انتظامی (حکمرانی) ادا کرنے کے لئے زیر انتظام لوگوں کی نفسیات کو سمجھنے کے لئے مشرقی علوم (Oriental Studies) میں دسترس حاصل کرنے پر مجبور کیا۔ برطانیہ میں محیر العقول ہیلی بری کالج Haileybury College جیسا ادارہ قائم کیا۔ کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج (Fort William College) قائم کیا تاکہ وہاں ان کے افراد تیار ہوں۔ ہندوستان کے نظم و نسق کے لئے آکسفورڈ (Oxford) اور کیمبرج (Cambridge) سے اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل افراد اور اہل علم کو درآمد کرنے کی کوشش کی۔ بالفاظ دیگر اگر یہ کہا جائے تو اس میں کیا غلط ہوگا کہ اپنے کاندھوں پر تھوپی ہوئی ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے انہوں نے برطانیہ میں ہندوستان کے لئے Braindrain کیا۔

مشرقی علوم (Oriental Studies) میں مہارت کے لئے انھوں نے اپنی توانائیاں جھونک دیں۔

[یہاں جملہ معترضہ کے بطور یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ داعی الی اللہ اور شہداء علی الناس مسلم قوم کے یہ 'علماء' جو خود کو انبیا کے وارث قرار دیتے ہیں کیا انھیں 712 سے اٹھارہویں صدی تک کبھی ایسی توفیق ہوئی تھی کہ ہندوستان کے طول و عرض میں بسنے والی ہزاروں قوموں اور طبقات کی نفسیات کو باضابطہ سمجھنے اور ان میں عدل کے قیام کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ایسے ادارے قائم کریں، ایسی مہم جوئی کریں اور اس میں اپنے افراد کار کی توانائیوں کو جھونک دیں۔ ان سوالوں کا جواب (۱) البیرونی کی فی تحقیق ما للہند، (۲) شبلی نعمانی کے مضامین مشمولہ مقالات شبلی جلد دوم (بھاشا زبان اور مسلمان اور تحفۃ الہند اور (۳) گیان چند: ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب میں درج حوالوں سے نہیں دیا جاسکتا۔]

۱۵۔ ایسٹ انڈیا کمپنی مسلم نظام تعلیم کے ذمہ داروں کی جانب ملتجیانہ دیکھتی رہی لیکن یہ 'علماء' ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ پھر بھی ایسٹ انڈیا کمپنی نے تحمل کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اس نے درمیانی راہ نکالنا چاہی۔ 'دہلی کالج' وہی درمیانی راہ تھی۔ 'علماء' پھر بھی ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ بالآخر برسر زمین حقیقی ذمہ داریاں انھیں کب تک اس تحمل اور لا حاصل انتظار کی اجازت دیتیں۔ مجبور ہو کر انھوں نے ساری بساط ہی پلٹ دی اور پورے ملک میں سرکاری طور پر 'مغربی زبان' بحیثیت ذریعہ تعلیم اور 'مغربی نظام تعلیم' بحیثیت 'نظام تعلیم' نافذ کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ یہ حادثہ ایک نئے بحران کا آغاز تھا۔ روایتی ورموروثی عمودی ثنویت (Traditional Vertical Dichotomy) اور روایتی افقی تراذیت (Traditional Horizontal Dualism) سے صدیوں مضحمل (Degenerated) اور نیم نسان شدہ (Dehumanized) مسلم معاشرہ اچانک پیدا ہو جانے والی نوشنویت (Neo-Dichotomy) کا شکار ہو گئی۔ انگریزی بطور ذریعہ تعلیم و سرکاری زبان اور مغربی نظام تعلیم اور 'نظام تعلیم' کے نفاذ سے جو نوشنویت (Neo-Dichotomy) پیدا ہوئی اس نے مسلم معاشرے کو ودی (Vertically) طور پر ذہناً اور علماً منقسم کر کے رکھ دیا۔ یہ عمودی نوشنویت (Vertical Neo-Dichotomy) کتنی گہری، مہلک اور دور رس نتائج کی حامل ثابت ہوئی اس کا اندازہ آج دو سو لوں کے بعد بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ عاجز نہیں جانتا کہ پروفیسر مشیر الحسن نے جن تاریخی نارسائیوں کا ذکر ہے اس کی اصل کہنہ سے وہ واقف ہیں؟ عین ممکن ہے کہ وہ اس کا ادراک رکھتے ہوں کہ اس تاریخی

نارسانی کی جڑ یہی عمودی نوثنویت (Neo-Dichotomy) ہے جو دو سو سال پہلے مسلم معاشرے میں پیدا ہو گئی تھی۔ پروفیسر مشیر الحسن لکھتے ہیں:

"Yet academic circles in India were neither prepared nor intellectually equipped (most have no knowledge of Persian and Urdu) for a serious engagement on issues underlined in their (ie. Aziz Ahmad & Mohammad Mujeeb's) remarkably perceptive writings." (Prof. Mushirul Hasan: Introduction: 'Aligarh's First Generation: David Lelyveld: OUP. 2010)

ایسی ثنویت لازماً بغیر تاخیر کے ترادفیت کے قائم کرنے کا موجب بن جاتی ہے۔ دو سو سال قبل موجود حالات تو اس کے لئے زیادہ سازگار تھے۔ چنانچہ مسلم معاشرہ آنا فانا افقی نو۔ ترادفیت (Horizontal Neo-Dualism) کا شکار ہو کر رہ گیا۔

صحیح نام

۱۔ مشہور مثل ہے: ”عدو شری برا انگیزد کہ خیر مادر آں باشد“: چنانچہ اس شر کے بطن میں ایک خیر پوشیدہ تھا جو جلد برآمد ہو گیا۔ 661 عیسوی کے بعد پہلی بار مسلم تاریخ میں ایک نئے اور عدیم النظیر (Unprecedented) باب کا آغاز ہوا۔ مسلم تاریخ میں قائم ہونے والا حکمران۔ علما تعہد (Ruler-Ulama Nexus) دیکھتے دیکھتے پاش پاش ہو کر رہ گیا۔ چودہ سو سال سے تکلیف (Conditioning) کی قید میں پابہ زنجیر مسلم معاشرہ اب آزاد ہو چکا تھا۔ ”عظیم حکمران“ جا چکے تھے۔ اب حکمران تھے نہ ان کا افقی مکلف خانہ۔ شمال تھے نہ عساکر۔ مسلم معاشرے میں نصف قوم عمودی طور پر معدوم یا نئے نظام میں جذب ہو چکی تھی۔

۲۔ یہی وہ عہد تھا جب ایک عجیب و غریب آواز گونجی جس کی لے رفتہ رفتہ تیز ہوتی چلی گئی:
۱۔ آواز آئی:

آہی بہ عشق فاتح خیر کنیم طرح در گنبد سپہر مگر در کنیم طرح
در فصل دی کہ گشتہ جہاں زمہریر ازو بنشیں کہ آب گردش ساغر کنیم طرح
خود را بشاہدی پر ستیم زیں سپس در راہ عشق جادۂ دیگر کنیم طرح

۲۔ پھر آواز اور بلند آہنگ ہوئی:

ہرچہ در جزیہ ز گبراں می ناب آوردند
ہرچہ از دست گہہ پارس بہ یغما بردند
بہ شب جمعہ ماہ رمضانم دادند
تا بنالم ہم از آن جملہ زبانم دادند

(۱۸۳۷-۳۸)

۳۔ پھر آواز کا آہنگ اور تیز ہوا:

گفت کا ندر معرض اسرار دوست
خواہد از نور جمال یار خویش
ہر کہ باشد طالب دیدار دوست
روش مشرق در و دیوار خویش
بایدش کاشانہ نیکو ساختن
خار و خس از خانہ بیرون ریختن
زاں سپس کایں کار را یکر و کند
آورد آب و زند در رہ گذار
برگ گل در رہ فشاند مشت مشت
رخت گرد آلود از تن بر کشد
چوں در آید آں نگار از خود رود
عاشق از خود رفت دلبر ماند و بس
جملہ جاناں ماند و جسم و جاں نماند
شبہمی را طعمہ خورشید کن
تیرگی بزدائی تارخشاں شوی
مشک تر با خاک رہ آمیختن
خانہ را زیں گو نہ رفت و رو کند
تا ہوا از رہ نہ می گیرد غبار
تانیاید خاک زیر پا درشت
جامہ پاکیزہ اندر بر کشد
خوش با استقبال یار از خود رود
سایہ گم شد، مہرانور ماند و بس
حسرت وصل و غم ہجراں نہ ماند
خویش را قربانی این عید کن
قطرگی بگذار تا عماں شوی

(۱۸۵۰-۵۷)

۴۔ پھر یہ آواز نوائے سروش کی طرح گونجی:

بر چنین کاری کہ اصلش این بود
من کہ آئینِ ریا را دشمنم
گر بدیں کارش گویم آفریں
صاحبان انگلستان را نگر
تا چه آئین با پدید آورده اند
زین هنر مندان هنر پیشی گرفت
حق این قومست 'آئین' داشتن
داد و دانش را بهم پیوسته اند
آتش کز سنگ بیرون آورند
تا چه افسوں خوانده اند ایناں بر آب
گه دغاں کشتی بجهیوں می برد
غلتک گردوں بگرداند دغاں
از دغاں زورق برفقار آمده
نغمه با بی زخمه از ساز آورند
بین، نمی بینی کہ این دانا گروه
میزنند آتش بباد اندر ہی
روبه لندن کاندران رخنشده باغ
کاروبار مردم ہشیار بین
ہر خوشی را خوشتری ہم بودہ است
آں ستاید کش ریا آئین بود
دروفا اندازہ دان خود منم
جای آن دارد کہ جویم آفریں
شیوہ و انداز ایناں را نگر
آنچه ہر گز کس ندید، آورده اند
سعی بر پیشینیاں پیشی گرفت
کس نیارد ملک بہ زین داشتن
ہند را صد گو نہ آئین بتہ اند
این هنر منداں زخس چوں آورند
دود کشتی را ہی راند در آب
گہہ دغاں، گردون بہاموں می برد
نرہ گاو واسپ را ماند دغاں
باد و موج، این ہر دو بیکار آمدہ
حرف چوں طائر پرواز آورند
در دو دم آرند حرف از صد کروزہ
میدرخشد باد چوں اخگر ہی
شہر روشن گشتہ در شب بے چراغ
در ہر آئین صد نو آئین کار بین
گر سری ہست، افسری ہم بودہ است

مبدأ فیاض را مشر بنخیل نوز میریزد رطب ہا زان نخیل
 در جہاں سید پرستی دیں تست از ثنا بگزر دعا آئیں تست
 ایں سراپا فرہ و فرہنگ را سید احمد خان عارف جنگ را
 ہر چہ خواہد از خدا موجود باد پیش کارش طالع مسعود باد
 غالب کی بات سر سید احمد خاں کے دل میں بالآخر اتر گئی یا غالب کی دعا مبدأ فیاض نے قبول کرنی
 اور غالب کو سر سید احمد دے دیئے گئے۔

۳۔ تاہم بہت دیر ہو چکی تھی۔ ادھر غالب کا انتقال (1869) ہوا ادھر سر سید برطانیہ کے لئے
 روانہ (1869) ہوئے۔ برطانیہ کے قیام کے دوران انہوں نے برطانیہ میں راج، تعلیمی نظام، کو بغور
 دیکھا۔ برطانیہ اس وقت تعلیمی اصلاحات کے طوفانوں سے گزر رہا تھا۔ وہاں خود اصلاحات پر زبردست
 بحث چل رہی تھی۔ 1870 میں سر سید ہندوستان واپس آئے۔ برطانیہ سے واپسی پر ایک تعلیمی منصوبہ
 سر سید کے دماغ میں تشکیل پا چکا تھا۔ جو دو مرحلوں میں آگے بڑھا:

۱۔

"Committee for the Better Diffusion and Advancement of
 Learning Among Muhammadans of India" (CBDALMI)

کا قیام (۱۸۷۰)۔۔ اور

۲۔

Muhammadan Anglo-Oriental College Fund Committee

کا قیام (۱۸۷۲)۔

بالآخر 1875 میں مچڈن اینگلو۔ اورینٹل کالج کا قیام عمل میں آ گیا۔ 1876 میں سر سید نے وظیفہ
 یاب ہو کر مستقل طور پر علی گڑھ میں سکونت اختیار کر لی اور اپنی وفات (1898) تک اس منصوبہ کو کامیابی
 سے ہم کنار کرنے کے لئے کوشاں رہے۔

۴۔ سر سید نے علما کو یقین دلایا کہ گزشتہ دو سو سالوں کی کوتاہیوں کی تلافی اب بھی ممکن ہے۔ سر سید
 نے مسلمانوں کو سمجھایا کہ انہوں نے کم از کم دو سو سال ضائع کر دیئے ہیں۔ عربی، فارسی اور اردو کو بطور

ذریعہ تعلیم مسلم رکھتے ہوئے علماء برسر زمین مطلوب حقیقی ضرورتوں کے لئے افراد کار فراہم کرنے اور نوشہریت اور نوترادفیت کا سدباب کرنے میں ناکام رہے جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ پوری قوم ہولناک نتائج سے دوچار ہو گئی۔ سر سید نے پوری قوت سے علماء پر یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی کہ برسر زمین حقائق اور ان کے سبب وقوع پذیر تبدیلیوں کا اگر اب بھی ادراک کر لیا جائے تو تلافی مافات ممکن ہے۔ سر سید نے بھرپور یقین دلایا کہ یہ کام اب بھی ممکن ہے بلکہ متنبہ کیا کہ اگر ایسا اب بھی نہ کیا گیا تو اس کے بھیانک نتائج قوم کو بھگتنے ہوں گے۔ اب بھی موقع ہے مسلمان خود اپنے ہاتھوں اور اپنے زیر انتظام ایسے تعلیمی ادارے قائم کر لیں جن کے سہارے نوشہریت اور نوترادفیت کے مہلک اثرات سے نجات ممکن ہو۔ سر سید نے یہ بات بھی واضح کی کہ ایک ایسا نظام تعلیم جس کے ذریعہ اسلامی نظام تعلیم اپنی وحدت، وحدانیت اور خود کفالت مسلم رکھ سکے اور بہر صورت اس بدترین مہلک یعنی ”فکری، ذہنی، علمی اور تعلیمی نشوونما و ترادفیت“ کا شکار نہ ہو جو قوموں کو ہلاک کر کے رکھ دیتی ہے تشکیل دینا ناگزیر ہو گیا ہے۔ لیکن افسوس تاریخ کے ایسے نازک موڑ پر جب مسلمان اقتدار کھو چکے تھے اور مسلم معاشرت سرعت سے اپنی حیویت (Vitality) کھوتی جا رہی تھی علما نہ صرف یہ کہ ٹس سے مس نہ ہوئے بلکہ لٹے پوری شدت سے سر سید کے خلاف اٹھ کھڑے ہو گئے۔ علما نے سر سید کی تکفیر کی۔ انھیں زندیق، نیچری اور کافر قرار دے دیا۔ چنانچہ یہی وہ گھڑی تھی جب چودہ سو سال کی تکلیف (Conditioning) سے نسبتاً کم نقصان کے ساتھ باہر نکل آنے کا زریں موقع ہاتھ سے جاتا رہا۔ یہی سبب ہے کہ اس کے بعد ہمہ جہت ہلاکت مسلمانوں کی تقدیر بنا دی گئی۔ اس کے ذمہ دار صد فی صد ’علما‘ تھے۔ ’علما‘ نے اپنی روایتی ضد یا طبع میں بچے کچھے اسلام اور امت مسلمہ دونوں کا خاتمہ کر کے رکھ دیا۔

۵۔ 1858 کے بعد ہندوستان میں مسلمان منقسم ہو گئے۔ یہ تقسیم تاریخی اور بے نظیر تھی۔ 661 عیسوی سے چلی آرہی مسلم تاریخ میں آج تک ہسپانیہ کو چھوڑ کر امت کبھی اور کہیں ایسی آزمائش سے دوچار نہیں ہوئی تھی۔ ’علما‘ کو امت کی تاریخ کا کیا علم؟ انھیں اپنے اعمال کے مضمرات و عواقب کی کیا پرواہ؟ سر سید نے وہ خطرہ محسوس کر لیا جو شاید ہی ان کے کسی ہم عصر نے محسوس کیا ہو۔ ہندوستان میں سر سید جیسا عبقری باستحناے غالب شاید ہی ملت اسلامیہ میں پیدا ہوا ہو۔ اندلس صرف اس لئے اسپین بن گیا کہ وہاں پندرہویں صدی عیسوی میں کوئی سر سید پیدا نہ ہوا۔ 1737 عیسوی میں سر سید موجود نہیں تھے اس لئے فیض آباد، عظیم آباد اور حیدرآباد ترقی کر گئے۔ سر سید کا یہ کارنامہ تاریخ میں زندہ جاوید رہے گا کہ انھوں

نے Allygurh کو Aligarh بنایا۔ سرسید کے جانشین سرسید کی عبقریت کو کہاں پاسکے؟ کاش ان کے رفقاء مقررین میں سے کوئی عارف جنگ کا عشرِ عشر بھی ہوتا! بہر حال یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ امت مسلمہ بدایوں، مین پوری، متھرا، گڑگاؤں اور بالخصوص علی گڑھ اور بلند شہر کے زمینداروں کے احسانات کا بدلہ چکانے سے قاصر ہے۔ ممکن ہے مبداءِ فیاض کی رضا سے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ (1806-1869) کی روح پر فتوح نے ان زمینداروں کی ارواح طیبات پر تصرف کیا ہو۔ شیفتہ کے بارے میں غالب (1797-1869) نے کہا تھا:

غالب بہ فن گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او نوشت درد یواں غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نکرود

(۱۸۲۰-۲۹)

بھیکم پور، چھتاری، پہاسو، پنڈراول، محمود آباد وغیرہ کی قربانیاں اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ یا شاید امت نے ان کے احسانات کا بدلہ چکا دیا بایں صورت کے وہ سرسید اور ان کے نادر پوتے سرراس مسعود کی آخری آرامگاہ کی مجاورت سے علی گڑھ کے حق میں دست بردار ہو گئے۔ کیا علی گڑھ کے لئے یہ فخر کم ہے کہ وہاں امت مرحومہ کے یہ دونوں لعلِ فلک مدفون ہیں؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ آج پورا عالم اسلام اسپین صرف اس لئے نہ بنایا جاسکا کہ انیسویں صدی کے ہندوستان میں سرسید پیدا ہو گیا؟ اس عندلیب گلشنِ نا آفریدہ کی روح 1898 میں قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی مگر اس کے عہد کی آمد آمد ہے۔

۶۔ 1858 کے بعد نوثنویت (Neo-Dichotomy) مسلمانوں کا مقدر بن گئی۔ یہ نوثنویت افقی (Horizontal) ہوتی تو بسا غنیمت تھی۔ لیکن 'علما' کے ضد اد، تعنت اور عناد نے اسے پوری طرح عمودی (Vertical) بنا کر رکھ دیا۔ پوری ملت اسلامیہ عمودی طور پر (Vertically) دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ ثنویت کبھی تنہا وارد نہیں ہوتی بلکہ اپنے جلو میں لازماً ترادفیت (Dualism) لے کر آتی ہے۔ چنانچہ مسلمان نو ترادفیت (Neo-Dualism) کا بھی شکار ہو گئے۔ 1858 سے مسلمانوں کے مابین پیدا ہو جانے والی اس عمودی نوثنویت (Vertical Neo-Dichotomy) اور افقی نو ترادفیت (Horizontal Neo-Dualism) کے دو سنگین نتائج برآمد ہوئے:

۱۔ 'مدرسے' بحران کا شکار ہو گئے۔ دارالعلوم، دیوبند 1867 میں قائم ہوا۔ محمدن اینگلو۔ اورینٹل کالج، علی گڑھ 1875 میں قائم ہوا۔ دونوں پر حکمرانوں کی گہری نگاہ تھی۔ دونوں کے مضمرات و عواقب سے انہیں دلچسپی تھی۔ حاسدین کی سرسید پر ویسی ہی نگاہ تھی جیسی اہل بیت پر اہلیس کی۔ علما نے حسب روایت

مدرسوں کو مزید سیکڑ کر جوئے کم آب بنا دیا۔ مدرسے پہلے بھی کبھی 'بحر ذخاڑ'، مجمع البحرین اور 'ملتقى الابحار' نہیں رہے تھے۔ حکمران۔ علما تعہد نے کبھی اس کی اجازت نہیں دی تھی۔ یہ مدرسے کبھی بھی ملت اسلامیہ کی حقیقی ضرورتوں کو پورا کرنے والے نہیں رہے۔ یہ درست ہے کہ عامۃ المسلمین کو کبھی اس کا احساس یا ادراک نہیں ہوا۔ اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ حکمرانوں اور ملت کی بیشتر ضرورتیں خارجی اخذ (Outsourcing) سے پوری ہو جاتی تھیں۔ مسلم معاشرے میں رائج نظام تعلیم کے جس کی مکمل اجارہ داری 'علما' کے پاس تھی بدترین رول کو سمجھنے کے لئے صرف انشاء کی ان کتابوں کا جائزہ لے لینا کافی ہوگا جو سلطنت مغلیہ میں بیوروکریسی کی تربیت کے لئے تیار ہوئی تھیں جن کی فہرست مثلاً 'مقدمہ رقعات عالمگیری' [ملاحظہ فرمائیں: نجیب اشرف ندوی: مقدمہ رقعات عالمگیری: دارالمصنفین:] کے پیش لفظ میں دی گئی ہے۔

۷۔ گزشتہ بارہ سو سالوں سے 'علما' کی فکری، ذہنی، دماغی اور عملی حالت اور امت مسلمہ کے ساتھ ان کے تعامل کی صورتحال دراصل ان کی نفسیات کی عکاس ہیں۔ 'علما' کی نفسیات کے جدیدہ اصلی (Strand) کے تفصیلی تجزیے کی یہاں گنجائش نہیں تاہم انیسویں صدی عیسوی میں جب سر سید نے انھیں اصلاح حال کے لئے آواز دی اس وقت علما کی نفسیات کیا تھی، ان باتوں کی بہترین عکاسی ان مضامین میں ہوتی ہے جو علامہ شبلی نے لکھے اور اب مقالات شبلی میں وہ یکجا پائے جاتے ہیں۔ ان میں بالخصوص وہ مضامین جو جلد سوم میں یکجا ہیں۔ چونکہ ہر مضمون 'علما' کی نفسیات کے کسی نہ کسی دقیق پہلو کے تجزیے کے لئے بہت قیمتی مواد فراہم کرتا ہے اور یہ سب ایک ایسے صاحب قلم کا تحریر کردہ ہے جس کا شمار انیسویں صدی کے جہانزہ میں ہوتا ہے اس لئے یہ مضامین از اول تا آخر قابل مطالعہ ہیں۔ قابل ذکر مضامین درج ذیل ہیں:

- ۱۔ مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم
- ۲۔ مدرسے اور دارالعلوم
- ۳۔ قدیم تعلیم
- ۴۔ ملا نظام الدین بانی درس نظامی
- ۵۔ درس نظامیہ
- ۶۔ ندوہ اور نصاب تعلیم
- ۷۔ فن نحو کی مروجہ کتابیں

۸۔ تعلیم قدیم و جدید

۹۔ مشرقی کانفرنس

۱۰۔ ریاست حیدرآباد کی مشرقی یونیورسٹی اور

۱۱۔ احیاء علوم عربیہ اور ایک ریڈیکل (مقالات شبلی: جلد سوم: تعلیمی: سلسلہ دارالمصنفین: طبع دوم 1955)

۸۔ امت کی تاریخ میں 'علما' کا کردار بوجہ خصوصی تحقیق کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ کون ہیں؟ ان کی

حقیقت کیا ہے؟ انھیں کس نے پیدا کیا؟ ان کی 'طبع' کہاں سے پیدا ہوئی؟ وہ کہاں سے کسب فیض کرتی

ہے؟ 'علما' کو کن مقاصد کے تحت پیدا کیا گیا؟

امت کی تاریخ کے مطالعے سے 'علما' کی جو تصویر ابھرتی ہے اسے تین الفاظ میں بیان کیا جاسکتا

ہے: لفاظی، مبالغہ آرائی اور افسانہ طرازی۔ چنانچہ 'علما' کا حقائق اور تحقیق سے سخت نفور مسلم ہے۔ حقائق

سے واقف اور تحقیق کے خوگر لفاظی، مبالغہ آرائی اور افسانہ طرازی کر ہی نہیں سکتے۔ یہی سبب ہے کہ گزشتہ

بارہ سو سالوں کا اسلامی علمی اثاثہ (قرآن اور اقوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر) لفاظیوں، مبالغہ

آرائیوں اور افسانہ طرازیوں کا شاہکار ہے۔ چنانچہ 'علما' کے عزائم، منصوبوں اور کوششوں میں حقائق سے

نفور اور لفاظیاں، مبالغہ آرائیاں اور افسانہ طرازیاں بھلا اپنا اپنا رنگ کیوں نہ دکھلاتیں۔ حقائق سے بے

خبری اور تحقیق سے نفور 'علما' سے کیسے کیسے غلط اندازے قائم کرواتے ہیں اور ملت کے لئے رسوائیوں کے

کیا کیا سامان کرتے ہیں مسلمانوں کی تاریخ اس سے پر ہے۔ تقریب فہم کے لئے تین مثالیں پیش

خدمت ہیں۔ ان میں سے پہلی مثال 'علما' کی اپنے حوالے سے خوش فہمیوں سے متعلق ہے اور دوسری ایسی

بے حقیقت لفاظیوں، مبالغہ آرائیوں اور افسانہ طرازیوں کے انجام بد سے متعلق اور تیسری 'علما' کی

'حقیقت طبع' سے متعلق:

مثال اول: 'ندوة العلماء' کے پہلے دوسرے [خطبات شبلی سید سلیمان ندوی کے مطابق پہلے اور

حیات شبلی مصنفہ مصنف ہذا کے مطابق دوسرے اجلاس منعقدہ اپریل 1895 لکھنؤ (صفحہ ۲۵۶)]

اجلاس (منعقدہ کانپور ۲۲، ۲۳، ۲۴ اپریل 1894) کے پہلے دن مولانا شبلی کی معرکہ آرا تقریر:

قوم کی اخلاقی زندگی جو تمام ترقیوں کی جڑ ہے، قوم کی علمی حالت جس پر ترقی و تنزلی کا مدار ہے، قومی

مراجم و دستورات جن سے قوم بنتی یا بگڑتی ہے اور سب سے زیادہ قوم کی دماغی زندگی یعنی خیالات کی

وسعت، بلند حوصلگی، روشن ضمیری، آزاد خیالی ان تمام اوصاف کے سرچشمہ ہمارے علما

(ہیں).....

..... علما کو قوم پر وہ اختیار حاصل ہے کہ آج اگر تمام علما متفق ہو کر کمر بستہ ہو جائیں تو تمام ہندوستان میں اس سرے سے اس سرے تک یہ خانہ برانداز رسمیں یک لخت معدوم ہو جائیں.....
الحادود ہریت کی طرف میلان جو روز بروز عام ہوتا جاتا ہے..... لیکن ہمارے علما اگر معقول طریقہ پر اس کو روکنا چاہیں تو اسی طرح اس کا قلع قمع کر سکتے ہیں جس طرح یونانی فلسفہ کے پھیلنے کے وقت امام غزالی، امام رازی، قاضی عضد، ابن رشد نے زندقہ والحاد کا استیصال کر دیا تھا۔ ان باتوں سے ظاہر ہوا ہوگا کہ قوم کی زندگی کا بہت بڑا حصہ اب بھی علما ہی کا حق ملکیت ہے اور وہی اس حصہ کی فرماں روائی کے کامل الاختیار ہیں یا ہو سکتے ہیں.....

غرض اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ علما کو قوم پر اب بھی نہایت وسیع اختیارات حاصل ہو سکتے ہیں۔ ان اختیارات کے حاصل ہونے کی شاید علما کو ضرورت نہ ہو لیکن قوم کو اس کی ضرورت اور سخت ضرورت ہے کیوں کہ علما جب تک قوم کے اخلاق، قوم کے خیالات، قوم کے دل و دماغ، قوم کی معاشرت، قوم کا تمدن، غرض قومی زندگی کے تمام بڑے بڑے حصوں کو اپنے قبضہ اختیار میں نہ لیں گے، قوم کی ہرگز ترقی نہیں ہو سکتی۔

”اے حضرات! آپ کو معلوم ہے کہ یہی ندوۃ العلماء جس میں آپ اس وقت تشریف فرما ہیں، اگر اتفاق و اتحاد کے ٹھیک اصول پر قائم ہو جائے تو کتنی بڑی عظیم الشان طاقت بن سکتا ہے۔“
چنانچہ ۱۸۹۴ء پر اپریل ۱۸۹۴ء کو مولانا شبلی نے چار تجویزیں پیش کیں:

پہلی تجویز : موجودہ طریقہ تعلیم قابل اصلاح ہے۔

دوسری تجویز : تمام مدارس کے مہتممین کا ہر سال ندوۃ العلماء میں اجلاس ہونا۔

تیسری تجویز : تین دارالعلوم (یونیورسٹی) بنا کر سارے ملک کے مدارس کو اس سے مربوط کرنا۔

چوتھی تجویز : مدرسہ فیض عام یعنی مجوزہ ایک دارالعلوم کی توسیع میں معاونت۔

مثال دوم: سینتالیس سال بعد (1943) مولانا شبلی، کی ’کامل الاختیار‘ یعنی ’حضرات علما کے کرامت‘

کی تاثیر اور بنیادی پہلی تجویز کے انجام پر سید سلیمان ندوی کا تبصرہ:

”غور کا مقام ہے کہ یہ وہ تجویزیں ہیں جو عربی تعلیم کی اصلاح اور عربی مدرسوں کی تنظیم کے

لئے آج سے سینتالیس برس پہلے پیش کی گئی تھیں اور سینتالیس برس کے بعد ہم آج اسی وادی

تہ میں حیران و سرگرداں ہیں۔“

[ملاحظہ فرمائیں: سید سلیمان ندوی: حیات شبلی، صفحہ ۲۵۵]

مثال سوم: حیرت اور تعجب ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی کی نگاہ سے تذکرۃ الرشید مرتبہ مولانا محمد عاشق الہی میرٹھی نہیں گزری! مولانا عاشق الہی کی کتاب ’تذکرۃ الرشید‘ فروری ۱۹۰۸ میں شائع ہو گئی تھی۔ تذکرۃ الرشید جلد دوم کے آٹھویں حصے میں مولانا رشید احمد گنگوہی کے معنوی کمالات کا تذکرہ ہے:

”جن دنوں ندوۃ العلماء اپنی ابتدائی شان و شوکت کا دل آویز لباس پہن کر اٹھا اور اہل اسلام نے عموماً اور بہترے مخلصین اللہ والوں نے خصوصاً اسکی ضرورت اسکا استحسان اور اسکی خوبیاں تسلیم کر کے شمولیت اختیار کی تھی حضرت امام ربانی نے موافقت نہیں فرمائی ہر چند کہ آپ کی صدارت و سرپرستی پر زور دیا گیا۔ خود مولانا مولوی محمد علی صاحب ناظم ندوہ یہ درخواست لیکر منظوری کی سعی فرمانے کے لئے گنگوہ کے عازم ہوئے مگر جب دیوبند پہنچے تو حضرت نے کہلا بھیجا کہ ”اس ارادہ سے گنگوہ کا قصد نفرماویں کیونکہ میں شامل ہرگز نہ ہوں گا۔ گنگوہ جو کچھ کرنی ہو دیوبند میں مولانا محمود حسن صاحب یا سہارنپور میں مولانا خلیل احمد صاحب سے کر لیں۔“ آخر ناظم صاحب کو سہارنپور ہی سے واپس ہونا پڑا اور حضرت یا آپ کے متعلقین شامل نہوے پر نہوے چونکہ ندوۃ العلماء کے عالی و بلند ارادوں اور مقاصد عظمیٰ کی اولوالعزمیوں میں اس وقت کسی کو واہمہ یا شک بھی نہیں ہو سکتا تھا اسلئے حضرت کے بعض واقفین نے عرض بھی کیا کہ صاحبزادہ صاحب اور حضرت مولانا دیوبندی کو اجازت عطا فرماویں کہ شریک جلسہ سالانہ ہو جائیں مگر آپ نے بذریعہ تحریر انکو آگاہ فرمایا ”مجھے معلوم کرایا گیا ہے کہ انجام اسکا بنخیر نہیں اسواسطے میں اپنی طرف سے کسی کو اجازت نہیں دے سکتا۔“ کسی کو کیا خبر تھی کہ بہترے کام ابتداء میں حسین بنکر ابرتے اور چند روز بعد متغیر و متنکر ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور اسکا ادراک بہت ہی دقیق بصیرت کا منصب ہے یا کشف و الہام کے ساتھ وابستہ ہے چنانچہ کچھ عرصے بعد مولانا سید محمد علی صاحب کو بھی مستعفی ہونا پڑا اور سنت مصطفویہ کے متمسکین اہل اسلام نے دیکھ لیا کہ جس خاص مضمون کے سبب مسلمانوں کے قلوب ندوہ کی جانب کھینچتے تھے وہ بات اسمیں نہ رہی مبادی کیا تھے اور ثمرات کیا پیدا ہوئے مقصود اور علت غائی کیا تھی اور نتیجہ و آل کار کیا ظاہر ہوا۔

دیوانہ بہار دید گفتا کہ دے است در شیشہ گلاب دید گفتا کہ مے است

ہر کس بزبان حال سرے گفتند جنبیدن ہر کسے از انجاست کہ وے است

[مولانا عاشق الہی میرٹھی: تذکرۃ الرشید: جلد دوم صفحہ ۲۰۵: مطبوعہ ناظم کتب خانہ اشاعت العلوم،

محلہ مفتی سہارنپور 1977]

۹۔ مناسب لگتا ہے اس سے متعلق وہ عبارت نقل کر دی جائے جو حامد حسن قادری (1887-1964)

نے داستان تاریخ اردو (1938) میں تحریر فرمائی ہے:

”ندوۃ العلماء سے تعلق: بعض اہل الرائے ذی علم بزرگوں نے ۱۸۹۴ (۱۳۱۱ھ) میں علما

کی ایک انجمن ”ندوۃ العلماء“ کے نام سے قائم کی تھی۔ اس جماعت کا مقصد یہ تھا کہ عربی مدارس کے نصابِ تعلیم اور طریقہ تعلیم کی اصلاح کی جائے، عام مسلمانوں کی اصلاح کے لئے تدابیر اختیار کی جائیں، علمائے ہند کے باہمی اختلاف و نزاع کو رفع کیا جائے اور ایک ایسا دارالعلوم قائم کیا جائے جس میں علوم قدیمہ کے علاوہ فنون جدیدہ اور صنعت و حرفت کی بھی تعلیم دی جائے۔

سب سے پہلے مولوی عبدالغفور صاحب ڈپٹی کلکٹر نے (جو بعد کو مدارالمہام ریاست رام پور ہو گئے تھے) یہ تجویز پیش کی۔ اکثر علمائے تائید کی، اور مولانا سید محمد علی صاحب کانپوری (خلیفہ حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ) کے مبارک ہاتھوں سے اس کی بنیاد رکھی گئی۔ مختلف شہروں میں ہر سال اس کے جلسے ہوتے تھے۔ مولانا عبدالحق صاحب دہلوی مؤلف ”تفسیر حقانی“ اور مولانا شبلی نے اس کے قواعد مرتب کئے۔ ۱۸۹۸ء میں مولانا شبلی کی رائے کے مطابق ایک مدرسہ بھی جاری کر دیا گیا۔ رفتہ رفتہ اس میں ترقی ہوتی رہی۔ کتب خانہ بھی اس کے ساتھ قائم کیا گیا۔ اس کے ناظم اول مولوی سید محمد علی صاحب تھے۔

علامہ شبلی علی گڑھ سے قطع تعلق کرنے کے بعد ندوۃ العلماء سے خاص دلچسپی لینے اور اس کی خدمت کرنے لگے تھے۔ مولوی سید محمد علی صاحب کی وفات کے بعد حیدرآباد سے آکر اس کے ناظم ہو گئے ندوہ کی حالت اس زمانے میں نہایت سقیم تھی۔ گورنمنٹ بدگمان تھی۔ ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہو چلا تھا۔ مولانا نے ایسی سخت محنت اور ایسی اعلیٰ خدمت کی کہ ندوہ کو از سر نو زندہ کر دیا۔ لیکن علما مولانا کے مذہبی خیالات و عقائد سے مطمئن نہ تھے، ہمیشہ مخالفت کرتے رہے۔ آخر ان کو بددل ہو کر ۱۹۱۳ء میں ندوہ سے دستکش ہونا پڑا۔ مولانا شرر لکھنوی اسی مضمون میں لکھتے ہیں:

”میں نے بارہا ان کو اس خیال سے روکا، اور اس زمانے میں ان سے کہہ دیا تھا کہ علما بس میں

آنے والے نہیں ہیں۔ ان مرحومین امت میں سے ہر ایک پریسیڈنٹ کی حیثیت رکھتا ہے اور جس زمانے

میں فقط پریسیڈنٹ ہی پریسیڈنٹ ہوں، اس آئیہ کریمہ لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا“ (21:22) [ترجمہ: اگر آسمان وزمین میں ایک اللہ کے سوا دوسرا خدا ہوتے تو یہ دونوں ہی تباہ ہو جاتے۔] پوری پوری صادق آتی ہے۔ ان کے بہت سے دوستوں نے بھی روکا اور کہا کہ آپ کی ترقی کا میدان علیکڈھ کالج ہی ہے۔ مگر انھوں نے نہ مانا اور نتیجہ یہ ہوا کہ گوانھوں نے ندوہ کو بے حد فائدہ پہنچایا اور ندوہ کو ندوہ بنا دیا۔ مگر آخر ندوہ والے مرحومین امت ہی کے ہاتھ سے مار کھا گئے، جس کا ان کے دوستوں کو بے حد ملال ہوا اور وہ بھی اپنی اس محنت کے اکارت جانے پر کفِ افسوس ملتے ہوئے مرے۔“

[ملاحظہ فرمائیں: حامد حسن قادری: داستان تاریخ اردو: صفحہ ۲۶-۲۸: ۱۹۳۱]

۱۰۔ سید سلیمان ندوی کی عبارت ”ہم آج اسی وادی تیبہ میں حیران و سرگرداں ہیں“ — نہایت ’بلغ‘ اور ’پر معنی‘ ہے۔ عاجز کا خیال ہے کہ اس عبارت کی تشریح پوری ایک کتاب کی متقاضی ہے۔ تاہم اگر کوئی صاحب ’ہمت‘ تذکرۃ الرشید مرتبہ مولانا عاشق الہی میرٹھی جلد اول میں ’تفقہ و افتاء‘ کے عنوان کے تحت درج اس مراسلت کی تحقیق کر لے جو مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا اشرف علی تھانوی کے مابین ہوئی۔ [ملاحظہ فرمائیں: تذکرۃ الرشید جلد اول صفحات: 137-112] تو قوی امید ہے کہ وہ سید صاحب کے مفہوم کو پالے گا۔

۱۱۔ مسلم حکمرانوں کے عہد میں بھی ’علما‘ کے یہ مدارس مسلمانوں کی محض ان ضرورتوں کی تکمیل کرتے تھے جو پورے ’نظام‘ کی محض پانچ فیصد ضرورتوں کے برابر تھی۔ مسلم عوام پچانوے (95%) فیصد امورِ حیات میں مکلف (Conditioned) بنا کر رکھ دیئے گئے تھے۔ رہی حکمرانی کی ضرورتیں تو انھیں حکمران خارجی اخذ (Outsourcing) سے پوری کر لیا کرتے تھے۔ امتِ مسلمہ ان سے کلیۃً نابلد اور الگ تھلگ رکھی گئی تھی۔ 1858 کے بعد عظیم مسلم حکمران معدوم ہو گئے۔ نصف ملت عمودی طور پر منہدم ہو چکی تھی۔ علما عصر اور عصری بحران سے یکسر لا تعلق ہو کر اپنے خود ساختہ خول (Cocoon) میں بند ہو گئے اور پوری قوم کو زمانے کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا یا پھر انھیں بھی اپنی طرح عصر اور عصری بحران سے یکسر لا تعلق ہو کر خول (Cocoon) میں بند ہو جانے کی ترغیب دی۔ قوم خارجی طوفان سے زیادہ اس داخلی زلزلے سے بے دم ہو رہی تھی جس کا اسے اب سامنا تھا۔ تیرہ سو سالوں سے مکلف (Conditioned) رکھی گئی قوم اچانک تکلیف سے باہر لادی گئی تھی۔ جیسے کوئی Freezing Point سے اچانک Boiling Point پر لادیا جائے۔ اس قوم کی مثال اس شخص کی طرح ہو گئی تھی جو طویل عرصے تک تاریک تہ خانے

میں بند ہو جہاں رہتے رہتے برسوں اس نے روشنی کی ایک کرن بھی نہ دیکھی ہو اور اب اچانک سورج کی چلچلاتی دھوپ میں اسے باہر لادیا گیا ہو۔ اسے کچھ بھائی دے رہا تھا نہ کسی چیز کو دیکھنے کی اسے تاب تھی۔

۱۲۔ دوسری جانب 'علما' نے سر سید کے خلاف طوفان اٹھا کر اور انہیں زندیق، نیچری اور کافر قرار دے کر مسلمانوں کے 'اصلاح احوال' کی ہر راہ بند کر دی۔ سب سے بڑا نقصان اسلام کے ارتقائی نظام تعلیم کو پہنچا جس کی تشکیل کرنے کا منصوبہ سر سید کے پیش نظر تھا۔ مفاہمت، مصالحت اور موافقت کی ہزار کوششوں کے باوجود سر سید علما کو شریک کار کرنے یا کم از کم سید راہ نہ بننے پر راضی نہ کر سکے۔ 'علما' کی اس ضد نے امت کو ہلاکت سے دو چار کر دیا۔ محمدن اینگلو اور نیشنل کالج کے ذریعہ سر سید "ارتقائی اسلامی تعلیمی نظام" وضع کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ زمانہ سنت اللہ کے تحت متبدل ہے۔ وہ کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ وہ کسی کی رعایت نہیں کرتا۔ نوح کا بیٹا ہو، لوط کی بیوی ہو یا فرعون! سنت اللہ کی مخالفت سب کے لئے لہجوں میں فیصلہ کن بن جاتی ہے۔

سر سید کے ذہن و فکر میں یہ بات واضح تھی کہ علما کی ضد اور امت میں ان کا رسوخ بالآخر پوری امت کو ہلاکت سے دو چار کر دیں گے۔ چنانچہ سر سید نے سراسر امت کی خیر خواہی میں علما کی ضد کے سامنے سپر رکھ دیا۔ ممکن ہے انہیں علما کے کسی طبقے سے 'حسن ظن' ہو۔ ممکن ہے انہیں عامۃ المسلمین کی سادگی پر ترس آیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مسلمانوں کے سر پر ہلاکت کی گھٹادیکھ کر انہوں نے اپنے منصوبے میں تبدیلی گوارا کر لی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سر سید نے غیر منظور قوتوں کا ادراک کر لیا ہو۔ بہر حال سر سید اس بات پر راضی ہو گئے کہ 'وحدانی ارتقائی اسلامی تعلیمی نظام' کی بجائے اضافی (Additional) اور تکمیلی (Integrative) اسلامی تعلیمی نظام پر سہ دست اکتفا کر لیں تاکہ عمودی نوعیت اور افقی نوعیت پر ادنیٰ ترین طور پر عارض نہ ہو جائیں۔

۱۳۔ سر سید کا 'علما' سے 'حسن ظن' عملی اجتہاد تو قرار دیا جاسکتا ہے لیکن وہ 'غلط' نادرست اور 'قرآنی تاریخ' کے خلاف تھا۔ 'علما' ناقابل تبدیل ہوتے ہیں۔ روئے ارض پر اللہ تعالیٰ نے ایسی کوئی 'حکمت' پیدا نہیں کی ہے جو 'علما' کو تبدیل کر دے۔ اب تک صرف 'عذاب الیم' اور 'رسل' ہی ان کی 'تادیب' کرتے آئے تھے۔ 'عذاب الیم' جداگانہ امر ہے۔ رہی بات 'رسولوں' کی تو قرآنی تاریخ یہی بتاتی ہے کہ رسول بھی علما کی 'تادیب' نہیں کرتے۔ وہ انہیں صرف Deauthorized, Desacralized اور Desanctioned کر دیتے ہیں۔ وہ بھی وقتی طور پر۔ 'علما' رسولوں کے سامنے وقتی طور پر بظاہر

Tamed ہو کر لیکن جلد ہی Metamorphosed شکل میں نمودار ہو کر اسی رسول کی سنتوں کو پامال کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ حکمرانوں کی کیا مجال کہ وہ انبیاء کو قتل کرتے۔ ان کے پاس اس کا جواز ہوتا تھا نہ یہ بات ان کے مفاد میں ہوا کرتی تھی۔ انبیاء کے قتل کا جواز تو علماء فراہم کرتے تھے اور الزام حکمرانوں کے سر جاتا تھا۔ روئے ارض پر معرکہ خیر و شر اصلاً نام ہے رسولوں اور علماء کے مابین معرکہ کا۔

ممکن ہے سر سید نے قرآنی آیات ”ارباباً من دون اللہ (التوبہ ۳۱)“، ”سواء علیہم اندرتہم ام لم تنذرہم (البقرہ ۶)“ اور ”ولا تکنوا اول کافرہ (البقرہ ۳۱)“ کی کوئی قابل فہم تاویل کی ہو۔ مگر اس کا کچھ بھی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ علماء اپنی ضد پر قائم رہے۔ ان کی ضد نے امت کو ہلاکت سے دوچار کر دیا۔

۱۳۔ عاجز کی ناقص رائے میں سر سید کے رویے یعنی ان کا انقباض (Withdrawal)، ان کی مفاہمت (Compromise) اور ان کا حسن ظن (Favourable Opinion) خلاف حکمت تھے۔ ’مفاہمت‘ کسی منصوبے کا ستون نہیں بن سکتی۔ یہ ایک تدبیر ہے اور اس کا استعمال صرف قلیل المدت منصوبوں میں کیا جاسکتا ہے۔ اور وہ بھی محض Surgical Operation کے بطور، خواہ اثباتی مقصد کے لئے ہو یا سلبی مقصد کے لئے۔ طویل المدت منصوبوں (Long Term Planning) میں ’مفاہمت‘ خود کشی کے مترادف ہے چہ جائے کہ طویل الطویل منصوبوں (Perspective Planning) میں اس کا استعمال۔ سر سید کی منصوبہ بندی طویل منصوبہ بندی (Long Term Planning) کب تھی؟ وہ تو Perspective Planning تھی۔ ایسی منصوبہ بندی میں انقباض، مفاہمت اور حسن ظن صد فی صد بے معنی ہیں۔

ان نامساعد حالات سے جن میں سر سید گھر چکے تھے، نکلنے کی، عاجز کی رائے میں، صرف دو ہی راہیں تھیں:

۱۔ اندرونی انقباض (Internal Withdrawal) — اور

۲۔ تعبیری حرکیت (Virtual Mobilization)۔

اندرونی انقباض (Internal Withdrawal): سر سید کو اپنے منصوبے کے حوالے سے صد فی صد استقامت کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔ ایسے حالات میں انھیں ہر قسم کی مفاہمت کو کلیتہً رد کرتے ہوئے عملی اقدامات کرنے چاہیے تھے۔ بلاشبہ ان عملی اقدامات میں وہ ’اندرونی انقباض‘ (Internal

(Withdrawal) کے منہج (Methodology) پر عمل کرتے۔ عاجز کی رائے میں وہ مدرسۃ العلوم یا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے عملی قیام کے اقدامات نہ کرتے بلکہ تفکیر، تدبیر اور تعمیل میں سے تدبیر اور تعمیل کو آنے والے دنوں کے لئے اٹھا رکھتے اور صرف تفکیر پر اپنی بقیہ زندگی کھپا دیتے۔ آنے والی نسلیں اس تفکیر کی روشنی میں تدبیر اور تعمیل کرتی رہیں۔ عاجز کی رائے ہے کہ 661 عیسوی کے بعد امت مسلمہ میں 'عملی تفکیر' کرنے والا ایسا عبقری جیسا سر سید تھے پیدا نہیں ہوا۔ کاش 'عملی تفکیر' کا کام وہ پورا کر جاتے۔

تعبیری حرکیت (Virtual Mobilization): بصورت دیگر سر سید کو اپنے منصوبے کے حوالے سے صد فی صد استقامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے برصغیر کو خیر آباد کہہ کر یورپ بالخصوص لندن منتقل ہو جانا چاہیے تھا۔ سر سید کا یہ عمل نبی آخر الزماں ﷺ کے تتبع میں ویسا ہی عمل ہوتا جیسے ہجرت۔ آنحضرت ﷺ بیت اللہ چھوڑ کر یثرب چلے گئے تھے۔ خواہ چھوٹے سے چھوٹے پیمانے پر ہی سہی اسی منصوبے کو رو بہ عمل لاتے لیکن لندن، پیرس یا برلن میں۔ ان کے لئے لندن سب سے مناسب جگہ تھی۔ عاجز کے خیال میں سر سید کو لندن میں اور سید محمود کو کیمبرج یا آکسفورڈ میں مستقل سکونت اختیار کر لینی چاہیے تھی۔ کاش ایسا ہو جاتا تو دنیا کی صورت قطعاً وہ نہ ہوتی جو آج ہے۔

عاجز کی رائے ہے کہ اگر ان دونوں راہوں میں سے کوئی راہ بھی سر سید اختیار کر لیتے تو امت مسلمہ کی تاریخ کا یہ 'عبقری بروز' اس کرب ناک اذیت اور الیے سے دو چار نہ ہوتا جس سے سر سید، سید محمود اور سر اس مسعود دو چار ہوئے۔

۱۵۔ عاجز اب تک تاریخ میں واقع ہونے والے اس قسم کے 'حدوث' (Eventuation) کو سمجھنے سے قاصر ہے کہ آخر ایسا کیوں کر ہو جاتا ہے یا ایسا کیوں نہیں ہوتا؟ عاجز حیران ہے کہ غالب سے بھی ویسی ہی اجتہادی غلطی (?) سرزد ہوئی۔

۱۔ کاش اسد اللہ خاں 1810-11 میں اکبر آباد سے نقل مکانی کر کے دہلی میں آباد ہونے کی بجائے کلکتہ جا کر آباد ہو جاتے۔ یا

۲۔ کاش مرزا غالب 1826-27 میں اپنے مقدمات کی پیروی کے بہانے کلکتہ جانے کی بجائے لندن چلے جاتے۔ یا

۳۔ مرزا غالب نے 1858 میں قاطع برہان لکھ کر 1862 میں لکھنؤ سے چھپوایا۔ کاش انہوں نے یہ کتاب لندن میں لکھی اور وہیں سے چھپوائی ہوتی۔

مضمرات و عواقب

۱۔ یوں تو 1858 کے بعد زندگی کے ہر میدان میں اور معاشرے کی ہر سطح پر ہندوستان میں مسلمان اس عمودی نوشنویت (Vertical Neo-Dichotomy) کے طوفان کے تھپیڑے کھانے لگے تھے لیکن 1870 آتے آتے حالات بے حد سنگین اور راسخ ہو گئے۔ سرسید کے مدرسۃ العلوم اور اینگلو محمدان اورینٹل کالج کے قیام کی تحریک روایتی عمودی نشنویت (Traditional Vertical Dichotomy) اور روایتی افقی تراادفیت (Traditional Horizontal Dualism) سے زیادہ عمودی نوشنویت اور افقی نو تراادفیت کی مزاحمت کا شکار ہو گئی۔ عاجز کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ سرسید اس بات سے کیسے بے خبر رہے یا باخبری کے بعد اسے کیوں کر نظر انداز کر دیا کہ ان کی مخالفت میں عمودی نوشنویت اور افقی نو تراادفیت آکھڑی ہوئی ہیں اور روایتی عمودی نشنویت اور روایتی افقی تراادفیت کی تمام قوتیں بھی ان کے مخالفین کا ہی ساتھ دے رہی ہیں اور ان کے پیچھے صف آرا ہیں۔ مثلاً:

۱۔ سرسید کی سب سے پہلی مخالفت اس اولین کمیٹی کے ارکان نے کی جن میں سمیع اللہ خاں اور میر اکبر علی تھے۔ یہ دونوں اشخاص عمودی نوشنویت اور افقی نو تراادفیت کے نمائندے تھے اور تا حیات رہے۔ لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ روایتی عمودی نشنویت اور روایتی افقی تراادفیت کی تمام قوتیں ان کے ساتھ ہمہ دم ان کی پشتیبان رہیں۔

۲۔ سر سید کی دوسری مخالفت ان دو افراد کی جانب سے ہوئی جنہیں سر سید کے دست ہای چپ و راست کہا جاسکتا ہے۔ یعنی اناوہ کے نواب محسن الملک محمد مہدی علی اور امر وہہ کے نواب وقار الملک مشتاق حسین۔ یہ دونوں افراد بھی عمودی نوشنویت اور افقی نوترادفیت کے نمائندے تھے اور تاحیات رہے۔ لیکن یہاں بھی روایتی عمودی ثنویت اور روایتی افقی ترادفیت کی تمام قوتیں ان کا ہمہ دم ساتھ دیتی رہیں۔

۳۔ سر سید کی تیسری مخالفت ان دو افراد کی جانب سے ہوئی جنہیں علی بخش خاں اور سید امداد علی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ دونوں اشخاص بھی عمودی نوشنویت اور افقی نوترادفیت کے نمائندے تھے لیکن یہاں بھی روایتی عمودی ثنویت اور روایتی افقی ترادفیت کی ساری قوتیں ان کا ہمہ دم ساتھ دیتی رہیں۔ قابل غور امر یہ ہے کہ ان دونوں افراد کو برطانوی حکومت نے حسن کارکردگی کے لئے نوازا۔ حکومت برطانیہ نے سید امداد علی کو سر کا خطاب عطا کیا اور سب حج علی بخش کو انگریزی تعلیم عام کرنے کے صلے میں خصوصی اعزاز سے نوازا گیا۔

اپنے قیام (1875) سے آج تک مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ اسی صورتحال کا بدترین شکار ہوتی چلی آئی ہے۔ گزشتہ ایک سو سینتیس سال میں ہمیشہ عمودی نوشنویت اور افقی نوترادفیت اس کے مٹانے کے درپے رہیں اور روایتی عمودی ثنویت اور روایتی افقی ترادفیت کی تمام قوتیں ان کی پشتیبان بن کر ان کا ساتھ دیتی رہیں۔

سر سید کی ارتقائی اسلامی نظام تعلیم کی تحریک کے جس کا اساسی تجربہ گاہ اینگلو محمدن اور پنٹل کالج تھا اور اب مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ہے۔ کم از کم چار ادوار شمار کئے جاسکتے ہیں:

- ۱۔ عمودی نوشنویت اور افقی نوترادفیت کے لرزے (Tremors) کا پہلا دور (1875-1920)
- ۲۔ عمودی نوشنویت اور افقی نوترادفیت کے لرزے (Tremors) کا دوسرا دور (1920-1947)
- ۳۔ عمودی نوشنویت اور افقی نوترادفیت کے لرزے (Tremors) کا تیسرا دور (1947-1970)
- ۴۔ عمودی نوشنویت اور افقی نوترادفیت کے لرزے (Tremors) کا چوتھا دور (1970-2012)
- ۲۔ عمودی نوشنویت اور افقی نوترادفیت کے پہلے دور (1875-1920) کے زمینی حقائق اور مسلم

جواب عمل کے نتائج:

الف۔ عمودی ثنویت اور افقی تراذیت کا طبقہ (مدرسہ جاتی طبقہ):

- ۱۔ متشددانہ اور مکمل منفی اور سلبی رویہ کا اظہار۔
- ۲۔ حصول علم و حصول معلومات کے عصری ذرائع سے مکمل انقطاع یعنی Potential اور Actual استعداد سے کلی صرف نظر۔
- ۳۔ ارتقائی اسلامی نظام تعلیم وضع کرنے کی تحریک یعنی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کا مکمل بائیکاٹ۔

۴۔ عمودی ثنویت اور افقی تراذیت کے نمائندہ طبقے میں موجود چند فہم اشخاص سے مدارس کی مکمل تطہیر۔

(الف) ندوہ تحریک کی کم از کم تین مرحلوں میں تطہیر، مولانا احمد رضا خاں کی مخالفت، مولانا رشید احمد گنگوہی کا بائیکاٹ، مولانا شبلی کا اخراج اور مولانا سید سلیمان ندوی کا ندوہ سے رخصت ہونا۔

[ملاحظہ فرمائیں:]

- ۱۔ مولوی محمد یحییٰ تہا: سیرا لمصنفین محولہ حامد حسن قادری: تاریخ زبان اردو۔
- ۲۔ پروفیسر محمد مجیب: The Indian Muslims: London, 1967 آخری چھ ابواب۔
- ۳۔ سید سلیمان ندوی: حیات شبلی: دارا لمصنفین، اعظم گڑھ۔
- ۴۔ سید سلیمان ندوی: مکاتیب شبلی جلد اول: بنام مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی۔
- (ب) مدرسہ الاصلاح کا مقاطعہ، ذمہ داران مدرسہ کے رجوع اور علمائے دیوبند کو یقین دہانی کے بعد مدرسہ الاصلاح کی حلقہ علمائے جزوی قبولیت اور تشفی نامہ کا اجرا۔
- ۵۔ عوام، متوسط اور اعلیٰ طبقات بالخصوص ارباب حل و عقد حتی کہ سرخیل اکابر ملت کی عصری حالات، حوادث، واقعات، تزویرات، فکری جہتوں اور ملکی، قومی اور عالمی پالیسیوں سے مکمل بے خبری۔ پوری ملت کا لاعلمی کے خود ساختہ (Cocoon) میں بند ہو جانا۔

۶۔ مقامی، علاقائی، ملکی، عالمی تبدیلیوں، فکری، علمی، تحریکاتی کشمکش، سیاسی، علمی، معاشی اور ثقافتی انقلابات سے مکمل بے خبری کے نتیجے میں حوادث اور ان کی پیش بینی اور پیش

بندی کے حوالے سے مکمل بے حسی۔ اکابر ملت کے ذریعہ قوم کو غلط آگہی کی فراہمی۔
نا درست رویوں کا اظہار۔ غیر عملی اور جذباتی اقدامات اور رد عمل۔ نتیجہ بدترین
نا کامیاں، ذلت، کرب نا کی اور بے بسی۔

(ب) عمودی نوٹنویت اور افقی نو ترا د فیت کا طبقہ (عصری علوم کا طبقہ بالخصوص اینگلو محمدن
اور پینٹل کالج):

۱۔ اسلامی علوم اور معلومات کی گہری واقفیت رکھنے والی ہستیوں کی فکری اور علمی کاوشوں
کا متنازعہ فیہ بن جانا۔

۲۔ ایسی ہستیوں کے متنازعہ فیہ بن جانے سے قوم کے حساس لوگوں کے بڑے طبقے کا
بھی جیص بیص میں مبتلا ہو جانا اور اس صورتحال میں مسلمانوں کا متحدہ اور منظم فیصلہ
کرنے کی قوت، صلاحیت اور امکانات سے عاری ہو جانا۔

۳۔ سر سید، چراغ علی اور نذیر احمد جیسے عبقری اہل علم کی فکری اور خلاقانہ تخلیقات کے
بہاؤ کارک جانا۔

۴۔ حالی کی 'مسدس' جیسی عظیم اور عدیم النظیر تخلیق کا متنازعہ فیہ بن جانا۔ حالی جیسی
عبقری، فکری اور علمی شخصیت کے فکری اور علمی انبجار کا ٹھنڈ کر رہ جانا۔

۵۔ سر سید، حالی، چراغ علی اور نذیر احمد کی اولین خلاقانہ تخلیقات کے رک جانے سے
ثانوی اور ثلثی تخلیقات یعنی تزکیہ مزید (Refinements) کے امکانات کا ہمیشہ کے
لئے ختم ہو جانا۔

۶۔ ارتقائی اسلامی نظام تعلیم کی تحریک کا ختم ہو جانا۔

۷۔ علما کی مخالفت کے پیش نظر خود ارتقائی اسلامی نظام تعلیم کے علم برداروں کے ذریعہ
اضافی اور تکمیلی اسلامی نظام تعلیم کے اختیار کر لینے سے اسلامی علوم و معلومات کے
اولین ماخذ تک تبدیلی سطح (Change of Scale) کے ذریعہ رسائی کی ساری
استعداد، امکانات اور مواقع سے محروم ہو جانا۔

۸۔ اس صورتحال میں متجانبی قوتوں اور جذبوں کے تعامل سے رفتہ رفتہ گہرے اسلامی
علوم سے عدم واقفیت میں اضافہ ہو جانا۔

۹۔ عصری علوم کے اداروں میں ایسے مسلم خواص (Muslim Elite) کی نئی نسل کی نمائندگی میں اضافہ ہو جانا جو اسلام، اسلامی حیات اور اسلامی حیویت کے گہرے امور سے جزوی باخبری یا لاعلمی کے سبب نیم بے حسی کا شکار ہو چکی تھی۔

۳۔ عمودی نوعمویت اور افقی نوترادفیت کے دوسرے دور (1920-1947) کے زمینی حقائق اور مسلم جواب عمل کے نتائج:

۱۔ عمودی شنوویت اور افقی ترادفیت کا طبقہ (مدرسہ جاتی طبقہ):

۱۔ تشدد دانہ اور مکمل منفی اور سلبی رویہ کا اظہار کرنا۔

۲۔ حصول علم اور حصول معلومات کے عصری اور ہمہ دم ترقی پذیر ذرائع سے مکمل انقطاع یعنی Potential اور Actual استعداد سے کلی صرف نظر کرنا۔

۳۔ ہمہ دم اور سرعت کے ساتھ متبدل عصری حالات اور حوادث، ان کی تفصیلات، پس منظر، منظر ناموں، Data، Facts، ان کے مضمّنات اور عواقب کے ادراک اور فہم کی Potential اور Actual استعداد سے مکمل طور پر محروم ہو جانا۔

۴۔ عوام، متوسط اور اعلیٰ طبقات بالخصوص ارباب حل و عقد حتیٰ کہ معروف اکابر ملت کا عصری حالات، حوادث، واقعات، تزویرات، امکانات، ممکنات، ظاہر، ظہور پذیر اور زیر آب فکری جہتوں، ملکی، قومی، عالمی پالیسیوں سے مکمل بے خبر ہونا اور پوری ملت کا لاعلمی کے خول (Cocoon) میں بند ہو جانا۔

۵۔ عوام، متوسط اور اعلیٰ طبقات بالخصوص ارباب حل و عقد کا حقائق پر مبنی اور قابلیت عمل (Feasibility) کے حامل ملی منصوبوں، ان کو رو بہ عمل لانے کی استعداد اور معلوم و لا معلوم مزاحمت کے پیش نظر اس کی متبادل صورتوں سے خالی الذہن ہونا۔

۶۔ علما کا عامۃ المسلمین کو غلط اطلاعات، تعبیرات اور تصریحات کر کے گمراہ کرنا۔

۷۔ علما کی غلط اطلاعات، تاویلات، تعبیرات اور تصریحات کے سبب مسلمانوں کی ہمہ دم اور سرعت کے ساتھ وقوع پذیر ہونے والے حوادث پر مکمل بے حسی۔ ان حوادث کے تعلق سے منصوبوں، استعداد اور توجیہ سے قطعاً عاری اور خالی الذہن ہونے کے سبب نادرست، منفی، سلبی، رجعی اور جذباتی رویوں کا اظہار اور اسی کے زیر اثر اقدامات اور

رد عمل۔ نتیجہ بدترین ناکامیاں، تصادم، تزاوم، ذلت، کرب ناکی، کسروا نکسار اور بے بسی کا طاری ہونا۔

۸۔ علمی میدان میں اسلامی علوم اور اس کی گہرائی اور گیرائی سے مکمل انقطاع۔ اسلامی علوم کی نمائندگی کرنے والے طبقے کی خود اسلامی علوم سے مکمل لاعلمی۔ اسلامی علمی ذخائر، ماخذ، منابع اور مصادر اور بالخصوص اولین مصادر سے لاعلمی۔ علما کی تخلیقات کا حقائق، شعور اور فکر کے اعتبار سے از حد سطحیت، لفاظی، جذباتیت اور غیر سنجیدگی کا شکار ہو جانا۔ ہندوستان کے طول و عرض میں بکھرے لاکھوں مصادر سے مکمل غفلت اور بے اعتنائی چنانچہ ان کا ضائع ہو جانا۔

۹۔ اسلامی اور مسلم معاشرت کا عملاً ختم ہو جانا۔

۱۰۔ علما کے ذریعہ اسلام کے الدین عند اللہ الاسلام ہونے، آنحضرت ﷺ کے رحمۃ للعالمین ہونے اور اسلام کے کائناتی، آفاقی، انسانی، ملی، مللی اور عالمی ہونے کے احساسات اور ان کے تقاضوں کے مطابق اعمال و آداب سے مکمل برداری۔

۱۱۔ اس کے برعکس محدود ترین، غیر اسلامی، غیر انسانی، غیر اخلاقی، عصبیتی، فرقہ وارانہ مسلکی اور مشربی خود ساختہ اسلام سے مکمل وابستگی، یک جہتی اور ہم آہنگی۔

ب۔ عمودی نوٹھویت اور افقی نو ترادفیت کا طبقہ (عصری علوم کا طبقہ بالخصوص مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ):
۱۔ ارتقائی اسلامی نظام تعلیم کی تشکیل کی کاوشوں کے ساتھ ساتھ اس کے عزم، خاکوں اور تصور کا مکمل خاتمہ ہو جانا۔

۲۔ علی گڑھ تحریک یعنی عصری علوم حاصل کرنے کے پر عزم اور با مقصد جذبے کا مکمل خاتمہ۔

۳۔ چنانچہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں فکری (Ideological) اور جہتی (Accelerative & Directional) خلا (Chaos) نتیجہ فکری پراگندگی اور ژولیدہ فکری۔

۴۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں اس خلا (Chaos) کو پر کرنے کے لئے متعدد خارجی فکری اور جہتی قوتوں اور افکار کا بزور و تزویر داخلہ (Gatecrash, Break-in and Breaking & Entering)۔

۵۔ مختلف فکری جہتوں کی کشاکش کی صورت میں رد عمل۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تحریک کا

آغاز، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے علیحدگی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سیاسی قوتوں کے Cross Current کے نرغے میں۔ نتیجہ ارتجالی، ارتجالی اور ارتدانی رد عمل۔

[ملاحظہ فرمائیں:]

۱۔ عبدالغفار مدہولی: جامعہ کی کہانی: مطبوعہ کونسل برائے فروغ اردو زبان 2004: اس کتاب کا

پہلا باب اس صورتحال کی بہترین عکاسی کرتا ہے جس میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا۔

۲۔ پروفیسر محمد مجیب: خانہ جنگی 1976۔

۳۔ ڈاکٹر ذاکر حسین: کچھوا اور خرگوش: نیشنل بک ٹرسٹ 1970۔

۴۔ پروفیسر محمد مجیب: ہندوستانی مسلمان: بطور خاص آخری باب: تترہ: مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغ اردو: اردو ترجمہ۔

۵۔ پروفیسر محمد شبیر خاں: ذاکر صاحب کی شخصیت میری نظر میں: خدا بخش لائبریری جرنل: 50: 1989۔

۶۔ پروفیسر مجیب رضوی: پیچھے پھرت کبت کبیر کبیر..... اور دوسرے مضامین: دلی کتاب گھر: دہلی 2009۔

یہ چھ کتابیں مضامین جامعہ ملیہ اسلامیہ کی حقیقت سمجھنے کے لئے ناگزیر ہیں۔

۶۔ عصری تعلیم گاہوں اور بالخصوص مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے فارغین میں اولین اسلامی اور اولین مشرقی علوم تک رسائی دلانے والے علوم اور ان کے فہم کی استعداد کا فقدان۔

۷۔ عالمی اور مغربی ذرائع علوم سے بڑھتی ناواقفیت، چنانچہ عصر حاضر اور بالخصوص مغرب کو جاننے کے لئے ثانوی اور ثلثی ذرائع پر تکیہ کرنا۔ مغرب کے ناقص (Corrupt)، Edited اور Tailored علم (Bullshit Stuff) تک رسائی۔

۸۔ مغرب کے ثانوی اور ثلثی ذرائع کے Exposure کے سبب اسلام بیزاری، سطحی اور طفلانہ نوعیت کی مغرب پسندی کا ظہور۔

۹۔ علوم و فنون کے تمام شعبوں میں ایجابی و سلبی، مثبت و منفی اور رد و قبول ہر شش جہات کے اعتبار سے اعلانیہ، غیر اعلانیہ اور زیر لب شعوری اور تحت شعوری طور پر مغرب کو کسوٹی

سمجھ لینا۔

۱۰۔ اسلام کے جزوی اور روایتی فہم اور مغرب کی سطحی واقفیت کے سبب مغربیت [مغربی نیشنلزم (Western Nationalism)، فیبین سوشلزم (Fabian Socialism)، اشتراکیت (Socialism)، اشتمالیت (Communism)، نہیلزم (Nihilism)، الحاد (Atheism) اور اباحت (Epicureanism)] کا ظہور۔

۱۱۔ عصری علوم سے وابستہ طبقے اور مراکز کا انتشار ذہنی اور ثولیدہ فکری کا نگار خانہ بن جانا۔ بہ حیثیت مجموعی ان حوادث کے سبب مدرسہ جاتی اور مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ہردو طبقات کے زیر اثر پوری امت کا ذہنی، دماغی، فکری، علمی، تجرباتی، عملی اور اخلاقی طور پر پہلے Second Fiddle بن جانا۔ اور کچھ ہی دنوں میں حالات کے جبر سے ان کا پوری طرح Trifle، Trivial اور Chattel بنا دیا جانا جس کا استعمال کبھی Scapegoat کے بطور ہوتا تو کبھی بزکشی کی بکری کی طرح۔

۱۲۔ عمودی نومنویت اور افقی نوترادفیت کے تیسرے دور (1947-1970) کے زمینی حقائق اور

مسلم جواب عمل کے نتائج:

(الف)

(۱) عمودی نومنویت اور افقی نوترادفیت کا طبقہ (مدرسہ جاتی طبقہ):

۱۔ برسر زمین حقائق کے ادراک کے Potential اور Actual استعداد سے کلی طور پر عاری ہو جانا۔

۲۔ اسلامی علوم (دین اللہ کے علوم) کے ادراک کے Potential اور Actual استعداد سے کلی طور پر عاری ہو جانا۔

۳۔ مذہبی، مسلکی اور مشربی اسلام سے مکمل طور پر وابستہ ہو جانا۔

۴۔ علانیہ، غیر علانیہ، خاموش اور بالواسطہ ارتداد کی طرف چلا جانا۔

۵۔ مذہبی، مسلکی اور مشربی اسلام سے وابستہ طبقے کا نئے حالات میں تشخص کے لئے رسوم کی افزائش کا سہارا لینا۔

۲۔ عمودی نوشنویت اور افقی نوترادفیت کا طبقہ (عصری علوم کا طبقہ بالخصوص مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ):

۱۔ برسر زمین حقائق کے ادراک کے Potential اور Actual استعداد سے کلی طور پر عاری ہو جانا۔

۲۔ اسلامی علوم کے ادراک کے Potential اور Actual استعداد سے کلی طور پر عاری ہو جانا۔

۳۔ اسلام دین اللہ اور اسلام مذہب کے جوہری فرق کی تمیز سے لاعلم ہو جانا۔

۴۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کا عدیم النظیر Shock کی گرفت میں چلا جانا۔ اس کی Psyche پر غیر معمولی اثرات کا مرتب ہونا:

(الف) پہلے Psyche کا Inversion میں چلا جانا۔

(ب) پھر Inversion کا Inanimation کا روپ دھار لینا۔

(ج) پھر Inanimation کا Insulation میں بدل جانا۔

(د) پھر Insulation کا Hibernation میں بدلتا ہوا محسوس ہونا۔

(ه) پھر Hibernation کا Introversion میں بدل جانا۔

(و) پھر Introversion کا Delirium میں بدل جانا۔

۵۔ اسی عدیم النظیر Shock کے زیر اثر مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے بعض شعبوں کی نفسیات کا

Delirium سے بدتر ہو کر Delirium Tremens کی حالت میں چلا جانا۔ بعض

شعبوں کے بعض افراد کا Nerdish ہو جانا۔ یہی وہ زمانہ (1947-1970) تھا جب

ملت اسلامیہ میں بالعموم اور مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں بالخصوص ان دونوں طبقات

(عمودی شنویت اور افقی نوترادفیت کا طبقہ اور عمودی نوشنویت اور افقی نوترادفیت کا طبقہ)

کے باہم عمل اور رد عمل نے مسلمانوں میں ایک مخصوص قسم کی جینیاتی قلب ماہیت

(Genetic Modification) کے عمل کا آغاز کیا۔ چنانچہ ہندوستان میں امت مسلمہ

کی عصری نسل مقلوب ہو کر (Genetically Modified) ایک نئی نوع (Specie)

بن گئی۔ جینیاتی طور پر مقلوب (Genetically Modified) اس نوع (GMS)

سے دو ذیلی انواع (Sub-Species) ظہور پذیر ہوئیں:

۱۔ اس جینیاتی مقلوب نوع (GMS) سے ظہور پذیر ہونے والی پہلی ذیلی نوع (Sub-Specie) کا نام تھا مشرقی خواص کی نسل [Generation of Eastern Strands (GES)]

۲۔ اس جینیاتی مقلوب نوع (GMS) سے ظہور پذیر ہونے والی دوسری ذیلی نوع (Sub-Specie) کا نام تھا مغربی خواص کی نسل [Generation of Western Strands (GWS)]

(ب)

۱۔ مشرقی خواص کی نسل (GES): یہ پہلی جینیاتی مقلوب نوع (GMS) تھی جس کا غالب عنصر ایسے افراد یا پس منظر رکھنے والے افراد پر مشتمل تھا جو مذہبی ثقافت سے وابستہ تھے۔ یہ جینیاتی مقلوب نسل (GMS) کلیۃً Vulgarised نسل کی صورت میں ظہور پذیر ہوئی۔ دیکھتے دیکھتے اس کے اثرات Overactive Vector کی طرح نئی نسل میں سرایت کر گئے۔ اس جینیاتی مقلوب نسل (GMS) نے آٹا فانا اپنے زیر اثر آنے والے ہر فرد اور اجتماعیت کو عمودی اور افقی ہر دو اعتبار سے Vulgarised کر کے رکھ دیا۔ اس جینیاتی قلب ماہیت (Genetic Modification) میں سب سے بڑا رول ان دو تحریکوں کا ہے جو بیسویں صدی کے نصف اول میں ظاہر ہوئیں۔ یہ دو تحریکیں تھیں مولانا محمد الیاس کاندھلوی (1884-1944) کی 'تبلیغی جماعت' (1927) اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (1903-1979) کی 'جماعت اسلامی' (1941)۔ چونکہ 'تبلیغی جماعت' وسعت، حرکت اور عمومیت کے اعتبار سے 'جماعت اسلامی' سے ہر اعتبار سے فائق تھی اس لئے اس کا دائرہ اثر جماعت اسلامی سے بہت وسیع، عریض، عوامی اور ہمہ گیر ہو گیا۔ برصغیر کی امت مسلمہ میں سب سے مہلک اثرات اسی قلب ماہیت (Genetic Modification) کے برآمد ہوئے۔ امت کا بڑا حصہ ان کے زیر اثر Vulgarised ہو کر اس قابل ہو گیا کہ خود اسلام کی تشکیل جدید کر ڈالے۔ چنانچہ ان کے ذریعہ اسلام کی تشکیل جدید کر دی گئی۔ اسلام دینِ آخرت (Islam the way towards Future) کی بجائے اسلام دینِ عاجلت (Islam the way for the Present) بن کر رہ گیا۔ حال

(Present) سرے سے کوئی مدت نہیں بلکہ اس نقطے اور کیفیت کا نام ہے جہاں اور جب مستقبل ماضی میں بدل جاتا ہے۔ ایک کیفیاتی لاشی (Nothingness) کا نام حال ہے۔ حال سے وابستہ افراد اور قومیں ایسی بے جان حاشیہ نشین (Marginalised) اشیا کی مانند ہیں مثلاً شاہراہ کے کنارے پڑے پتھر جن کے بالکل پاس سے یا جن کو روندتے ہوئے وقت کا قافلہ گزر جاتا ہے۔ بالخصوص 'تبلیغی جماعت' نے اپنے متاثرین کے Genome میں قرآن و سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے Gene کو پوری طرح Neutralise کر کے رکھ دیا۔ چنانچہ امت کی کثیر آبادی کھلی ذہنی دنائت کی طرف راغب ہو گئی۔ 'جماعت اسلامی' نے اس کیفیت کو دو آتشہ کر دیا۔ چنانچہ اس کے دو متخالف اور عجیب و غریب مظاہر سامنے آئے۔ 'تبلیغی جماعت' بظاہر Monolithic برقرار رہی جب کہ 'جماعت اسلامی' Trivium بن گئی۔

۲۔ مغربی خواص کی نسل (GWS): یہ دوسری جینیاتی مقلوب نوع (GMS) تھی جس کا غالب عنصر ایسے افراد یا پس منظر رکھنے والے افراد پر مشتمل تھا جو دوسرے اور تیسرے درجے کے مغربی ذرائع اور مصادرِ علم سے مستفید اور از حد متاثر تھے۔ یہ جینیاتی مقلوب نوع (GMS) کلیۃً Lumpenized نسل کی صورت میں ظہور پذیر ہوئی۔ دیکھتے دیکھتے ان کے اثرات بھی Overactive Vector کی طرح نئی نسل میں سرایت کر گئے۔ اس جینیاتی مقلوب نسل (GMS) نے آنا فانا اپنے زیر اثر آنے والے ہر فرد اور اجتماعیت کو عمودی اور افقی ہر دو اعتبار سے Lumpenized کر کے رکھ دیا۔ لیکن اس کے بدترین اثرات عمودی کم اور افقی زیادہ برآمد ہوئے۔ اس جینیاتی قلبِ ماہیت (Genetic Modification) میں سب سے قابل ذکر رول ان تین تحریکات کا ہے جن کا آغاز بیسویں صدی کے نصف اول میں ہوا۔ یہ تین تحریکات تھیں:

۱۔ تحریک نیشنلزم (Movement of Nationalism)

۲۔ تحریک سوشلزم (Movement of Socialism)

۳۔ تحریک کمیونزم (Movement of Communism)

برصغیر میں بڑی تعداد میں آباد دو مذاہب کے ماننے والوں۔۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی نئی

نسل یکساں نہیں تھی۔ گزشتہ دو سو سالوں میں بوجہ ان دونوں کے مابین بہت بڑا فرق واقع ہو چکا تھا۔ بالخصوص وہ فرق جو ان دونوں کی اشرافیہ اور اعلیٰ طبقات کے مابین واقع ہوا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اعلیٰ طبقات معاشرتی اور معاشی اعتبار سے تقریباً یکساں تھے لیکن ذہنی، فکری اور علمی اعتبار سے دو مختلف انواع بن چکے تھے۔ وہ ایک ہی معاشرے میں پڑوسیوں کی طرح رہتے اور بعض اوقات اور بعض افراد ایک جیسے تعلیم گاہوں میں پڑھتے لیکن ان سب باتوں کے باوجود دو الگ الگ سطحوں کے حامل ہو چکے تھے۔ یہ تبدیلی آنے والے دنوں میں بڑی دور رس نتائج کی حامل ہوئی جس کا ادراک سر سید کے علاوہ شاید ہی کسی نے کیا تھا۔ گزشتہ دو سو سالوں میں ان دونوں مذاہب کی نئی نسل میں درج ذیل تبدیلیاں واقع ہو چکی تھیں:

۱۔ نئی اعلیٰ ہندو نسل Highbrow ہو چکی تھی۔ جب کہ نئی اعلیٰ مسلم نسل ابھی تک Lowbrow تھی۔

۲۔ نئی اعلیٰ ہندو نسل Intellektuelle ہو چکی تھی۔ وہ Geistig تھی۔ Zeitgeist سے وہ باخبر تھی۔ چنانچہ اب وہ Wibbегierig تھی۔ نئی اعلیٰ ہندو نسل کا علمی طبقہ Weltliteratur سے مربوط ہو چکا تھا۔ اس کے احساسات اب Weltmannisch تھے۔ انہوں نے اپنی قوم اور Weltgeschichte کے مابین نقاط التقا اور سطح ارتباط ڈھونڈ لیا تھا۔ لہذا پوری قوم Weltgewandt ہو چکی تھی۔ ان کے اعلیٰ دماغ Weltbekannt ہو کر Weltmacht کے اندرونی Strands سے بخوبی واقف ہو چکے تھے۔

۳۔ اس کے بالکل برخلاف نئی اعلیٰ مسلم نسل اب تک Lumpig تھی۔ وہ انفرادی اعتبار سے Lumpenpack اور اجتماعی اعتبار سے Lumpensammler تھی۔ نئی اعلیٰ مسلم نسل بحیثیت مجموعی Geistlos تھی۔

۴۔ نئی متوسط ہندو نسل Middlebrow ہو چکی تھی جب کہ نئی متوسط مسلم نسل ابھی تک Conditioned تھی۔

۵۔ نئی پس ماندہ ہندو نسل Receptive ہو کر Reciprocator ہو چکی تھی۔ جب کہ نئی پس ماندہ مسلم نسل Retardant تھی۔

۶۔ نئی اعلیٰ ہندو نسل میں پیدا ہونے والے عباقرہ — پوری قوم میں معروف ہی نہیں بے حد مقبول ہو چکے تھے۔ اس کے برخلاف نئی اعلیٰ مسلم نسل میں پیدا ہونے والے عباقرہ یا تو مسلمانوں میں غیر معروف رہے یا ملعون، مردود، زندیق اور کافر قرار دے دیئے گئے۔ اس طبقے میں تمام مسلم عباقرہ کا شمار ہو سکتا ہے جن میں غالب، سر سید، حالی اور اقبال سر فہرست ہیں۔ غالب، سر سید اور حالی اگر عنادل گلشنِ ناز آفریدہ ہیں تو اقبال کے چھ خطبات 'ورقِ ناخواندہ اور لفظِ ناشیدہ'۔

نئی متوسط ہندو نسل کا Middlebrow ہو جانا اس 'عظیم انقلاب' کا بنیادی سبب تھا جس نے تاریخ کا رخ بدل دیا۔ نئی متوسط ہندو نسل میں درج ذیل باتیں ظہور پذیر ہوئیں:

۱۔ وہ دیکھتے دیکھتے Repertoire اور Repository بن گئی۔

۲۔ نئی متوسط ہندو نسل رضا کارانہ طور پر نئی اعلیٰ نسل کے لئے بالعموم اور اپنے عباقرہ کے لئے بالخصوص Transponder کا کردار ادا کرنے لگی۔

۳۔ نئی متوسط ہندو نسل Translator, Transmitter اور Transliterator کا کردار ادا کرنے لگی۔

۴۔ بعض اوقات حسب ضرورت نئی متوسط ہندو نسل نے Transmuter کا کردار ادا کرنے میں بھی دیر نہیں کی۔

۵۔ بعض اوقات حسب ضرورت نئی متوسط ہندو نسل نے اس سے آگے بڑھ کر Replicator کا کردار تک ادا کر دیا۔

۸۔ نئی متوسط ہندو نسل کے برخلاف نئی متوسط مسلم نسل حسب سابق 'Conditioned' رہی۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ مسلمانوں میں مغربی خواص کی نسل (GWS) تین تحریکوں — نیشنلزم، سوشلزم اور کمیونزم کے ذریعہ جینیاتی قلبِ ماہیت (Genetic Modification) کا نتیجہ تھی۔ یہ تینوں طبقات ارتجاعی (Reactive) تھے۔ یہ ایک حقیقت ہے اور اس کا اعتراف کیا جانا چاہئے کہ اس انبوہ میں شامل سارے اذہان یکساں نہ تھے۔ ان میں بعض اہل علم اور سنجیدہ، بعض اہل علم مگر جذباتی، بعض کم علم مگر سنجیدہ، بعض کم علم اور اس پر مستزاد بے حد جذباتی، بعض جذباتی اور مجرد ارتجاعی (Reactionary)

لیکن اکثر ذہین اور حساس تھے۔ ممکن ہے ان کا ایسا رد عمل مسلمانوں میں صدیوں سے چلے آ رہے 'عمودی' ثنویت اور 'افقی' ترادفیت کے ناروا رویوں کے سبب ہو جو یقیناً اسلام کی نمائندگی نہیں کر رہے تھے اور ایسا رویہ اختیار کرنے میں وہ حق بجانب بھی ہوں لیکن ان کا مغربی رجحانات (نیشنلزم، فیسبین سوشلزم، کمیونزم، ڈیما کریسی، سیکولرزم، ترقی پسندی، اباہیت اور الحاد) سے ہم آہنگ ہو جانا محض سطحی (Superficial)، ثانوی (Secondary) اور ثلثی (Tertiary) پروپیگنڈا لٹریچر (Propagandistic Literature) سے متاثر ہو کر تھا۔ ان میں گہرائی نہ تھی۔ عاجز کو کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ اس طبقے کے ذہین، صاحب علم اور حساس لوگوں کو التباس ہو گیا۔ دور سے آرہی آوازیں انھیں مانوس لگیں اور وہ اس کے گرویدہ ہو گئے جب کہ وہ آوازیں خود ان کے اندرون سے نکلے ہمہس کی بازگشت تھیں۔ ان طبقات میں شامل مسلم افراد میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے مغرب کا عمیق و ہمہ گیر مطالعہ کیا ہو۔ یہ افراد لاکھ مخلص سہی لیکن عاجز کے علم کی حد تک ان میں ایسا کوئی بھی نہیں تھا جو مغرب کے عمیق و ہمہ گیر مطالعہ کی قوتی استعداد (Potential Capability) کا حامل ہو۔ یہ بات بخوبی سمجھی جاسکتی ہے کہ جب کسی میں قوتی استعداد (Potential Capability) ہی مفقود ہو تو پھر اس کی حقیقی استعداد (Actual Capability) زیر بحث ہی نہیں آتی۔ چنانچہ ان افراد میں ایسا کوئی بھی نہیں تھا جو ان علوم سے براہ راست واقف ہو جن میں مغرب میں عہد وسطیٰ اور ما بعد عہد وسطیٰ میں ہونے والے واقعات و حادثات کے اولین ماخذ اور ان میں پایا جانا والا Source Material محفوظ و مخزون ہیں۔ مثلاً یونانی، کوئی، لاطینی، بطریق، پروٹینکل، اطالوی، عبری وغیرہ۔ یہ وہ ذرائع ہیں جن کی اپنی اپنی خصوصیات اور پیچیدگیاں اور رعایات ہیں جن سے واقفیت کے بغیر سولہویں، سترھویں، اٹھارویں اور انیسویں صدی کے مغرب میں ہونے والے جملہ واقعات و حوادث کا ادراک کرنا سرے سے ممکن ہی نہیں۔ اسی طرح اٹھارہویں صدی سے انیسویں صدی کے آخر تک کا عرصہ مغرب بالخصوص مغربی مغرب یعنی جرمن، فرینچ اور اینگلو سیکسن علاقے (Germanic, French and Anglo-Saxonic Regions) میں علمی انفجار (Intellectual Explosion) کا نقطہ کمال ہے۔ چنانچہ اس عہد کے علمی انفجار کو حقیقی معنوں میں ہضم (Digest) کرنے

اور اس کا درست ادراک کرنے کے لئے کم از کم دس عالمی رتاریخی زبانوں کا گہرا علم درکار ہوتا ہے۔ ظاہر ہے ہندوستان کی نئی اعلیٰ اور متوسط مسلم نسل میں سرے سے یہ صلاحیت مفقود تھی۔

[ملاحظہ فرمائیں: مسلمانوں کی نئی نسل کے ذہنی احوال جاننے کے لئے]

- ۱۔ پروفیسر محمد مجیب: ہندوستانی مسلمان: باب ۲۲-۲۳۔
 - ۲۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی مولانا محمد علی جوہر کی ڈائری۔
 - ۳۔ ڈاکٹر محمد حسن: غمِ دل و حشمتِ دل: تخلیق کار پبلیشرز، دہلی 2003
- یوں تو ڈاکٹر حسن کی کتاب اس عہد میں مسلم نوجوانوں کی ذہنی سطح اور ان میں پائی جانے والی کشمکش کی بہترین عکاس ہے۔ تاہم اس کے ابواب: شہرِ طرب رومانوں کا، ایک انوکھا سفر، بازگشت، مشعلوں کا جلوس ناقابل فراموش ہیں۔
- (ج) حقیقی سرزمین پر مسلمانوں کی مکمل راندگی (Expulsion):

مسلمانوں میں ان دونوں جینیاتی مقلوب نسلوں (GMS's) یعنی مشرقی خواص نسل (GES) اور مغربی خواص نسل (GWS) کے ظہور نے دو احوال پیدا کئے جن میں اول الذکر داخلی تھا اور آخر الذکر خارجی۔

۱۔ داخلی تعامل: ان دونوں طبقوں میں اول الذکر مشرقی خواص نسل (GES) نے ایک جانب بالعموم عوام کو اور بالخصوص تعلیم یافتہ نوجوان نسل کو مکمل طور پر Vulgarised کر کے رکھ دیا تو ثانی الذکر مغربی خواص نسل (GWS) نے دوسری جانب بالعموم متمول اور اعلیٰ طبقات کو اور بالخصوص متوسط طبقے کی تعلیم یافتہ مسلم نسل کو مکمل طور پر Lumpenised کر کے رکھ دیا۔ چنانچہ بحیثیت مجموعی ملت کے تعلیم یافتہ افراد کے نوے فیصد انسانی وسائل (Human Resources) Vulgarised اور Lumpenized ہو کر بالکل مفلوج ہو گئے جس کے سبب پوری ملت ژولیدہ فکر اور Paralyzed ہو کر رہ گئی۔

۲۔ خارجی تعامل: دنیا میدانِ حوادث (Arena of Events) ہے جہاں مسلسل اور بے شمار حوادث ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ بہت سی قوتیں، ان کے افکار اور استعدادیں باہم متعامل ہو کر ہر لمحہ Cross-Curren کا سماں پیش کرتی ہیں جن کے Criss-Cross سے نئے نئے حوادث جنم لیتے رہتے ہیں۔ دو قوتوں، ان کے افکار اور استعدادوں کے صدے پہلے Collateral اور پھر

Multilateral اثرات ڈالتے ہیں جن سے ایسی ظاہرات وجود میں آتی ہیں جو Multiplex ہوتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ افراد اور قوموں کے لئے ہر لمحہ فیصلہ کن ہوتا ہے۔ ہر لمحہ ان کی بقا یا فنا کا فیصلہ صادر کرتا ہے۔ چنانچہ افراد ہوں یا اقوام انھیں ہر لمحہ مستعد اور برسر عمل رہنا ناگزیر ہے۔ اس میدانِ عمل میں Second Fiddle بن جانے پر راضی ہو جانا موت کی جانب سفر کو سرعت عطا کر دیتا ہے۔ اس میدانِ حوادث میں تماشِ بینی خودکشی کے مترادف ہے۔ ست گامی ناقابل معافی جرم ہے۔ مجرم کو کچل دیئے جانے کی سزا ملتی ہے۔

بد قسمتی سے امت مسلمہ ان تینوں جرائم کی مرتکب ہو گئی۔ چنانچہ Second Fiddle بننے، تماشِ بینی کرنے اور ست گام ہونے کی اسے سزا دی گئی۔ ہر میدان میں مسلم قوم Marginalized کر دی گئی۔ تاریخ کا ہر فیصلہ معقول (Rational) ہوتا ہے۔ ایسے فیصلے اٹل ہوتے ہیں۔ انھیں تاریخی فیصلوں کی ایک جہت ہے:

”Marginalized قوم کے عواقب“۔ یہ عواقب اٹل ہیں:

”تاریخ کسی حاشیہ نشین (Marginalized) قوم کو باعزت طور پر زندہ اور محفوظ رہنے کی اجازت نہیں دیتی“۔

یہ ضروری نہیں کہ ہر حال میں اس کا سبب معاندت (Hostility) ہی ہو۔ روئے زمین اور اس پر موجود مستقر اور متاعِ قلیل (Scarce) ہیں۔ لہذا سابق (Competition) یہاں ایک فطری ظاہرہ اور تقاضا ہے۔ ہمہ دم اور ہمہ گیر جاری اس سابق (Competition) کے سبب Marginalized قوم بے رحمی سے کچل دی جاتی ہے۔ ٹھیک یہی حادثہ امت مسلمہ کے ساتھ بھی پیش آیا۔ امت زندگی کے ہر میدان میں بے رحمی سے کچل ڈالی گئی۔

۵۔ عمودی نوشنویت اور افقی نوترادفیت کے چوتھے دور (1970-2012) کے زمینی حقائق اور مسلم جواب عمل کے نتائج:

عمودی نوشنویت اور افقی نوترادفیت کے چوتھے دور کا آغاز ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک ’فتنہ‘ کے ظہور کے ساتھ ہوا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس ’فتنہ‘ کے ظہور نے تیسرے دور کا خاتمہ اور چوتھے دور کا آغاز کر دیا۔ اس ’فتنہ‘ کا نام ہے ’ہندوستانی مسلمانوں کے معاشرے کا بہ حیثیت مجموعی پیٹرو ڈالر سوسائٹی‘ (Petro-Dollar Society) میں تبدیل ہو جانا۔ ملت کے افق اور منظر نامے پر اس کا ظہور

’صبح کاذب‘ کی طرح تھا جسے حاشیہ نشیں (Marginalized) اور روند ڈالی گئی (Trampled) ملت اسلامیہ نے ’صبح صادق‘ مان لیا۔ اس ’فتنہ‘ نے پوری ملت کی پچی کھچی ’حیویت‘ (Vitality) کے پرچے اڑا دیئے۔ یہ ’فتنہ‘ مشرق وسطیٰ میں ’تیل کے استعماری استعمال‘ (Colonial use of oil) سے پیدا ہوا۔ مشرق وسطیٰ میں ’تیل کا استعماری استعمال‘ خود اس ’فتنہ‘ کا حصہ تھا جسے ’فتنہ عظیم‘ (The Great Trial) کہا جاتا ہے۔ اس ’فتنہ‘ (تیل کے استعماری استعمال) کے مقاصد تھے:

۱۔ مشرق وسطیٰ میں چچا نام (Uncle Tom) پیدا کرنے کی زسری کا قیام۔

۲۔ مشرق وسطیٰ میں ایسی معلق معیشت (Hanging Economy) کا قیام جس کے اندر معاشیات، عمرانیات اور تاریخ کے کسی اصول کی کار فرمائی نہ ہو۔

۳۔ مشرق وسطیٰ میں تعبیری معاشرہ (Virtual Society)، تعبیری ثقافت (Virtual Culture) اور بالآخر تعبیری ریاست (Virtual State) کا قیام۔

چنانچہ اس ’فتنہ‘ (تیل کا استعماری استعمال) کی خصوصیات تھیں:

۱۔ معاشی، عمرانی اور تاریخی اصولیات، تدریج، ترجیحات اور ان سے متعلق اصولیات کی صریح خلاف ورزی کا ماحول۔

۲۔ فکری، علمی، تجرباتی، فنی اور ادارہ جاتی اصولیات، تدریج، ترجیحات اور ان سے متعلق اصولیات کی صریح خلاف ورزی کا ماحول۔

۳۔ علم، فنون، اہل علم و فن اور علم و فن کی قدروں کی صریح ناقدری۔

۴۔ پہلے مشرق وسطیٰ میں پھر اس سے راست مربوط دنیا میں انسانیت اور معاشرت نہاد علم اور ثقافت (Humanity & Society-Based Knowledge & Culture) کی بجائے مالی منفعت نہاد علم اور ثقافت (Monetary Earning Based Knowledge & Culture) کا انہجار۔

چنانچہ اس ’فتنہ‘ کے ظہور کا براہ راست اثر ہندوستانی مسلمانوں پر بالعموم اور مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے تعلیم یافتہ اور ہنرمند مسلم انسانی وسائل پر بالخصوص ہوا۔

۱۔ ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیم یافتہ اور ہنرمند افراد بالعموم اور مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے تعلیم یافتہ اور ہنرمند بالخصوص جوق در جوق بلکہ فوج در فوج مشرق وسطیٰ منتقل ہونے لگے۔

۲۔ اس کے جلو میں ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیم یافتہ اور ہنرمند افراد بالعموم اور مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے تعلیم یافتہ اور ہنرمند افراد بالخصوص اکثر براہ مشرق وسطیٰ اور بعض براہ راست امریکہ منتقل ہونے لگے۔

۳۔ ہندوستان کے حقیقی میدانِ عمل سے تعلیم یافتہ اور ہنرمند افراد میل ظاہر ہونے والا نقل مکانی (Migration) کا یہ عمل نیا اور مہلک تھا۔ اس سے قبل ہندوستان میں مسلمانوں نے تین تاریخی نقل مکانی کا تجربہ کیا: پہلا: دہلی پر نادر شاہ کے حملے سے سقوطِ دہلی کے مابین (1737-1804)۔ دوسرا: 1857 کے بعد اور آخری: 1947 کے بعد۔ یہ تینوں اجتماعی نقل مکانی از روئے حقیقت اندرونی نقل مکانی (Internal Migration) تھے۔ مشرق وسطیٰ میں 'تیل کے استعماری استعمال' کے نتیجے میں ظاہر ہونے والا نقل مکانی اندرونی نہیں بلکہ عملاً خروج (Exodus) تھا۔ اس خروج میں کئی مہلکے پنہاں تھے۔

۴۔ پہلی مہلک بات یہ تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیم یافتہ اور ہنرمند افراد کا یہ خروج (Exodus) غیر مستعد (Unprepared) غیر منصوبہ بند (Unplanned)، متعین و متوحد مقصد سے عاری (Without identified & unified objective) اور بے ہدف (Untargetted) تھا۔

۵۔ دوسری مہلک بات یہ تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیم یافتہ اور ہنرمند افراد کا یہ خروج (Exodus) عملاً آزادی سے نو غلامی (Neo-Slavery) کی طرف ہوا۔ مشرق وسطیٰ میں 'تیل کے استعماری استعمال' کے اصل ذمہ داروں نے اپنے تاریخی رویوں کے عین مطابق نو غلامانہ معاشرت (Neo-Slavery Society) کی بنا ڈالی تھی۔ ہندوستانی مسلمانوں نے ہندوستان کی جمہوری اور آزاد فضا سے اپنا Brain Drain کر کے وہاں کی نو غلامی کو قبول کر لیا۔ وہ آزاد جمہوری اور دستوری ہندوستان سے جہاں تاریخی اور قانونی طور پر وہ متمسک (Established) تھے رضا کارانہ نقل مکانی کر کے انہوں نے اس ماحول کو قبول کر لیا جہاں انہیں کوئی تاریخی اور قانونی حقوق حاصل نہیں تھے اور نہ ہو سکتے تھے۔ چنانچہ گزشتہ چالیس سالوں سے ایک ایسی نسل ان کے یہاں پروان چڑھ رہی ہے جو روئے زمین پر ایک تعبیری شہری (Virtual Citizen) کی طرح ذہنی، فکری، جذباتی اور قانونی طور پر زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ خود نقل مکانی کرنے والے یہ مسلمان وہاں رہتے رہتے ذہنی، فکری، علمی اور عملی طور پر ایک غلام ریاست (Slave State) اور غلاموں کی تجارت (Slave Trade) کا جز بن کر رہ

گئے ہیں۔

۶۔ تیسری بدترین بات یہ ہے کہ نقل مکانی کرنے والے ایسے تعلیم یافتہ اور ہنرمند مسلمان ہندوستان میں عملاً بیخ کنندہ (Uprooted & Exterminated) ہو گئے۔ ان کے گھروں میں پیدا ہونے والی نسل تو اب ذہنی طور پر بھی بیخ کنندہ (Uprooted & Exterminated) ہو کر اس جذبے سے بھی عاری ہو چکی ہے جو کم از کم ان ابتدائی نقل مکانی کرنے والوں میں یاد ماضی (Nostalgia) کی صورت میں اب بھی باقی ہے۔

۷۔ چوتھی بدترین بات یہ ظہور پذیر ہوئی کہ پیٹرو ڈالر سے سیراب مگر ہندوستان میں رہ جانے یا کما کر لوٹ آنے والے گھرانوں نے ایک نئے نقل مکانی (Migration) کو جنم دے دیا۔ یہ نقل مکانی ہندوستان کے گاؤں اور قصبوں سے مسلمانوں کا شہروں بالخصوص بڑے شہروں (Metros) میں جا کر آباد ہو جانا ہے۔ چنانچہ دائمی بندوبست [Permanent Settlement (1785-93)]، رعیت واری نظام (Ryotwari System) (1820-27) اور محال واری نظام [Mahalwari System] (1815-22) کے اجرا اور حصول آزادی کے بعد Land Reform Acts سے بیخ کنندہ آبادی کے بچے کھچے مسلمان اس بار رضا کارانہ (Voluntarily) طور پر ہندوستان کے گاؤں، قصبوں اور تحصیلوں سے Evaporate اور Vanish ہونا شروع ہو گئے۔

۸۔ پانچویں بدترین بات یہ ظہور پذیر ہوئی کہ شہری علاقوں (Urban Areas) میں نقل مکانی کرنے والے مسلمانوں کے لئے منظم آباد کاری (Planned Settlement) بوجہ ممکن نہ تھی اور اگر ہوتی بھی تو خود ان کی Vulgarised غالب طبع اس کا ابا کرتی لہذا شہری علاقوں میں نقل مکانی کرنے والی اس آبادی نے ہندوستان کے شہروں میں آباد مسلمانوں میں ایک نئے معاشرے کا آغاز کیا ہے جسے (Slum & Ghettoe Culture) کہا جاسکتا ہے۔ نقل مکانی کرنے والے افراد خواہ متمول ہوں یا اعلیٰ تعلیم یافتہ وہ اب ایک ہی قسم کے (Slum & Ghettoe Culture) کا حصہ بن گئے ہیں اور ان آبادیوں میں ایک ایسی نسل پروان چڑھ رہی ہے جو خواہ کسی پبلک اسکول میں ہی تعلیم کیوں نہ حاصل کر رہی ہو وہ اسی کلچر کا حصہ ہے۔

۹۔ پچھلے چالیس سالوں سے پیٹرو ڈالر سے مستفید گھرانوں میں ایک تیسری قسم کی جینیاتی مقلوب سل (GMS) کا ظہور ہوا ہے جو Mediocre Generation کی طرح اب جوان ہو چکی ہے۔ یہ

نسل (Generation) طبعاً Mimetic ہو کر بے لگام Mimicry پر برسر عمل ہو چکی ہے۔ ظاہر ہے یہ نسل بدترین طور پر غیر خلاق (Uninnovative) ثابت ہوگی۔ چنانچہ آنے والے عہد کا مسلم معاشرہ اس کی ذہانت کا کارگاہ ہوگا جس کے تصور سے ہول آتا ہے۔ یہ مضحل (Degenerated) اور نیم انسان شدہ (Dehumanized) نسل تیزی سے پھیلتی اور بے قابو ہوتی جا رہی ہے۔

۶۔ پچھلے سطور میں جس 'فتنہ عظیم' (The Great Trial) کا ذکر کیا گیا وہ کیا ہے؟

بلاشبہ یہ 'فتنہ عظیم' نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد یا غزوہ اُحزاب کے بعد پیدا ہونے والے 'فتنہ عظیم' کا شئی اور تکرار ہے۔ عہد رسالت کا وہ 'فتنہ عظیم' جو (۱) فتح خیبر (۲) فتنہ منع زکوٰۃ (۳) فتنہ از ہمداد (۴) فتنہ بنی سقیفہ (۵) فتنہ فدک (۶) فتنہ قادسیہ (۷) فتنہ بیت المقدس (۸) فتنہ عراق، یمن و مصر (۹) فتنہ دمشق، کوفہ و بصرہ (۱۰) فتنہ جبر و قدر (۱۱) فتنہ خوارج (۱۲) فتنہ کربلا (۱۳) فتنہ خزہ (۱۴) فتنہ ولأء (۱۵) فتنہ مؤالی (۱۶) فتنہ اہل تسویہ (۱۷) فتنہ عصبیہ (۱۸) فتنہ شعو بیہ (۱۹) فتنہ مزجیہ (۲۰) فتنہ معز لہ (۲۱) فتنہ خلق قرآن و کلام وغیرہ کے لامتناہی سلسلہ کی صورت میں ظاہر ہوا ایک بار پھر اس کا شئی اس کی تکرار کر رہا ہے۔

یہ 'فتنہ عظیم' دور وہ شاخسانہ (Two-Branched Phenomenon) کی صورت میں ظاہر ہوا۔ 1453 سے زیر زمین برسر عمل یہ فتنہ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں برسر زمین آ گیا۔ اٹھارہویں صدی میں اس کے تین مقاصد اور اہداف تھے:

۱۔ رُخْبہ رُغْبوری کا حصول

۲۔ رُخْبہ مُسْتَقْلِل یعنی مَثَابہ کا حصول

۳۔ دونوں کے 'حصول' کے لئے Potential اور Actual استعداد کا حصول۔

1453 سے وہ تیسرے ہدف تک رسائی کے لئے کام کر رہے تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ان کے مرکز المراکز مغربی یورپ میں تھے۔ اس ہدف کے حصول میں انہوں نے عظیم کامیابیاں حاصل کیں۔ ان منصوبوں کے پہلے ہدف کا حصول 1776 میں ہو گیا۔ دوسرے ہدف کے حصول کا باضابطہ آغاز 1779 سے ہوا۔ دوسرے اور بنیادی تیسرے ہدف کے حصول کے لئے کی جانے والی جدوجہد اور اس کے باریک لطیف اور دقیق خطوط کی بہترین تشریح برنارڈ لیوس (Bernard Lewis) نے اپنی کتاب The Arabs in the History: 1950 میں کی ہے:

"Islam to-day stands face to face with an alien civilization that challenges many of its fundamental values and appeals seductively to many of its followers. This time, the forces of resistance are stronger..... But if the metal is harder, so too is the hammer-for the challenge of today is incomparably more radical, more aggressive, more pervasive - it comes not from a conquered, but a conquering world. The impact of the West, with its railways and Printing-presses, aeroplanes and cinemas, factories and universities, oil-prospectors and archaeologists, machine-guns and ideas, has shattered beyond repair the traditional structure of economic life, affecting every Arab in his livelihood and his leisure, his private and public life, demanding a readjustment of the inherited social, political and cultural form.

In these problems of readjustment the Arab peoples have a choice of several paths; they may submit to one or other of the contending versions of western civilization that are offered to them, merging their own culture and identity in a larger and a dominating whole; or they may try to turn their back upon the West and all its works, pursuing the mirage of a return to the lost theocratic ideal, arriving instead at a refurbished despotism that has borrowed from the West its machinery both of exploitation and repression and its verbiage of intolerance, or finally — and for this the removal of the irritant of Western tutelage is prerequisite — they may succeed in renewing their society from within, meeting the West on terms of equal co-operation, absorbing something of both its science and humanism, not only in shadow but in substance, in a harmonious balance with their own inherited tradition." (Page- 177-178)

۷۔ رجبہ مستقل یعنی مشابہہ کا حصول ان کا مقصد اصلی تھا۔ اس ہدف کے باضابطہ اور متعین خطوط کار کے ساتھ حصول کی کوششوں کو کم از کم دو ادوار میں منقسم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ ما قبل 1948 کا دور

۲۔ ما بعد 1948 کا دور

ان دونوں ادوار میں حصول ہدف کی کوششیں دو توجیہات (Orientations) سے رو بہ عمل لائی گئیں:

۱۔ اندرونی یا داخلی کوشش

۲۔ بیرونی یا خارجی کوشش

اندرونی یا داخلی کوشش کے تحت اندر موجود داخلی قوتوں کو متحرک کر کے ہدف تک پہنچنے کی سعی کی گئی جب کہ بیرونی یا خارجی کوشش کے تحت باہر موجود خارجی قوتوں کو متحرک کر کے ہدف تک رسائی حاصل کی گئی۔ اندرونی کوشش سے کم از کم چار ایسے مقاصد کا حصول کیا گیا جو مشابہہ کے حصول کے لئے ناگزیر تھے۔ یہ چار مقاصد تھے:

۱۔ عربوں کی تادیب جدید کرنا

۲۔ فارس اور عرب کے مابین تفریق جدید کرنا

۳۔ ترک اور عرب کے مابین تفریق کرنا

۴۔ فتنہ عصبیہ اور فتنہ شعوبیہ کا احیا کرنا

بیرونی کوشش کے کم از کم تین مقاصد تھے:

۱۔ مشرق وسطیٰ میں تعبیری معاشرہ (Virtual Society)، تعبیری ثقافت (Virtual Culture)

(Virtual Order) اور تعبیری ریاست (Virtual State) قائم کر کے تعبیری نظام (Virtual Order) قائم کرنا۔

۲۔ تعبیری معاشرہ، ثقافت اور ریاست کے قیام کے پیش خیمہ کے بطور نظام مال یا نظام فتنہ مال

قائم کرنا اور معلق معیشت (Hanging Economy) قائم کرنا۔

۳۔ بالآخر رجبہ مستقل یا مشابہہ قائم کرنا۔

اندرونی یا داخلی کوشش صد فی صد امت میں موجودان سے وابستہ اندرونی قوتوں نے انجام دیں۔

چنانچہ خلافت کا خاتمہ (1924) اور مدینت کے قیام (1948) میں علمائے یہود کے بعد سب سے اہم اور فیصلہ کن رول خود علمائے اسلام اور ذمہ داران مدارس نے ادا کئے۔ اگر ہندوستان، وسطی ایشیا، ترکی، مصر، افغانستان، ایران، شام اور جزیرۃ العرب کے علمائے اسلام اور ذمہ داران مدارس نے موثر رول ادا نہ کیا ہوتا تو خلافت کا خاتمہ ہوتا اور نہ 'مشابہ' کا قیام۔

تاریخ کا دقیق تجزیہ یہ بتاتا ہے کہ انیسویں صدی میں سر سید ان اہداف کے حصول میں سب سے بڑی رکاوٹ (Hindrane) تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان، افغانستان، ایران، شام اور مصر کے علما نے ان کے خلاف طوفان برپا کر دیا اور بالآخر سر سید اور ان کے فقید المثال بیٹے اور پوتے کی زندگیاں وحشتناک المیوں میں بدل کر رہ گئیں۔

۸۔ 1948 میں رجبہ مستقل یا مشابہ قائم ہو گیا۔ لیکن ہدف کا حصول ابھی عبوری اور مجازی تھا۔ ابھی اس کے استقلال اور بقا کی ضمانت نہیں دی جاسکتی تھی۔ چنانچہ مابعد 1948 کا مرحلہ انھیں اہداف کے حصول کے لئے شروع کیا گیا۔

- ۱۔ یہ ساری تنگ و دوغیر معمولی طور پر خلافتانہ (Innovative) رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مشرق وسطیٰ میں دو تہوں میں لپٹے دو قسم کے معاشرے تلے اوپر تعمیر کئے جا رہے ہیں۔ یہ دو معاشرے ہیں:
- ۱۔ نظام مال یا فتنہ مال پر مبنی عربوں کا صارفی معاشرہ (Consumeristic Society)۔ اور
- ۲۔ سارے مشرق وسطیٰ میں اعلیٰ ترین خلافتانہ تعبیری معاشرہ (Highly Innovative Virtual Society)۔

ان دونوں معاشروں میں جوہری فرق ہے۔ دونوں یکساں عنوان سے لیکن اپنے اپنے اہداف پورے کر رہے ہیں جن میں جوہری فرق ہے۔ مثلاً ایک جانب جہاں مشرق وسطیٰ کی عرب یونیورسٹیوں میں علم (Knowledge) اور خلافت (Innovation) کے سوا ہر چیز پائی جاتی ہے۔ وہیں دوسری جانب اسی مشرق وسطیٰ میں تعبیری طور پر قائم ہونے والی یونیورسٹیاں جہاں علم (Knowledge)، تفوق (Excellence) اور خلافت (Innovation) کے سوا کسی شے کی طلب ہے نہ قدر۔ عربوں کی قائم کردہ یونیورسٹیاں ہیبتناک المیوں (Horrible Tragedies) کے سوا کچھ بھی نہیں۔ پوری بیسویں صدی انہوں نے ضائع کر دی۔ المیہ یہ ہے کہ رجبہ مستقل کا ہدف رکھنے والے ہی عربوں کے موجد ہیں تھے اور ہیں۔ انہوں نے عربوں کو پوری بیسویں صدی کے دوران مجبور کیا کہ وہ نو غلامانہ نظام (New

(Slavery System) کا باضابطہ احیا کریں۔ ظاہر ہے اس کا مقصد ان اندیشوں کا سدباب کرنا تھا کہ عالم عرب میں مطلوب باہر سے آنے والے مسلم اہل علم اور ہنرمند وہاں کی آبادی کا حصہ نہ بن جائیں تاکہ ان کے اصلی ہدف کے پورا ہونے میں دقت ہو۔ بلکہ ایسے مسلمان اہل علم اور ہنرمند وہاں آ کر علمی و فنی اعتبار سے ضائع اور طبعاً غلام ہو جائیں۔ اب جب کہ وہ اس معاشرے کو پوری طرح صارفی معاشرہ (Consumeristic Society) بنا چکے ہیں وہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ خارجی اہل علم اور ہنرمند جو دراصل غیر مسلم ماہرین علم و فن ہیں وہاں بس کر اس معاشرے کو Irreversible بنا ڈالیں۔

ان تمام اہداف کے حصول میں 'علمائے اسلام' اور 'ذمہ داران مدارس' نے موثر اور فیصلہ کن کردار ادا کیا ہے۔

۹۔ یہ پورا پیراڈائم (Paradigm) حرفاً و رسماً جیسا نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سو سالوں تک امت کو درپیش ہوا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ اسی پیٹرن (Pattern) کی تکرار ہونے جا رہی ہے۔ پہلی صدی ہجری میں ظاہر ہونے والے فتنوں نے جس طرح اسلام دین اللہ اور امت مسلمہ کو مقلوب (Modified) کر کے رکھ دیا تھا ٹھیک اسی طرح اب تک ظاہر ہونے والے فتنوں نے مشرق وسطیٰ میں موجود امت مسلمہ کو بالخصوص اور پورے عالم میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کو بالعموم مقلوب (Modified) کر کے رکھ دیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ 'فتنہ عظیم' آئندہ اپنے نوع اول (Prototype) سے سینکڑوں گنا زیادہ بھیانک اور قیامت خیز ہوگا۔

دین اور مذہب

۱۔ 661 عیسوی کے بعد مسلمانوں کی تاریخ میں فکر و عمل کی روایت کا تجزیہ قابل ذکر ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ اور اس میں لمحہ بہ لمحہ واقع ہونے والے حوادث اور ان میں امت کے تعامل کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ گزشتہ چودہ سو سالوں سے تکلیف (Conditioning) کے سبب مسلمانوں کی 'طبع' تین عناصر سے عبارت ہو چکی ہے:

۱۔ پیش بینی مخالف (Anti-Foreseeing)

۲۔ خلافت مخالف (Anti-Innovative) اور

۳۔ پیش قدمی مخالف (Anti-Initiative)۔

ان تینوں طبائع کا اللہ کے دین سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام دین الآخرة ہے — یہ آخرت کا دین ہے۔ چنانچہ مسلم تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان تینوں مہلک رجحانات کے راسخ ہو جانے کے سبب انفرادی اور اجتماعی مسلم ذہن (Mind) اور عملیت (Practice) ماضی جماد (Past-Stuck) ہو گئے۔ یہی سبب ہے کہ ان چاروں عناصر (پیش بینی مخالف، خلافت مخالف، پیش قدمی مخالف اور ماضی جماد) سے مل کر مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی کارکردگی بھی۔۔ تفکیر، تدبیر اور تعمیل کے میدانوں میں پس رو (Follower)، پھسڈی (Lagging)، مجبور پس رو (Limping)، قدریہ جست مخالف

(Anti-Quantum Jump) اور تبدیلِ مدرج مخالف (Anti-Change of Scale) ہو کر غیر روایتی تسابق مخالف (Anti-Overtaking by Change of Scale or Quantum Jump) ہو چکی ہیں۔

۲۔ مسلمانوں کی اس چہارگانہ تاریخی، ذہنی اور عملی روایت کا منبع (Source)، اس کی اصل (Root)، اس کا مجری (Passage)، اس کے موجہ (Regulator or Director) اور مشرف (Overseer) فی الواقع 'علماء'، ان کی طبع، ان کا تعامل اور ان کے ادارے رہے ہیں جو حقیقی (Actually) اور تعبیری (Virtually) ہر دو اعتبار سے ساری امت کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ جہاں تک 'علماء' کی اصل 'طبع' کا سوال ہے تو وہ ایک پیچیدہ روایت اور اس سے پیدا شدہ 'نفسیات' کا نتیجہ ہے جن کا خلاصہ درج ذیل ہے:

661 عیسوی کے بعد جو اسلام نافذ العمل کیا گیا وہ درحقیقت عین وہی اسلام — دین اللہ نہیں تھا جسے نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی آدم کو پہنچایا اور ان کے درمیان اسے عملاً متمکن کیا تھا۔ 661 عیسوی کے بعد کا اسلام کچھ اور تھا۔ اس کے تار و پود کا جائزہ اور اس کے DNA کا تجزیہ بتاتے ہیں کہ یہ ربیائی یہودیت (Rabbinic Judaism) کی تشکیل جدید (Replication, Re-modeling & Reconstruction) تھا۔ چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حادثے کی خبر دیتے ہوئے فرمایا تھا:

۱۔ عن أبي هريرة قال قال رسول الله صلى عليه وسلم: بدأ الإسلام غريباً و سيعود كما بدأ فطوبى للغرباء (رواه مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا: فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے: اسلام اجنبیوں کی طرح آیا اور وہ اجنبی کی طرح پلٹے گا۔ پس خوش قسمتی ہے اجنبیوں کے لئے۔

۲۔ لتتبعن سنن الذين من كان قبلكم، شبراً شبراً ذراعاً ذراعاً (رواه البخاری باب اعتصام الكتاب والسنة)

ترجمہ: تم (ملا) ان کے نقش قدم پر چل کر رہو گے جو تم سے پہلے ہوئے، ایک ایک بالشت ایک ایک ہاتھ۔

۳۔ عن عبد الله ابن عمرو قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لياتين على امتي كما أتى على بني إسرائيل حذو النعل بالنعل..... (ترمذی)

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عمرو نے فرمایا: فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے: میری امت میں بھی وہی صورتحال طاری ہوگی جیسی بنی اسرائیل پر ہوئی تھی، ایک قدم کے بعد دوسرا قدم۔

۴۔ عن عبدالله بن مسعود عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: تدور رحی الاسلام لخمس وثلثین اوست وثلثین اوسبع وثلثین فان یہلکوا فسیبیل من ہالک وان یقم لهم دینہم یقم لهم سبعین عاماً قلت اوجنا بقی او ہما مطی؟ قال مطی۔ (رواہ ابو داؤد)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا: فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے: اسلام کی چکی پینتیس یا چھتیس یا سینتیس سال چلتی رہے گی۔ اور ہلاک ہو گئے تو یہ ہلاک ہونے والے کا راستہ ہے اور اگر یہ قائم رہے تو ان کا دین ستر سال ان کے لئے قائم رہے گا۔ میں نے پوچھا: باقی سے یا گزرے ہوئے سے؟ فرمایا: گزرے ہوئے سے۔

چنانچہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کا قائم کیا ہوا اسلامی نظام ختم کر دیا گیا اور اس کی جگہ ستر سالوں کے اندر اندر اسلام ہی کے نام سے 'ربیائی یہودیت' (Rabbinic Judaism) کی تشکیل جدید ہو چکی تھی۔ چنانچہ یہ اسلام مذہب (ربیائی نو یہودیت) سابقہ ربیائی یہودیت (Rabbinic Judaism) کی طرح ہی خدا مخالف: توحید مخالف: (Anti-Allah)، رسول مخالف: رسالت مخالف (Anti-Rasulullah) اور قرآن مخالف: ہدی مخالف (Anti-Divine-Guidance) تھا۔ اصل دین اسلام کی جگہ جاگیر اس نو ساختہ اسلام مذہب کی حقیقت کی وضاحت کے لئے ربیائی یہودیت (Rabbinic Judaism) کی تشریح اور تنقیح ضروری ہے۔

۳۔ موسوی دین کی تاریخ میں متعدد موڑ آئے:

۱۔ موسوی دین (1500 B.C.):

۲۔ داؤدی دین (1000 B.C.):

۳۔ عزیری دین (500 B.C.):

۴۔ سوفری دین (135 B.C.):

سوفری دین کے آغاز (135 B.C.) کو عام طور پر 'ربیائی یہودیت' (Rabbinic Judaism) کا

سال آغاز مانا جاتا ہے جب کہ حقیقت ایسی نہیں۔ درحقیقت عزیری دین کا آغاز (500 B.C.) ہی

’ربیائی یہودیت‘ (Rabbinic Judaism) کا آغاز ہے۔ ’ربیائی یہودیت‘ کی تشکیل کرنے والا ایوان انشی کینصت هجڈولہ (אנשי דגולה) 400 قبل مسیح میں معرض وجود میں آچکا تھا۔ تاہم اصل سُوفرین (סופרים) 150 قبل مسیح میں باضابطہ وجود میں آئے۔ یہی ’ربیائی یہودیت‘ (Rabbinic Judaism) ’فریسی یہودیت‘ (Pharisaic Judaism) بھی کہلاتی ہے۔

’ربیائی یہودیت‘ کے تین ستون ہیں۔ اس کے تینوں ستون جس قاعدہ یا اساس (Foundation) پر کھڑے ہیں اسے ’عطا کردہ‘ (Given) یعنی نتون (נתון) کہا جاتا ہے۔ یہ تینوں ستون درج ذیل ہیں:

۱۔ خود کفیل عبادت: اس کا مفہوم ہے عبودیت اور عبادت میں خود مختار ہونا۔ ’ربیائی یہودیت‘ کے اسی ستون کی حقیقت خدا مخالف: توحید مخالف (Anti-Allah) ہے۔

۲۔ خود کفیل اطاعت: اس کا مفہوم ہے اطاعت میں خود مختار ہونا۔ ’ربیائی یہودیت‘ کے اسی ستون کی حقیقت رسول مخالف: رسالت مخالف (Anti-Rasulullah) ہے۔

۳۔ خود کفیل ہدایت: اس کا مفہوم ہے ہدایت میں خود مختار ہونا۔ ’ربیائی یہودیت‘ کے اسی ستون کی حقیقت تورہ مخالف: ہدی مخالف (Anti-Torah) ہے۔

۴۔ ’ربیائی یہودیت‘ (Rabbinic Judaism) کے دو مصادر یا منابع (Sources) تسلیم کئے جاتے ہیں:

۱۔ ’مکتوب قانون‘ (Written Law): اس مکتوب قانون کو مکتوب توراہ یا توراہ سبکٹب (תורה שבכתב) بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں مجموعی اعتبار سے 613 احکام درج ہیں جن میں 248 اوامر اور 365 نواہی ہیں۔ انہیں ’613 احکام‘ (תורה"ד מצוות) بھی کہا جاتا ہے۔

۲۔ ’زبانی قانون‘ (Oral Law): زبانی یا سینہ بسینہ منتقل ہونے والے اس قانون کو تورات دہن یعنی توراہ سبعل پہ (תורה שבעלפה) بھی کہا جاتا ہے۔ بعض حلقوں میں اسے ’ذبرہ مشورہ‘ (לילב דבר המסורה للלב) بھی کہا جاتا ہے۔ بعض حلقے اسے ’قبلاہ‘ (קבלה) کہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ درحقیقت زبانی یا سینہ بسینہ منتقل ہونے والے اس قانون کا مفصل نام ’ہلغہ لیمشني‘ (הלכה למשנה) (הלכה למשנה משנה) یعنی — وہ ’مشنی جو سینا میں عطا کیا گیا‘ ہے۔

’ربیائی یہودیت‘ (Rabbinic Judaism) کے مطابق مکتوب قانون — تورہ — مکتوب

الواح کی شکل میں موسیٰ کو الوہینم (אלוהים)، یہوۃ (יהוה) یا اکون (און) نے عطا کئے تھے۔ اسی طرح 'ریبائی یہودیت' کے مطابق زبانی یا سینہ بسینہ آج منتقل ہونے والا یہ 'زبانی قانون' (Oral Law) — موسیٰ کو سینا پر زبانی طور پر عطا کیا گیا جو عہد موسیٰ سے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا ہوا چلا آیا اور بعد میں مشنی (משנה)، توفتہ (תוספתא)، منڈش (מדרש) اور تلمود (תלמוד) وغیرہ کی شکل میں مدون ہو کر آج موجود ہے۔

'ریبائی یہودیت' (Rabbinic Judaism) کے بنیادی امور درج ذیل ہیں:

۱۔ یہ دین موسیٰ کے ذریعہ سینہ بہ سینہ منتقل ہو کر علمائے یہود یعنی رب، رتیم، ربن، ربنان (רב، رבים، ربن، ربنان) کو عطا ہوا ہے۔ چنانچہ یہ دین ریبائی (רבני) ہے اور اب علمائے یہود یعنی ربنوت (רבנות) اس کے اصل اور بلا شرکت غیر وارث، محافظ اور ذمہ دار ہیں۔ علمائے یہود ہی وارث موسیٰ یعنی وارث انبیاء ہیں۔

۲۔ یہ ربنوت (רבנות) 'عطا کردہ' ہے۔ یہ ربنوتوں (רבנות) کی مملکت ہے۔ اس مملکت میں رتی مختار مطلق اور مختار کل ہیں۔

۳۔ 'ریبائی یہودیت' کے ماخذ بنیادی طور پر چار ہیں:

۱۔ مشنی (משנה)

۲۔ تلمود (תלמוד)

۳۔ منڈش (מדרש) مع عبادات کینصت اور

۴۔ شموٰنہ عیشرہ (שמונה עשרה)۔

۴۔ 'ریبائی یہودیت' کے مطابق توراہ یا تورات کی کوئی اہمیت نہیں بجز اس کے اسے مکتوب شکل میں الوہینم، یہوۃ اور اکون نے موسیٰ کو عطا کیا تھا۔ یہ 'تورہ' اب علمائے یہود کے ماتحت ہے۔ چنانچہ مکتوب قانون (Written Law) تابع ہے زبانی قانون (Oral Law) کے۔ چنانچہ ریبوں کے مطابق 'تورہ' (תורה) کے ایک ایک لفظ، اس کی ایک ایک عبارت اور اس کے ایک ایک حکم کے صرف وہی معنی لئے جائیں گے اور وہی معتبر قرار پائیں گے جو ربی طے کر دیں۔

۵۔ تاریخ یہودیت بتاتی ہے کہ 'ریبائی یہودیت' کے کم از کم چار اقسام کے ائمہ نے چار مرحلوں میں مکتوب قانون (Written Law) یعنی 'تورات' کے معانی تعبیرات اور احکام کو Regulate اور

Formulate کیا۔ یہ چار اقسام کے ائمہ اور ان کے چار مرحلے یا عہد درج ذیل ہیں:

۱۔ سُوفَرین (סופרים)

۲۔ ثَنَائین (תנאים)

۳۔ اُمُورَائین (אמוראים)

۴۔ سَبُورَائین (סבוראים)

سُوفَرین (סופרים): علمائے ربیائی یہودیت کے مطابق یہ 'علمائے ائمہ' اقدم القاد میں ہیں۔ یہود میں یہ وہ عالی مرتبت قدا سہ ہیں جو عزیر سے شمعون کے عہد تک پائے جاتے تھے۔ علمائے یہود کی یہی وہ ہستیاں ہیں جنہوں نے תנא (תנא) کو موجودہ رسم الخط میں از سر نو لکھا اور اسے مرتب اور مؤلف کیا تھا۔ بالخصوص תנא کی آیات، ابواب اور ترتیب کو از سر نو مرتب کیا۔ انہوں نے ہی تورات میں 'ضروری' تبدیلیاں کر کے اسے ربیائی یہودیت کے مطابق بنایا بالخصوص اسفارِ خمسہ (תורה) کو هَلֶגֶה (הלכה) کی ضرورتوں کے مطابق ڈھالا۔ انہوں نے اصولی تفسیر فرُوشی سُوفَرین (פירוש סופרים) وضع کئے بطور خاص اس کے اوزانِ کیف و کم۔ شینعُوری سُوفَریم (שיעורי סופרים) وہ مخصوص تفسیر، تاویل اور تعبیر ہے جن کے ذریعہ تورات کی موجودہ صورت برآمد ہوئی جسے دَبُوری توره (דברי תורה) کہا جاتا ہے۔ یہی وہ موجودہ صورت ہے جسے اب اصل تورات پر فوقیت حاصل ہو گئی ہے۔ انہیں خدا کی جانب سے قانونی مدد اوریتا (מדאורייתא) کہا جاتا ہے جنہیں انہی ائمہ کے ذریعہ وضع کردہ علامات سُمניئم (סימנים) اور رموز رُمزیم (רמזים) سے متعین کیا گیا ہے اور یہی اب توراہ کی تفسیر مَآثُورَة (מאורות) کہلاتے ہیں۔ چنانچہ توراہ کی عبارات کے اب صرف وہی معانی معتبر اور مقبول ہوں گے جو مَآثُورَة ہیں۔ انہی کے ذریعہ توراہ کو قیرجی (קרי) اور کیتب (כתב) سے مقید کر کے اور تقونی سُوفَریم (תוקני סופרים) سے محرف کر کے نئی شکل میں ڈھالا گیا۔ جس کے لئے مکتوب سُوفری منطق דَقْدُوقِي سُوفَریم (דקדוק סופרים) اور غیر مکتوب سُوفری منطق دَقْدُوقِي توره (דקדוק תורה) کا سہارا لیا گیا۔ اس پر مستزاد انہیں علمائے یہود نے جنہیں سُوفَریم کہا جاتا ہے حلال و حرام کے نئے احکام خود وضع کئے ان کے وضع کردہ حلال و حرام کے قوانین مثلاً سینج (סני) اور جَدَد (גד) — کہلاتے ہیں جنہیں بعد میں جِزْرَة (גזרה) کے نام سے موسوم کیا گیا — اور یہی وہ وضع کردہ حلال و حرام کے قوانین ہیں جنہیں ربیائی یہودیت میں دَبُوری سُوفَریم (דברי סופרים) یا 'اکابر کے سنن' کہا جاتا ہے۔

یہ سُکُنْ توراہ کے ربانی احکام (עֲקָר הַאֲוֵרוֹת) کے علی الرغم ہیں لیکن ان پر فوقیت رکھتے ہیں۔ یہی وہ معانی اور تعبیرات ہیں جو اب تورات سے لئے جاسکتے ہیں۔

ثنائین (תנאים): علمائے یہود کا دوسرا طبقہ ثنائین سو فرین کے بعد منصفہ شہود پر آیا۔ ربیائی یہودیت کے مطابق یہ ائمہ اقدمین ہیں۔ انھوں نے سو فرین کے کئے ہوئے کاموں کو مزید آگے بڑھایا اور فقہ کے قوانین متعین، جمع اور مرتب کئے۔ ثنائین نے احکام کی تاویل کے اصول مدوت (מדות) بنائے۔ 'قضا' کے اصول و ضوابط وضع کئے۔ چیزیں و ہتھوٹی دینی (גזירות התורה) خواہ عام یعنی ہلخوت قبوعوت (הלכות קבועות) ہوں یا مقامی اور عبوری یعنی ہلخوت مدینی (הלכות מדינה) ہوں وضع کئے۔ یہ مقامی اور عبوری قوانین خواہ مقامی عرف اور عادت سے ماخوذ یعنی مנהج مدینی (מנהג מדינה) ہوں یا ان کے ذریعہ از خود بنا ڈالے گئے ہوں۔۔۔ وضع کئے۔ انہی علمائے یہود کے ذریعہ ہلخوت کی تاویل، تعبیر اور تعمیل کے لئے مختصر اور رمزیہ فارمولے وضع کئے گئے۔ انھیں بھی ہلخوت (הלכה) کہا جاتا ہے۔ رمز کو برقرار رکھنے کے لئے انھیں عام بنی اسرائیلی زبان ارامی (ארמי) سے ہٹ کر ایک مصنوعی اور رمزی زبان میں مرتب کیا گیا جسے لیشون خخبینم (לשון חבמים) کے نام سے موسوم کیا گیا۔ ربیائی یہودیت کے علما کو پابند اور ان پر فرض کیا گیا کہ وہ اس رمزی زبان کو تاحیات خفیہ رکھیں اور کسی 'غیر اہل' کو اس کا علم ہرگز ہرگز منتقل نہ کریں۔ چنانچہ اس رمزیہ زبان میں ہلخوت (הלכה) کو متعین، جمع اور مرتب کیا گیا۔ انھیں لیشون خخبینم میں شونہ ہلخوت (שונה הלכה)، کلدانی میں تنائی (תנאים) اور فلسطینی ارامی سریانی میں تنوتیا (תנויות) کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد ان ہلخوت کی تفسیر ثنائین نے کی جنھیں مندش ہلخوت (מדרש הלכה) کہا جاتا ہے۔ علمائے یہود کے ذریعہ وضع کردہ ہلخوت اور اللہ کا نازل کردہ (اور اب سو فرین کے ذریعہ از سر نو مرسوم اور مرتب کردہ) توراہ کے مابین باہم ربط کے اصول مرتب کئے گئے جنھیں مندش ہکتوبینم (מדרש הכתובים) کہا جاتا ہے۔ اس سے قبل صمر (סמר) کے اصول مرتب کر کے قبلة یعنی قلغہ لیشنی منس سینی (הלכה למשנה מסני) کا اور توراہ یعنی توراہ سبکتب (תורה שבכתב) کے مابین ایک حیرتناک بلکہ ساحرانہ ربط قائم کیا گیا تھا۔ چنانچہ ربیائی یہودیت کا پورا نظام اس طرح وضع اور نافذ کر لیا گیا جس کا اللہ کے نازل کردہ توراہ سے ظاہری ربط تو تھا لیکن درحقیقت ان کا حقیقی کوئی ربط نہ تھا سوائے اس کے کہ ریبوں کے وضع کردہ سارے قوانین اللہ اور موسیٰ کے

حوالے سے اور ان کے نام پر اب علی الاطلاق نافذ العمل کئے جاتے رہے۔ اب 'ربیائی یہودیت' کے یہی 'قوانین' لִשׁוֹן חֲכֵימָם מִן תְּלֻמוֹד (תְּלֻמוֹד) اور کلدانی میں حֲזֵרָה (דְּמָרָה) کہلاتے ہیں۔ بعض علما جو کسی اعتبار سے غیر معمولی تھے انہوں نے اپنی ذاتی سند پر ایک نئے قسم کے הַלְגָּה לִישׁוֹן מִן סִינִי کو وجود میں لا دیا جنہیں תּוֹצִיטָה (תּוֹצִיטָה) کے نام سے پکارا گیا۔ مثلاً 'ربی ایلی عزرا' (אֵלִי עֲזָרָה) نے ایک تَوْצִיטָה مرتب کیا اور دعویٰ کیا کہ انہوں نے انہیں מִשְׁנֵי اور قִבְלָה یعنی روایات (Traditions) کو جمع کیا ہے جو کسی نہ کسی امام مִשְׁנֵי کی معمول بہا رہی ہیں۔ مرور ایام میں توراہ کے ربانی قوانین دִינ תּוֹרָה (דִּין תּוֹרָה) کو مختلف ائمہ یہود نے اپنے اپنے کتب فکر کے تحت تبدیل (Modify) کر کے جنہیں תְּקֻנוֹת (תְּקֻנוֹת) کہا جاتا ہے نہ صرف مدون کیا بلکہ انہیں הַתְּקִינוֹ (הַתְּקִינוֹ) کے اعتبار سے نافذ العمل بھی کر دیا۔ اس طرح رفتہ رفتہ توراہ یعنی مقرا (מְקֻרָה) اور ربیائی הַלְגָּה کے مابین فیصلہ کن تفریق (Decisive Separation) قائم ہو گئی۔

ثنائین نے تمام فقہی قوانین اور 'ربیائی یہودیت' کے دیگر سارے ضوابط یکجا کر کے مختلف طریقوں اور ناموں سے مدون کئے۔ انہیں تین اقسام میں منقسم کیا جاسکتا ہے:

- ۱۔ مشمولات اور شکل کے اعتبار سے مرتب کردہ: فقہی قوانین (הַלְגָּה) کی یہ وہ تصنیفات ہیں جنہیں מִסְתַּחֲטָ (מִסְתַּחֲטָ) کہا جاتا ہے جو صددیم (סִדְדִים) میں منقسم ہیں۔
- ۲۔ توراہ کی ترتیب کے اعتبار سے مرتب کردہ: فقہی قوانین (הַלְגָּה) کی یہ وہ تصنیفات ہیں جن میں توراہ کی طرح פֶּרֶשִׁיּוֹת (פֶּרֶשִׁיּוֹת) پائے جاتے ہیں۔ یہ دونوں اقسام مִשְׁנֵי (מִשְׁנֵי) کہلاتے ہیں۔

۳۔ استخراج کے اصول کے مطابق: توراہ سے احکام کے مستنبط کرنے کے تیرہ اصول جنہیں 'اقد' کہا جاسکتا ہے وضع کئے گئے۔ ان میں سات کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہیں جִלִּיל (גִּלִּיל) نے اور بقیہ چھ کوربی اشמעیل (אֲשִׁמְעִיל) نے وضع کئے۔ اسی کی بنیاد پر بعد میں הַלְגָּה מִן מִשְׁנֵי (הַלְגָּה מִן מִשְׁנֵי) نے وضع کیا وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ صغریٰ سے کبریٰ کا استخراج و استنتاج

- ۲۔ بیانِ کلام سے استقرا
- ۳۔ ایک مخصوص حکم کی تعمیم کر کے
- ۴۔ دو مخصوص احکام کی تعمیم کر کے
- ۵۔ عام اور خاص کے اثر کو اخذ کر کے
- ۶۔ ایک عبارت کا دوسری عبارت سے تفسیر کر کے (تفسیر توراہ بالتوراہ)
- ۷۔ سیاقِ کلام سے توضیح کر کے۔

ربی جلیل اور ربی اشمعیل کے تیرہ اصول استخراجِ حکم کے علاوہ قابل ذکر ربی عقبہ کا اصول ہے جسے رِبּוּתִי וְ מִיּוֹת یعنی اصولِ توسیع و تعقید کہا جاتا ہے۔

امورائین (אמוראים): ثنائین کے بعد امورائین (אמוראים) منصف شہود پر آئے۔ ربیائی یہودیت کے مطابق یہ ائمہ متقدمین ہیں۔ انھوں نے ثنائین کی تصنیفات اور ان کی عبارتوں کی توضیح، تشریح اور تفسیر کی لہذا انھیں مترجمان (מתורגמין) بھی کہا جاتا ہے۔ امورائین نے مشنی کی مَطْوَل تشریح، توضیح اور تفسیر کی۔ امورائین کی یہ تالیفات مشنیوت (משניות) کلدانی میں مشنی تین اور مشنی تن / مشنتنو (מתניתין / מתניתין / משנתנו) کہلاتی ہیں۔ ان میں ربی اشایہ نے جنھیں أبوالمشنی بھی کہا جاتا ہے خارجی مشنی (משנה חיצונה) جسے کلدانی میں مِثְנִיתָא וְ رֵאִיתָא (מתניתה בריתא) بھی کہا جاتا ہے مرتب کی۔ ربی اشایہ اور ربی حی نے ربی نہیمیہ کے اصول پر ایک اور قسم کی کتاب مرتب کی جسے توضحتہ کہا جاتا ہے۔

سبورائین (סבוראים): امورائین کے بعد سبورائین (סבוראים) منصف شہود پر آئے۔ انھوں نے رای یعنی سَبْر (סבר) کی بنیاد پر احکام کی تشریح و توضیح کی۔ چنانچہ انھیں سبورائین کہا جاتا ہے۔ تلمود کی آخری تالیف و توضیح کرنے والے اور ربیائی یہودیت کی تکمیل کرنے والے یہی سبورائین ہیں۔

انھیں حֲחִינִי הַתְּלֻמוֹד (חבמי התלמוד) بھی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے چند ایسی تالیفات بھی کیں جنھیں رسائل صغریٰ قطنوت مَصْقוֹت (קטנות מסכות) کہا جاتا ہے۔

۶۔ اس طرح ربیائی یہودیت کے بنیادی ماخذ میں ہر چند کہ برائے نام تورہ (תורה) اب بھی شامل ہے لیکن 'تورہ' سے مراد وہ هَلְغָה ہیں جو جلیل، اشمعیل یا دیگر ائمہ کی تفسیروں میں اور ان

کے ذریعہ استخراج کئے ہوئے احکام میں ہیں یا وہ معانی جو ان سے قبل سو فرین نے 'ماثورہ' یا 'مثورہ' کے اعتبار سے متعین کر دیئے تھے۔ اس طرح 'ربیائی یہودیت' کے تمام ماخذ درج ذیل ہوئے:

۱۔ مِشْنَى (משנה)

۲۔ تَوْضِيفَتَه (תוספתא)

۳۔ تَلْمוּד בָּבִילִי (תלמוד בבלי)

۴۔ تَلْمוּד יְרוּשָׁלַמִי (תלמוד ירושלמי)

۵۔ מִנְדְּשֵׁימ (מדרשים)

مِنْدَش کے دو اقسام ہیں:

۱۔ هَلְطִי (הלכות) یعنی احکامی

۲۔ هֶגָדִי (הגדה) یعنی روایاتی، تاریخی وغیرہ

'ربیائی یہودیت' میں فوقیت اور بنیادی اہمیت صرف اور صرف هَلְطִי (הלכות) یعنی احکامی مِندَش کی ہے۔

ان مِندَشوں میں تین بہت مشہور اور بنیادی ہیں:

۱۔ مִנְדְּשׁ רֵבִי (מדרש רבה)

۲۔ פִּינְסִיפְתֵה דֶרַבְּ קָהֲנֵה (פסיקתא דרב כהנא) اور

۳۔ פִּינְסִיפְתֵה רֵבִי (פסיקתא רבתי)

ان کے علاوہ هֶגָلְتֵה، تَنهُومֵה اور יִלְקוּת بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے علاوہ وہ ارامی تفاسیر اور ان کی توضیحات بھی اہمیت کی حامل ہیں جنہیں 'تَرْجُوم' (תרגום) کہا جاتا ہے۔

۷۔ علمائے یہود کا اس امر پر 'اجماع' ہے کہ اب جب کہ یہ مکتوب اور زبانی قوانین انہیں عطا کر دیئے گئے ہیں تو جب تک یہ دنیا قائم ہے اس 'دین' اور اس میں داخل ہر چیز کی وہی تاویل، وہی تعبیر اور وہی معانی معتبر ہوں گے جنہیں 'علمائے یہود' بیان کر دیں۔ اس میں کسی کو ذرہ برابر بھی مداخلت کا اختیار نہیں۔ نہ انبیاء کو، نہ رسولوں کو نہ حضرت موسیٰ کو اور نہ ہی خدائے ذوالجلال کو۔ اور اگر ان میں سے کوئی بھی مداخلت کرے تو وہ علی الاطلاق، بلا استثنا اور بلا غور و خوض قابل رد ہی نہیں بلکہ قابل تعزیر بھی ہے۔ اس کی واضح طور پر تشریح کرتے ہوئے تلمود بابلی (תלמוד בבלי) میں ایک روایت באوامیصیہ ب

59/ میں درج ہے۔ اس پوری عبارت کا یہاں درج کرنا تقریباً فہم کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے:

”کہا جاتا ہے کہ (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عہد سے ذرا قبل) ربی ایلی عزرا اور دیگر علمائے یہود کے مابین پختہ تنوز کے پاک ہونے پر اختلاف واقع ہو گیا۔ ربی ایلی عزرا نے (توراة اور دیگر ماخذ سے) دلائل دیئے لیکن علمائے یہود ان دلائل سے مطمئن نہیں ہوئے (اور ان کا اختلاف برقرار رہا)۔ ربی ایلی عزرا نے (تقلی اور عقلی) دلائل سے انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی لیکن ان کا اختلاف پھر بھی برقرار رہا۔ چنانچہ ربی ایلی عزرا نے کہا: اگر میرا موقف اور میرے دلائل توراة کے عین مطابق ہیں تو یہ خرنوب (Carob-Tree) اس کی گواہی دے دے۔ ربی ایلی عزرا نے جیسے ہی یہ کہا وہ خرنوب (Carob-Tree) اپنی جڑ سے اکھڑ کر 100 ہاتھ دور چلا گیا۔ اس واقعہ کو دیکھ کر اختلاف کرنے والے علمائے خرنوب سے کوئی ثبوت نہیں دیا جا سکتا۔ تب ربی ایلی عزرا نے پھر کوشش کی اور کہا: اگر میرا موقف اور میرے دلائل توراة کے عین مطابق ہوں تو یہ ندی الٹے سمت رواں ہو کر میرے موقف کے درست ہونے کو ثابت کر دے۔ ابھی ایلی عزرا کی دعا ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ ندی الٹے سمت بہنے لگی۔ اس واقعہ سے بے پروا اختلاف کرنے والے علمائے پانی کی ندی سے ثبوت نہیں لائے جاسکتے۔ ربی ایلی عزرا تیسری بار سامنے آئے اور کہا: اگر میرا موقف اور میرے دلائل عین توراة کے مطابق ہیں تو اس مدرسہ کی دیواریں ڈھ جائیں۔ اس سے قبل کہ ربی ایلی عزرا کی دعا ختم ہوتی مدرسہ ڈھنے لگا۔ اس وقت ربی یوشوا نے مدرسے کی دیواروں کو مخاطب کر کے کہا: جب علمائے فقہ پر بحث کر رہے ہوں تو تمہاری مداخلت کا کیا جواز؟

اس صورتحال پر ربی ایلی عزرا نے جھلا کر کہا: اگر میرا موقف اور میرے دلائل توراة کے عین مطابق ہیں تو خدا خود اس کی گواہی دے۔ ربی ایلی عزرا کی اس دعا پر آسمان سے آواز آئی: اے علمائے یہود تم ربی ایلی عزرا سے کیوں جھگڑتے ہو جب کہ تم خوب جانتے ہو کہ اللہ کی کتاب ہر اعتبار سے اس سے متفق ہے۔ اس پر ربی یوشوا نے کہا: **לָא בִשְׂמִים (הַדְּבָרִים: 12:30)** 'یہ عرش نہیں (ہے)۔'

ربی یوشوا (کے قول) کی تشریح کرتے ہوئے رَבִּי יוֹשֻׁעַ نے کہا: جب اللہ تعالیٰ نے ایک بار موسیٰ کو توراة طور سینا پر دے دی تو پھر اب اللہ تعالیٰ کو ان فقہی معاملات میں مداخلت کا کیا اختیار؟ موسیٰ نے وہ توراة ہم ربیوں کو دے دی۔ اب ہم کلی اختیار رکھتے ہیں کہ جیسے چاہیں اس کی تشریح و تعبیر کریں۔ اور اب ہم ربی اجماع سے اس کا فیصلہ کریں گے۔ چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ ربی ایلی عزرا کو کافر اور مرتد قرار دے دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

حکم اور صلاۃ

۱۔ نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا برپا کردہ نظام اسلام 661 عیسوی میں ختم کر دیا گیا اور اس کی جگہ ربیائی یہودیت (Rabbinic Judaism) اسلام مذہب (?) کا لبادہ زیب تن کر کے برپا ہو گئی۔ چونکہ یہ مذہب اسلام ربیائی یہودیت (Rabbinic Judaism) کی عربی ماحول میں تشکیل جدید تھا اس لئے اس میں کلدانی، ارامی اور عبرانی کی جگہ بدوی عربی توجیہ (Orientation) اور تعمیم (Vulgarization) کا عنصر غالب رکھا گیا لیکن صرف اس حد تک کہ دیواروں کی باہری پرت بدوی عربی تھی جب کہ اندر کی ساری عمارت ربیائی یہودیت (Rabbinic Judaism) کی تھی جو ارامی، کلدانی اور عبرانی اینٹوں، پتھروں اور مسالوں سے بنی ہوئی تھی۔ ربیائی یہودیت (Rabbinic Judaism) کی یہ عربی شکل اصل ربیائی یہودیت کی طرح ہی خدا مخالف: توحید مخالف (Anti-Allah)، رسول مخالف: رسالت مخالف (Anti-Rasulullah) اور قرآن مخالف: ہدی مخالف (Anti-Divine Guidance) تھی۔ یہ بھی انہیں تین ستونوں پر قائم مذہب تھا:

۱۔ خود کفیل عبادت

۲۔ خود کفیل اطاعت

۳۔ خود کفیل ہدایت

۲۔ یہ چونکہ ربیائی یہودیت (Rabbinic Judaism) ہی تھا اس لئے اس مذہب اسلام کے بھی دو منابع تشکیل دیئے گئے:

۱۔ مکتوب قانون (Written Law):

۲۔ زبانی قانون (Oral Law):

661 عیسوی کے بعد متمکن اسلام میں مکتوب قانون (Written Law) سے مراد 'قرآن' تھا جب کہ زبانی قانون (Oral Law) سے مراد 'سنت' تھی۔ سنت کی دوسری معروف تعبیرات 'خبر'، 'اثر' اور روایت بھی ہیں۔ لیکن 'سنت' کی سب سے معروف تعبیر 'حدیث' کے نام سے موسوم ہوئی۔ محدثین عام طور پر 'حدیث' مراد لیتے ہیں جب کہ فقہاء اور بالخصوص اصولیین 'سنت'۔

۳۔ اسلام کی ابتدائی اور بنیادی شکل و صورت متعین کرنے والوں نے قرآن کو ربیائی یہودیت سے بھی نچلی سطح یا کم از کم کتر درجے پر رکھا۔ ربیائی یہودیت نے توراہ (Torah) یعنی مکتوب قانون کو لُوخُوت (לוחות) مانا جب کہ علمائے قرآن کو 'حدیث' قرار دے دیا۔ علمائے اسلام نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ کتاب کو 'القرآن' اور 'مُنزَل' مِنَ اللّٰهِ تسلیم نہیں کرتے بلکہ اسے 'حدیث' قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک قرآن دراصل 'حدیث متواتر' کا نام ہے۔

۴۔ 661 عیسوی کے بعد اس اسلام کی جسے نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی نوع انسان کو تمام و کمال پہنچا دیا تھا پوری ترتیب پلٹ دی گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک 'اسلام اللہ کا دین تھا جسے انھوں نے بنی نوع انسان کو مکمل طور پر پہنچا دیا۔ اور ان کے اصحاب نے اس کی گواہی دی۔

[ملاحظہ فرمائیں: القاضی ابوبکر الباقلائی: اعجاز القرآن: خطبہ حجۃ الوداع]

موجودہ اسلام وہ دین ہے جسے 'علمائے تسلیم اور قبول کیا۔ جو علمائے تسلیم اور قبول کردہ نہیں وہ 'اسلام' نہیں ہے۔

۵۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

۱۔ قُلْ اطِيعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُولَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ (آل عمران ۳۲)
ترجمہ: آپ کہہ دیجئے: حکم مانو اللہ کا اور رسول کا، پھر اگر اعراض کریں تو اللہ کو محبت نہیں ہے (کافروں سے)

۲۔ وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَلَوْ اَنَّهٗمْ اِذْطَلَبُوْا اَنْفُسَهُمْ جَاءُوكَ

فاستغفروا الله واستغفر لهم الرسول لوجدوا الله تواباً رحيماً. فلا وربك لا يؤمنون حتى يحكموك فيما شجر بينهم ثم لا يجدوا في انفسهم حرجاً مما قضيت ويسلموا تسليماً. (النساء ۶۴-۶۵)

ترجمہ: اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی واسطے کہ اس کا حکم مانیں اللہ کے فرمانے سے۔ اور اگر وہ لوگ جس وقت انہوں نے اپنا برا کیا تھا آتے تیرے پاس پھر اللہ سے معافی چاہتے اور رسول بھی ان کو بخشواتا تو البتہ اللہ کو پاتے معاف کرنے والا مہربان۔ سو قسم ہے تیرے رب کی وہ مومن نہ ہوں گے یہاں تک کہ تجھ ہی کو منصف جانیں اس جھگڑے میں جو ان میں اٹھے پھر نہ پاویں اپنے جی میں تنگی تیرے فیصلہ سے اور قبول کریں خوشی سے۔

۳- یا ایہا الذین آمنوا اطیعوا الله و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم فان تنازعتم فی شئی فرحوا الی الله والرسول ان کنتم تؤمنون بالله والیوم الآخر ذلك خیر و احسن تاویلاً. (النساء ۵۹)

ترجمہ: اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور حاکموں کا جو تم میں سے ہوں۔ پھر اگر جھگڑ پڑو کسی چیز میں تو اس کو رجوع کرو طرف اللہ کے اور رسول کے اگر یقین رکھتے ہو اللہ پر اور قیامت کے دن پر۔ یہ بات اچھی ہے اور بہت بہتر ہے اس کا انجام۔

۴- ففرؤا الی الله انی لکم منه نذیر مبین (الذریٰۃ ۵۰)

ترجمہ: سو بھاگو اللہ کی طرف میں تم کو اس کی طرف سے ڈر سنا تا ہوں کھول کر۔

اس پوری تدریج (Graduation & Hierarchy) کو از حد مکر سے پلٹ دیا گیا۔ موجودہ صورت حال کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ اور رسول کی بات کی تصدیق — رد اور قبول — محدثین کرتے ہیں — محدثین کی تصدیق — رد و قبول محدثین جرح و تعدیل کرتے ہیں — محدثین جرح و تعدیل کی تصدیق — رد و قبول — فقہا کرتے ہیں — اور فقہا کی تصدیق — رد و قبول — علما کرتے ہیں۔ گویا اللہ اور رسول پر اب 'علما' حاکم اور فیصل بنا دیئے گئے ہیں۔

۶۔ دقت نظر سے غور کیا جائے تو: نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دین مکمل طور پر پہنچایا تھا اس کی دو خصوصیات تھیں:

۱۔ قاعدہ (Bedrock / Bottomline): نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے پہنچائے

ہوئے دین کا قاعدہ (Bedrock & Bottomline) خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس تھی جو قیامت تک قائم رہنے والی ہے۔ آپ تا قیامت نبی، رسول، ہادی، داعی الی اللہ، نذیر، سراج منیر اور حکم ہیں۔

۲۔ صُعود (Ascending Order): نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے پہنچائے ہوئے دین اسلام کا مزاج صُعود کی طرف متوجہ اور متجہ ہے۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قاعدہ اور بنیاد ہیں اور اسلام اور اس کے تبعین کا رخ اوپر یعنی اللہ کی جانب ہے۔ ہدایت کے لئے بھی اور تصدیق کے لئے بھی۔ یہی صورت حال عہد نبوی میں تھی۔ یہی اس اصلی دین اسلام کی خصوصیات تھیں جسے نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے۔

۷۔ 661 عیسوی کے بعد جاگیر اسلام میں صورت حال بالکل پلٹ گئی:

۱۔ قاعدہ (Bedrock & Bottomline): موجودہ اسلام میں قاعدہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہیں رہ گئے بلکہ سب سے نچلی سطح کے علمائے اسلام قرار پائے۔

۲۔ ہبوط (Descending Order): موجودہ اسلام اور اس کے مزاج کی ہر چیز مائل بہ ہبوط بنا دی گئی ہے۔ اللہ کی تصدیق رسول کے نام سے کی جاتی ہے اور یہ تصدیق محدثین کرتے ہیں۔ محدثین کی تصدیق محدثین جرح و تعدیل کرتے ہیں۔ محدثین جرح و تعدیل کی تصدیق فقہاء کرتے ہیں اور فقہاء کی تصدیق علماء کرتے ہیں۔

چنانچہ 661 عیسوی کے بعد رائج اسلام کا رخ حقیقتاً اور عملاً، ہبوطی (Descending)، اضمحلالی (Degenerating) اور تحلیل (Diluting) بن گیا ہے۔ یہاں دین کا سفر خالص (Pure) سے آلودہ (Impure) کی جانب ہوتا ہے؛ معیاری (Standardized) سے غیر معیاری (Unstandardized) کی جانب ہوتا ہے؛ محرم (Sanctioned) سے غیر محرم (Non Sanctioned) کی جانب ہوتا ہے؛ اصلی (Original) سے نقلی (Spurious) کی جانب ہوتا ہے؛ اور مجاز (Licensed) سے غیر مجاز (Unlicensed) کی جانب ہوتا ہے۔

۸۔ علوم اسلامی میں سب سے عمیق، وسیع اور عریض علم اصولیین کا ہے جو علوم حدیث اور علوم فقہ دونوں کو جامع اور محیط ہے اور ان اصولیین میں اصولیین احناف کا ہے لہذا 661 عیسوی کے بعد واقع ہونے والی تبدیلی کو مزید واضح اور منقح کرنے کے لئے فقہ حنفی کی مثال دی جاتی ہے چونکہ اس کی تفصیل اور

تحلیل کرنے کی یہاں گنجائش نہیں تاہم ذیل میں دیا گیا مختصر ترین خاکہ اس Upside Down تبدیلی کو ان شاء اللہ پوری طرح واضح کر دے گا۔

۱۔ اصول فقہ کے مطابق 'أَدْلَةُ شَرَعِيَّتِهِ' چار قرار پائے:

۱۔ قرآن

۲۔ سنت

۳۔ اجماع اور

۴۔ قیاس

دقت نظر سے تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ موجودہ اسلام میں 'قرآن' تابع ہے 'سنت' (حدیث) کے، 'سنت' (حدیث) تابع ہے 'اجماع' کے اور 'اجماع' تابع ہے 'قیاس' کے اور 'قیاس' کسی فرد (علما) کی رائے کو کہتے ہیں۔

۲۔ 'علما' کے نزدیک 'قرآن' اور 'سنت' 'حدیث' ہیں۔ چنانچہ 'حدیث' کے تین اقسام قرار پائے:

۱۔ حدیث باعتبار حقیقت

۲۔ حدیث باعتبار سند اور

۳۔ حدیث باعتبار مصدر سنت

۳۔ سنت باعتبار حقیقت کی 'علما' نے دو قسمیں قرار دی ہیں:

۱۔ سنت قولیہ اور

۲۔ سنت فعلیہ

۴۔ حدیث باعتبار مصدر سنت کی 'علما' نے دو قسمیں قرار دی ہیں:

۱۔ سنت نبویہ اور

۲۔ سنت صحابہ

۵۔ 'علما' کے نزدیک 'حدیث' (یعنی قرآن و سنت) دراصل 'اجماع' ہیں۔ چنانچہ حدیث باعتبار سند

کی دو اقسام قرار پائیں:

۱۔ مسند اور ۲۔ مرسل

۶۔ احادیث مسند کی تین قسمیں قرار دی گئیں:

۱۔ متواتر

۲۔ مشہور اور

۳۔ خبر واحد

(اصول حدیث کے مطابق (۱) الخبر المتواتر اور (۲) خبر الآحاد۔ مشہور، عزیز اور غریب)

۷۔ احادیث مرسل کی چار قسمیں قرار دی گئیں:

۱۔ مرسل صحابی ۲۔ مرسل تابعی ۳۔ مرسل تبع تابعی اور ۴۔ مرسل غیر

۸۔ 'علما' کے مطابق اجماع بھی قیاس ہے مگر اتفاقی یعنی 'علما کی آرا کے اتفاق' کو اجماع کہتے ہیں۔

چنانچہ اس اجماع کے تین اقسام قرار دیئے گئے:

۱۔ اجماع باعتبار صورت اتفاق

۲۔ اجماع باعتبار اہل اجماع و حال اجماع

۳۔ اجماع باعتبار نقل و مراتب۔

۹۔ ۱۔ اجماع باعتبار صورت اتفاق کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ صریح اور

۲۔ سکوتی

۲۔ اجماع صریح کی دو قسمیں قرار دی گئیں:

۱۔ صریح فعلی اور

۲۔ صریح قولی

۳۔ اسی طرح 'اجماع سکوتی' کی دو قسمیں قرار دی گئیں:

۱۔ اجماع سکوتی قولی اور

۲۔ اجماع سکوتی فعلی

۴۔ اجماع باعتبار اہل اجماع و حال اجماع کی دو قسمیں قرار دی گئیں:

۱۔ اجماع صحابہ اور

۲۔ اجماع ماسوائے صحابہ

۵۔ اجماع صحابہ کی دو قسمیں قرار دی گئیں:

۱۔ صریح اور

۲۔ سکوتی

۶۔ اجماع ماسوائے صحابہ کی دو قسمیں قرار دی گئیں:

۱۔ اجماع بدون اختلاف سابق اور

۲۔ اجماع بعد از اختلاف سابق

۷۔ اجماع باعتبار نقل و مراتب کی تین قسمیں قرار دی گئیں:

۱۔ اجماع متواتر

۲۔ اجماع مشہور اور

۳۔ اجماع احادی

۱۰۔ 'علماء' نے علما کے ذریعہ 'رای' کے اظہار اور اسے اختیار کرنے کو اجتہاد قرار دیا ہے۔ چنانچہ:

۱۔ اجتہاد کی دو قسمیں قرار دی گئی ہیں:

۱۔ اجتہاد عقلی اور

۲۔ اجتہاد بیانی

۲۔ اجتہاد عقلی کی کم از کم چار قسمیں قرار دی گئی ہیں:

۱۔ قیاس

۲۔ استصلاح

۳۔ استحصان اور

۴۔ استصحاب

۳۔ علمائے 'قیاس' کی دو قسمیں قرار دی ہیں:

۱۔ قیاس جلی اور

۲۔ قیاس خفی

۴۔ علمائے استصلاح کو 'مصلحت' سے مشروط کیا ہے جس کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ ضرورات

۲۔ حاجات اور

۳۔ تحسینات

۵۔ علمائے استحصان کی چار قسمیں قرار دی ہیں:

۱۔ استحصان بالعقل

۲۔ استحصان بالاثار

۳۔ استحصان بالتعامل اور

۴۔ استحصان بالضرورة۔

۶۔ اسی طرح 'علمائے استصحاب' کی دو قسمیں قرار دی ہیں:

۱۔ استصحاب عدم اصلی اور

۲۔ استصحاب حکم شرعی۔

۱۱۔ اصولیین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی 'مراد' کی نعوذ باللہ تحدید اور تعیین کرنے کا منصب جلیلہ

'علمائے کوعطا فرما دیا ہے۔ چنانچہ 'علمائے کوعطا' کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی 'مراد' کی تحدید و تعیین کو 'اجتہاد' بیانی کہا جاتا ہے۔

۱۲۔ 'علمائے کوعطا' نے دائرہ عمل کے اعتبار سے 'علمائے کوعطا' کی دو قسمیں قرار دی ہیں:

۱۔ اجتہاد مطلق اور

۲۔ اجتہاد مقید

'اجتہاد مطلق' کو 'اجتہاد مستقل' اور 'اجتہاد فی الشرع' بھی کہتے ہیں۔

'اجتہاد مقید' کی چار قسمیں قرار دی گئی ہیں:

۱۔ مذہب میں اجتہاد

۲۔ مسائل میں اجتہاد

۳۔ تخریج میں اجتہاد اور

۴۔ ترجیح میں اجتہاد

۱۳۔ 661 عیسوی کے بعد رائج کردہ اسلام میں 'علمائے کوعطا' نے اپنے علاوہ امت مسلمہ کے ہر فرد کو

'تقلید محض' کا پابند کیا ہے۔ 'تقلید محض' کا مفہوم ہے "کسی مجتہد سے منقول مسائل کی بابت تحقیق کے بغیر (؟) ان کو نقل کرنا اور ان پر عمل کرنا"۔

۱۴۔ یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اس اسلام میں 'فرد' سے مراد دو قسموں کے افراد ہیں:

۱۔ عام 'علما' اور

۲۔ بقیہ امت مسلمہ

چنانچہ 'علما' کے مطابق یہاں بھی 'تقلیدِ محض' کی دو صورتیں جاری ہوئیں:

۱۔ عام علما: عام علما کی 'تقلیدِ محض' سے مراد ہے عام علما کو براہ راست کتابوں سے مذہب کے اقوال

کا علم ہوتا ہے۔

۲۔ بقیہ امت مسلمہ: بقیہ امت مسلمہ کی 'تقلیدِ محض' سے مراد ہے 'علما' سے سن کر بلا تحقیق ان کو نقل

کرنا اور ان پر عمل کرنا۔

۹۔ 661 عیسوی کے بعد اسلام مکمل طور پر ربیائی یہودیت (Rabbinic Judaism) بنا دیا

گیا۔ جس طرح ربیائی یہودیت میں سو فرین کی تحدید کے بعد توراہ کے متن کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی۔

اب اس کے وہی معنی معتبر اور مقبول بلکہ قابل قبول تھے جو 'ماثورہ' کے عین مطابق ہوں۔ یہی بات 'تفسیر

بالماتورہ' کے نام سے اسلام میں مکمل طور پر درآمد کر لی گئی۔ متن قرآن کی اسلام میں اب کوئی اہمیت باقی

نہیں بچی تھی۔ اب اس کے وہی معنی معتبر اور قابل قبول تھے جو تفسیر بالماتورہ کے عین مطابق ہوں۔ جس

طرح ربیائی یہودیت میں توراہ کے دو حصے قرار دیئے گئے: اول: هَلْخَاه (חלצה) اور دوم: هگآذہ

(הגדה)۔ چنانچہ ربیائی یہودیت نے هَلْخَاه کو رائج اور هگآذہ کو مرجوح قرار دیا۔ 661 کے بعد اسلام

میں بھی قرآن کی یہی صورت قرار دی گئی۔ قرآن کو 'حدیث متواتر' قرار دے کر رائج اور بقیہ قرآن یعنی

مشہور، شاذ اور آحاد کو حدیث مشہور، شاذ اور آحاد قرار دے کر مرجوح قرار دے دیا گیا۔ اس پر مستزاد

'قرآن' کو حدیث متواتر قرار دیا گیا لیکن اسے ماورائے قرآن 'احادیث' کے تابع قرار دے دیا گیا۔

۱۰۔ اس 'ظلم' کے لئے ربیائی یہودیت (Rabbinic Judaism) سے ایک اصطلاح بطور

خاص درآمد کی گئی۔ یہ اصطلاح تھی 'نسخ' (נסח)۔ اسلام میں نسخ کے معنی بیان کئے گئے:

'سابق حکم شرعی کو بعد کی کسی شرعی دلیل کے ذریعہ ختم کر دینا'۔ اس کی حکمت بیان کی گئی کہ زمانہ کے

ساتھ بندوں کے مصالح اور تقاضے بدلتے رہتے ہیں اور تمام احکام شرع کی بنیاد بندوں کے مصالح پر

ہے۔ اس کی ایک ایسی اصولی تعریف کی گئی جس سے اس کی وسعت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے:

"النسخ فی اصطلاح الأصولیین هو ابطال العمل بالحکم الشرعی بدلیل متراخ"

عنه، يدل على ابطاله صراحةً و ضمناً، ابطالاً كلياً او ابطالاً جزئياً لمصلحة اقتضته أو هو اظهار دليل لاحق نسخ ضمناً العمل بدليل سابق“ -

[ملاحظہ فرمائیں: عبدالوہاب خلاف: علم اصول الفقہ: دار القلم: کویت]

اسی طرح اس کی حکمت کی وسعت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے:

”وهذا النسخ وقع في التشريع الالهي، ويقع في كل تشريع وضعي، لأن المقصود من كل تشريع سواء أكان إلهياً أم وضعياً تحقيق مصالح الناس. ومصالح الناس قد تتغير بتغير احوالهم. والحكم قد يشرع لتحقيق مصالح اقتضتها أسباب، فإذا زالت الأسباب فلا مصلحة في بقاء الحكم.“ [ملاحظہ فرمائیں: حوالہ سابق]

چنانچہ نسخ کی صورتوں کو علماء نے چار قرار دیا:

۱۔ قرآن مجید کا نسخ قرآن سے: واضح رہے کہ موجودہ ’قرآن‘ قرآن ’مُنزَل‘ مِن اللہ نہیں بلکہ ’علماء‘ کے نزدیک ’حدیث متواتر‘ ہے۔

۲۔ قرآن (حدیث متواتر) کا نسخ حدیث سے،

۳۔ حدیث کا نسخ قرآن (حدیث متواتر) سے — اور

۴۔ حدیث کا نسخ حدیث سے۔

اس اعتبار سے آیات اور احکام کی دو قسمیں قرار دی گئیں:

۱۔ ناسخ اور

۲۔ منسوخ

منسوخ آیات اور حکم کی چار قسمیں قرار دی گئیں:

۱۔ حکم اور تلاوت دونوں منسوخ ہوں

۲۔ حکم منسوخ ہو تلاوت منسوخ نہ ہو

۳۔ تلاوت منسوخ ہو حکم منسوخ نہ ہو۔۔ اور

۴۔ حکم کا کوئی وصف منسوخ ہو۔

لطف یہ ہے کہ خود قرآن کی آیات منسوخہ کی کوئی متعین، مستند اور معلوم تعداد نہیں۔ چنانچہ ’بعض علماء‘

نے مثلاً قاضی ابن عربی المالکی اور جلال الدین السیوطی نے بیس سے زیادہ آیات کو منسوخ قرار دیا ہے

جب کہ مثلاً شاہ ولی اللہ نے صرف پانچ آیات کو منسوخ قرار دیا ہے۔

[ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ فخر الدین رازی: مفاتیح الغیب (تفسیر کبیر)

۲۔ ابن العربی: احکام القرآن

۳۔ شاہ ولی اللہ: الفوز الکبیر فی اصول التفسیر]

چنانچہ بہ نظر غائر دیکھا جائے تو قرآن جیسے 'جسد متعین' (Fixed Corpus) کو پوری طرح حدیث جیسے جسد غیر متعین (Non-Fixed Corpus) کے ماتحت کر دیا گیا ہے اور اس حدیث (Non-Corpus) کو رد اور قبول اور تعبیر و تاویل کے اعتبار سے 'علما' کے ماتحت کر دیا گیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان دونوں مآخذ یعنی قرآن (علما کے نزدیک حدیث متواتر، مشہور، شاذ اور آحاد) اور حدیث (علما کے نزدیک متواتر، مشہور اور خیر واحد) کے حکم تکلفی اور حکم وضعی کی ہر صورت 'علما' کے فہم پر مبنی کر دی گئی۔

۱۔ چنانچہ حکم تکلفی کی دو قسمیں کی گئیں:

۱۔ حکم تکلفی باعتبار دلائل ثبوت و قیود تعریف اور

۲۔ حکم تکلفی باعتبار احوال و اعذار

حکم تکلفی باعتبار دلائل ثبوت و قیود تعریف کی دو صورتیں تسلیم کی گئیں:

۱۔ جائز اور

۲۔ جائز از بعض وجوہ و ناجائز از بعض وجوہ

چنانچہ جائز کی 'علما' نے پانچ قسمیں قرار دی ہیں:

۱۔ فرض

۲۔ واجب

۳۔ سنت

۴۔ مستحب اور

۵۔ مباح

اسی طرح جائز از بعض وجوہ اور ناجائز از بعض وجوہ کی چار قسمیں قرار دی گئی ہیں:

۱۔ مکروہ تحریمی

۲۔ مکروہ تنزیہی

۳۔ خلافِ اولیٰ اور

۴۔ حرام

۲۔ حکم وضعی کو علماء نے پانچ امور سے مقید و محدود کیا ہے:

۱۔ علت

۲۔ شرط

۳۔ سبب

۴۔ علامت

۵۔ مانع

علت کی دو قسمیں قرار دی گئی ہیں:

۱۔ علتِ منصوصہ اور

۲۔ علتِ مستنبطہ

شرط کے تین اقسام کئے گئے ہیں:

۱۔ شرط باعتبارِ ذات

۲۔ شرط باعتبارِ متعلق

۳۔ شرط باعتبارِ اوصاف

سبب کے دو اقسام کئے گئے ہیں:

۱۔ سبب باعتبارِ ذات اور

۲۔ سبب باعتبارِ متعلقات و اوصاف

مانع کی دو قسمیں کی گئی ہیں:

۱۔ مانع از حکم تکلفی اور

۲۔ مانع از حکم وضعی

چنانچہ قرآن اور حدیث میں جتنے الفاظ ہیں ان میں ایک ایک لفظ کے صرف وہی معنی معتبر اور قابل

قبول ہوں گے جو 'علما' کی رائے ہوگی۔ چنانچہ لفظ کے معنی کے اعتبار سے 'علما' نے اس کی پانچ قسمیں قرار دی ہیں:

۱۔ لفظ باعتبار خفاء معنی

۲۔ لفظ باعتبار ظہور معنی

۳۔ لفظ باعتبار تعدد و توحید معنی

۴۔ لفظ باعتبار استعمال در معنی اور

۵۔ لفظ باعتبار استدلال از معنی۔

چنانچہ الفاظ باعتبار خفاء معنی کی چار قسمیں قرار دی گئیں:

۱۔ خفی

۲۔ مُشِکِل

۳۔ مُجْمَل اور

۴۔ مُتَشَابِه۔

الفاظ باعتبار ظہور معنی کی چار قسمیں قرار دی گئیں:

۱۔ ظاہر

۲۔ نص

۳۔ مفتر — اور

۴۔ محکم

الفاظ باعتبار تعدد و توحید معنی کی چار قسمیں قرار دی گئیں:

۱۔ خاص

۲۔ عام

۳۔ مشترک

۴۔ موؤل

الفاظ باعتبار استعمال در معنی کی دو قسمیں قرار دی گئیں:

۱۔ حقیقت اور

۲۔ مجاز

اور الفاظ باعتبار استدلال از معنی کی چار قسمیں قرار دی گئیں:

۱۔ عِبَارَةُ النَّصِّ

۲۔ اِشَارَةُ النَّصِّ

۳۔ دَلَالَةُ النَّصِّ اور

۴۔ مُقْتَضَى النَّصِّ

الفاظ باعتبار تعدد و توحد معنی کے تحت بیان کردہ 'خاص' کی دو قسمیں قرار دی گئیں:

۱۔ خاص باعتبار معنی اور

۲۔ خاص باعتبار تقييد

خاص باعتبار معنی کی دو قسمیں قرار دی گئیں:

۱۔ امر اور

۲۔ نہی

خاص باعتبار تقييد کی دو قسمیں قرار دی گئیں:

۱۔ مُطْلَق اور

۲۔ مُقَيَّد

خاص باعتبار معنی کی دو قسموں میں 'امر' کی پانچ قسمیں قرار دی گئیں:

۱۔ امر باعتبار حَسَن

۲۔ امر باعتبار تعلق وقت

۳۔ امر باعتبار تعین مامور بہ

۴۔ امر باعتبار تحدید مقدار

۵۔ امر باعتبار ذات

نہی کی دو قسمیں قرار دی گئیں:

۱۔ قَبِيحٌ لِعَيْنِيْهِ اور

۲۔ قَبِيحٌ لِعَيْزِهِ

۱۱۔ اس طول بحث کا مقصد عاجز کے نزدیک صرف یہ واضح کرنا ہے کہ 661 عیسوی کے بعد رائج کردہ اسلام کے ایک ایک لفظ کے صرف وہی معنی معتبر اور قابل قبول ہیں جو 'علماء' نے متعین کئے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر کسی حکم کا اللہ اور اللہ کے رسول کے مفہوم سے مطابقت ظاہر کی جاتی ہے تو محض اس لئے اور صرف اس حد تک کہ انھیں 'علماء' نے معتبر اور قابل قبول قرار دیا ہے۔ ورنہ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ نسخ، حدیث، اجماع، اجتہاد عقلی، اجتہاد بیانی، عرف اور عادت جیسے 'ادوات' (Instruments) سے اللہ اور رسول کی ہر مراد کو رد کیا جاسکتا ہے۔ 900 عیسوی آتے آتے ان 'علماء' نے جو دراصل اسلام کو 'ربیائی یہودیت' (Rabbinic Judaism) میں ڈھالنے کے ذمہ دار تھے انہوں نے کسی تبدیلی کا سلسلہ ہی ہمیشہ کے لئے منقطع کر دیا۔ چنانچہ اعلان کر دیا گیا کہ 'اجتہاد مطلق' کا دروازہ عملاً بند کر دیا گیا ہے اور اسلام میں 'علماء' اسی مقام بلند پر فائز کر دیئے گئے جہاں 'ربیائی یہودیت' (Rabbinic Judaism) میں اللہ اور حضرت موسیٰ کو بے دخل کر کے 'علماء' یہود فائز کر دیئے گئے تھے جن کے بارے میں قرآن نے فرمایا تھا:

اتخذوا حبارہم ورهبانہم ارباباً من دون اللہ والمسیح بن مریم (التوبہ ۳۱)

ترجمہ: شہر الیاء (یہودیوں نے) اپنے 'علماء' کو خدا اللہ کو چھوڑ کر اور (شہر الیاء نصاریٰ نے) اپنے درویشوں کو (خدا اللہ کو چھوڑ کر) اور مسیح ابن مریم کو۔

[ملاحظہ فرمائیں:]

- | | |
|---|--|
| ۱۔ محمد بن الحسن الشیبانی : کتاب الأصل | : دائرة المعارف العثمانیہ،
حیدرآباد |
| ۲۔ قاضی ابو یوسف : کتاب الخراج | : بولاق، مصر |
| ۳۔ محمد بن ادریس الشافعی : کتاب الأم | : دار المعرفة، بیروت |
| ۴۔ محمد بن ادریس الشافعی : الرسالة | : المكتبة العلمیة، بیروت |
| ۵۔ احمد بن محمد البرقی : المحاسن | : المجمع العلمی لاهل
البيت، بیروت |
| ۶۔ محمد بن یعقوب الکلینی : الأصول من الکافی | : دار الأضواء، بیروت |
| ۷۔ فیض اکاشانی : کتاب الوافی | : مكتبة الامام، اصفہان |

- ۸۔ شیخ صدوق : کتاب من لا یحضرہ الفقیہ : دار التعارف، بیروت
- ۹۔ محمد بن الحسن الشیبانی : الجامع الصغیر :
- ۱۰۔ محمد بن الحسن الشیبانی : السیر الکبیر :
- ۱۱۔ محمد بن الحسن الشیبانی : الجامع الکبیر :
- ۱۲۔ محمد بن الحسن الشیبانی : کتاب الآثار :
ادارۃ القرآن والعلوم
الاسلامیہ، کراچی
- ۱۳۔ القاضی النعمان بن محمد : کتاب اختلاف اصول
المذاهب :
المعهد الهندی للدراسة
المتقدمة: 1972
قاہرہ :
- ۱۴۔ القاضی النعمان بن محمد : دعائم الإسلام :
قاہرہ :
- ۱۳۔ محمد بن عبد اللہ الحاکم : معرفة علوم الحديث :
دائرة المعارف العثمانیہ،
حیدرآباد
نیسا پوری
- ۱۴۔ ابوبکر احمد خطیب : الکفاية في علم الرواية :
دائرة المعارف العثمانیہ،
حیدرآباد
البغدادی
- ۱۵۔ ابن حجر العسقلانی : نخبة الفكر في مصطلح اهل
الأثر :
- ۱۶۔ ابن نقطۃ : کتاب التقييد لمعرفة الرواة و :
دائرة المعارف العثمانیہ،
حیدرآباد
السنن والمسانيد:
- ۱۷۔ عبد الوہاب خلاف : علم أصول الفقه :
دار القلم، کویت
- ۱۸۔ اسرار عالم : امت کا بحران :
دار العلم، نئی دہلی ۲۰۰۶

ذہنی بحران

۱۔ گزشتہ چودہ سو سالوں کی مسلم تاریخ کا جائزہ 'علما' کے تعامل کے پیٹرن (Pattern) کو بخوبی واضح کرتا ہے۔ علما کے تعامل کے اس مخصوص پیٹرن (Pattern) اور اس کی حرکیات (Dynamics) کا ہی نتیجہ ہے کہ امت مسلمہ صد فی صد مکیف (Conditioned) ہو کر ذہنی اور عملی اعتبار سے بالکل مفلوج ہو گئی۔ قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلم معاشرے کا رشتہ منقطع کر دیا گیا۔ قرآن امت مسلمہ کے درمیان اجنبی بنا دیا گیا۔ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت امت مسلمہ کے درمیان نہ صرف عملاً مٹا دی گئی بلکہ اس کے نقوش تک باقی نہیں رہے۔ قرآن کا سیکھنا، سکھانا، قرآنی زندگی کا عملی نمونہ بننا حرام، ممنوع اور شنیع قرار دے دیا گیا۔ قرآن کی اور قرآن میں تحقیق گمراہی قرار دے دی گئیں۔ چنانچہ اس کا لازمی نتیجہ یہی نکلا کہ امت مسلمہ ذہنی، فکری، علمی، عملی، تجرباتی، اخلاقی غرض ہر اعتبار سے معطل اور مفلوج ہو کر رہ گئی۔

مسلم تاریخ کے ہر صفحے پر موجود چودہ سو سالوں میں 'علما' کے تعامل کے اس مخصوص پیٹرن (Pattern) کا جائزہ اس بحث کو بے جا طویل اور دشوار بنا دے گا چنانچہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ صرف گزشتہ تین سو سالوں کے پیٹرن کا جائزہ لے لیا جائے وہ بھی نہایت مختصر۔ مختصر اس لئے کہ آج کا کوئی بھی عام مسلمان کسی نہ کسی قدر ان باتوں سے بخوبی واقف ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بعض کے پاس اس کا مبسوط اور مفصل علم ہے تو بعض کے پاس مختصر اور مجمل۔

۲۔ گزشتہ تین سو سالوں میں 'علما' کے تعامل (فکر و عمل) کے پیٹرن کی حرکیت میں دو باتیں بے حد

نمایاں ہیں:

۱۔ حوادث سے مکمل بے خبری: چنانچہ ہرنی شے اور حادثہ سے اولاً علما کا اغماض۔ اور ہر اغماض کی صورت اس سے بدگمانی اور وحشت: 'علما' کا یہ ایک عجیب و غریب اور ناقابل فہم پیٹرن (Pattern) اور اس کی حرکیت (Dynamics) ہے۔ غور کرنے سے اس کا علم ہوتا ہے کہ اس پورے پیٹرن کی بنیاد 'لا علمی' یا 'بے خبری' ہے۔ لیکن یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ یہ 'لا علمی' یا 'بے خبری' مجرد لا علمی یا بے خبری ہوتی تو چنداں قابل تشویش نہیں تھی۔ مجرد لا علمی یا بے خبری عام انسانی خاصہ ہے۔ ہم سب زندگی کے بہت سارے امور، حوادث اور حقائق سے عموماً لا علم یا بے خبر ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہر لمحے زندگی کی عملیت اور حرکیت ہمیں اس آزمائش سے دو چار کرتی رہتی ہے اور ہم فوراً باخبر ہو جاتے ہیں کہ فلاں بات سے ہم اب تک لا علم اور بے خبر تھے۔ بے خبری اور لا علمی معمولی اور عام باتوں کی ہو سکتی ہے اور اہم باتوں کی بھی۔ تیس سالوں قبل کی بات ہے عاجز پہاڑی بھوجلہ میں اہل علم کی ایک مجلس میں بیٹھا تھا۔ عاجز نے حاضرین مجلس سے دریافت کیا کہ سید محمد امیر المعروف بہ میر پنچہ کش کا مزار کہاں ہے؟ عاجز کا خیال تھا کہ وہ جس جگہ بیٹھا ہے اسی کے آس پاس کہیں ان کا مزار ہے۔ حاضرین مجلس نے جواب دیا ہمیں نہیں معلوم یہاں کوئی ایسی قبر ہے۔ جب عاجز نے انھیں بتایا کہ وہ ایک یگانہ روزگار شخصیت کے مالک تھے۔ 1857 میں شہید ہوئے اور پہاڑی اٹلی پر مدفون ہیں تو انھیں بڑی حیرت ہوئی۔ اس طرح کبھی لا علمی یا بے خبری بسیط ہوتی ہے۔ لیکن جب انسان ایسی بسیط لا علمی اور بے خبری پر متنبہ ہوتا ہے تو تحقیق کے بعد اس کی یہ لا علمی اور بے خبری بھی دور ہو جاتی ہے۔ لیکن لا علمی اور بے خبری کی ایک اور نادر مگر مہلک قسم پائی جاتی ہے جس میں مبتلا انسان ہزاروں بار متنبہ ہونے کے باوجود متحرک اور مائل بہ جستجو و تحقیق نہیں ہوتا۔ یہ لا علمی اور بے خبری اس شخص کے اندر پائے جانے والے ایک قسم کے 'کاذب علم' سے راسخ ہو جاتی ہے۔ جب کوئی طریقہ تعلیم کسی انسان کو 'علم' اور سب کچھ جاننے والا قرار دے دیتا ہے تو وہ اس قسم کے 'کاذب علم' کے فریب بلکہ سحر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ گزشتہ چودہ سو سالوں سے 'علما' کا رائج کردہ 'علم' جو مدرسوں میں یا علما کے ذریعہ دیا جاتا رہا ہے اسی قسم سے تعلق رکھتا ہے۔ مدارس میں دیا جانے والا علم انسانی دماغ کو صدنی صد مکئیف (Conditioned) کر دیتا ہے۔ اس کی فی الواقع وہی حالت ہو جاتی ہے جو 'اسمیک' کے نشے کے عادی انسان کی ہوتی ہے جسے اپنے ماحول اور اس کے حوادث کی خبر ہوتی ہے اور نہ پرواہ۔ چودہ

سوسالوں سے 'علما' اور ان کے مدارس ایک ایسے 'علم' سے مسلمانوں کو سیراب کرتے رہے ہیں جن کی حالت دیکھ کر 'جہل مرکب' بھی لرزہ بر اندام ہو جاتا ہے۔ مدرسوں کا نظام تعلیم کسی متوازی طریقہ علم سے کوئی اعلیٰ و ارفع علم نہیں دیتا بلکہ انسان کی دماغی صلاحیتوں مثلاً قوتِ متخیلہ، قوتِ مدرکہ اور قوتِ وجدانیہ کو یکسر معطل اور مفلوج کر دیتا ہے۔ سوال اس کا نہیں کہ مدرسوں میں جاری نظام تعلیم طلبہ کو علمِ طبیعیات اور علمِ کیمیا کیوں نہیں سکھاتا؟ کاش بات اتنی ہی ہوتی! بد قسمتی یہ ہے کہ مدارس میں ایک ایسا 'کاذب علم' دیا جاتا ہے کہ اس علم سے بہرہ ور ہوتے ہی انسان قرآن اور احادیث کے فہم، اس میں درک اور اس میں تحقیق کی ہر قوت سے مستقل طور پر معطل اور مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے۔ مدارس کے اس علم سے بہرہ مند انسان قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کے پڑھنے، اسے سمجھنے اور اس سے ہدایت لینے کی صلاحیت، استعداد، طلب، آمادگی اور ہمت سے ہی محروم ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ تعلیم دراصل اس کی انسانی 'فطرت' اور 'جبلت' کو مسخ کر کے رکھ دیتی ہے۔ چنانچہ قوتِ متخیلہ، قوتِ مدرکہ اور قوتِ وجدانیہ کی مستقل اور مکمل معطلی نے پچھلے چودہ سوسالوں سے ان مدارس سے تعلیم حاصل کر کے نکلنے والے 'علما' کو کس درجہ مفلوج کر کے رکھ دیا ہے اس کی مثالیں ہمارے 'ذخیرہ علم' میں ہزاروں مقامات پر بکھری مل جائیں گی۔ عاجز یہاں صرف تین مثالوں پر اکتفا کرتا ہے جن میں ایک قرآن کی ہے، دوسری حدیث کی ہے اور تیسری تاریخ کی ہے۔ چودہ سوسالوں سے 'علما' کو ان کے معانی سمجھنے اور ان کی تحقیق کرنے کا خیال ہی نہیں آیا۔

۱۔ قرآن کی مثال: لإیلف قریش۔ الفہم رحلة الشتاء والصیف (قریش: ۱-۲)

۲۔ حدیث کی مثال: حدثنا موسیٰ حدثنا عبد الواحد حدثنا کلیب حدثنی

ربیبة النبی صلی اللہ علیہ وسلم و اظنہا زینب قالت نہی رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم عن الدباء و الحنتم و المقیر و المزفت و قلت لها اخبرینی

النبی صلی اللہ علیہ وسلم ممن کان من مضر کان؟ قالت: فمن کان إلا من

مضر۔ کان من ولد النضر بن کنانہ۔ (بخاری: کتاب المناقب)

۳۔ تاریخ کی مثال:

ألا أيها الشارون قدحان لأمری

شری نفسہ لیلہ ان یترا خلا

(تاریخ طبری: ۳)

چنانچہ چودہ سو سالوں سے رائج کردہ یہ طریقہ تعلیم وہ منبع شر ہے جس نے مسلمانوں کی قوتِ متخیلہ، قوتِ مدرکہ اور قوتِ وجدانیہ کو مستقل اور مکمل طور پر مفلوج و معطل کر کے اذہان کو مکئیف (Conditioned) کر دیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہر نئے حادثے پر اس ذہن کی حرکیات (Dynamics) مکمل کنارہ کشی حتیٰ کہ آنکھیں بند کر لینے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ہر نئی شے کو پرکھنے اور جاننے کو حرام قرار دیتی ہے۔ فطرت کی جانب سے قلب و نظر میں اٹھنے والے ہر سوال کو سختی سے دبا دیتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس طریقہ علم کی راہ میں قرآن 'علما' کے لئے سب سے بڑی رکاوٹ ہے جو ہر لمحے انسان کی قوتِ متخیلہ، قوتِ مدرکہ اور قوتِ وجدانیہ کو ہمیز کرتا رہتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ 'علما' عام طور پر قرآن سے مواجہہ پر سخت متوحش ہوتے ہیں اور اس سے حصول برکت و ثواب سے زیادہ میل جول رکھنا نہیں چاہتے ہیں۔ 'علما' قرآن سے دور کی صاحب سلامت میں عافیت سمجھتے ہیں۔ قرآن انسان کو غور و فکر کے لئے ہمیشہ ہمیز کرتا ہے:

۱۔ واللہ اخرجکم من بطون امہتکم لا تعلمون شئیا و جعل لکم السمع والا
بصار والافئدہ لعلکم تشکرون (النحل ۷۸)

قرآن ان سے کام لینے کا حکم فرماتا ہے:

(الف) انظر الی العظام کیف ننشزھا (البقرہ ۲۵۹)

(ب) فسیر وافی الأرض فانظر واکیف کان عاقبۃ المکذبین (النحل ۳۶)

(ج) الم تر الی ربک کیف مد الظل ولو شاء لجعلہ ساکنا (الفرقان ۳۵)

جو لوگ قوتِ متخیلہ، قوتِ مدرکہ اور قوتِ وجدانیہ کو معطل کر دیتے ہیں ان سے قرآن شکایت کرتا ہے:

۱۔ وهو الذی انشالکم السمع والابصار والافئدۃ قلیلا ما تشکرون (المومنون ۷۸)

چنانچہ چودہ سو سالوں سے مدارس میں ایک ایسا طریقہ تعلیم رائج ہے جس نے قرآن کو مسلمانوں کی زندگی سے خارج کر دیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ لاعلمی اور بے خبری کو دور کرنے کے لئے سوال، مشاہدہ اور مناظرہ 'علما' کے ذریعہ عقیدے کا مسئلہ قرار دے کر حرام قرار دیئے جاتے رہے ہیں۔ ہر نئے حادثے سے باخبر ہونے والا اور سوال، مشاہدہ اور مناظرہ کرنے والا اول و ہلہ میں 'علما' کے ذریعہ کافر، زندیق اور مرتد قرار دے دیا جاتا ہے۔

عجیب و غریب بات یہ ہے کہ پچاس سے سو سال کے اندر اندر وہی 'علما' بغیر کسی دلیل کے اس حرام قرار دی گئی شے کو از خود حلال قرار دے دیتے ہیں۔ بلکہ خود اس کے حق میں دلیل دے کر انہیں جائز اور

حلال قرار دے دیتے ہیں۔

۲۔ 'علما' کے یہاں حرام سے حلال تک کے سفر کی تدریج: 'علما' کے تعامل کا یہ دوسرا جز ہے۔ اس جز کے دو ذیلی پیٹرن ہیں:

- ۱۔ ہر شے پہلی نظر میں 'حرام' قرار پاتی ہے پھر رفتہ رفتہ وہ از خود حلال ہو جاتی ہے۔
- ۲۔ متقدمین کی ہر 'حرام' کردہ 'شی' اور 'حکم' متاخرین کے ذریعہ بلا دلیل حلال ہو جاتی ہے۔ چنانچہ پہلے ذیلی پیٹرن کے مطابق ہر نئی شے یا امر 'پہلی نظر میں' 'حرام' پھر پچیس سے پچاس سالوں میں 'مکروہ'۔ اگلے پچاس سالوں میں 'جائز بالکراہت'، پھر اگلے پچاس سالوں میں 'جائز' اور اکثر اوقات 'مندوب' اور 'واجب' ہو جاتی ہے۔

دوسرے ذیلی پیٹرن کے مطابق متقدمین یا سابقین فقہ میں موجود دلیلوں سے جن چیزوں اور جن امور کو 'حرام' قرار دیتے ہیں متاخرین یا لاحقین اسی فقہ کی دلیلوں سے انھیں 'حلال' اور 'خس' قرار دے دیتے ہیں۔

۳۔ چنانچہ چودہ سو سالوں کے اس تعامل کو دیکھ کر دو سوالات دماغ میں آتے ہیں:

- ۱۔ کیا متقدمین اسلام سے ناواقف تھے یا متاخرین ناواقف ہیں؟
 - ۲۔ کیا فقہ واقعی کوئی علم ہے یا کوئی ایسا آلہ جس کے ذریعہ اسے برتنے والا اپنی ضرورت اور مصلحت کے مطابق جب چاہے کسی حلال شے کو حرام قرار دے دے اور جب چاہے کسی حرام شے کو حلال؟
- صرف گزشتہ تین سو سالوں میں 'علما' کے یہ دو پیٹرن اتنے نمایاں اور ان کی یادیں ابھی ساٹھ ستر سال کی عمر والوں کے حافظے میں اتنی تازہ ہیں کہ آج کا ہر مسلمان انھیں بخوبی جانتا ہے یا باآسانی جان سکتا ہے:
- (الف) اول الذکر کی مثالیں: تصویر (Picture)، فوٹو گرافی، ٹیلی فون، انگریزی تعلیم، تھری پیس سوٹ، ٹیبل پر کھانا کھانا، ریڈیو، ٹیلی ویژن، مائک پر اذان دینا اور نماز کی ادائیگی، گھڑی باندھ کر نماز، موبائل، ہوائی جہاز پر نماز کی ادائیگی، بغیر محرم کے خواتین کا سفر کرنا وغیرہ۔

(ب) ثانی الذکر کی مثالیں: سود لینا اور دینا، سودی کاروبار کرنا، بینک سے استفادہ کرنا، اسلامی بینک کاری کے نام پر پورے بینکنگ نظام کو اختیار کر لینا، شیئر بازار سے مکمل استفادہ کرنا، دارالاسلام اور دارالحرب کے سارے قوانین کو نافذ رکھنا پھر یکسر کا عدم قرار دے دینا، خون اور انتقال خون (Blood & Blood) (Transfusion) سے استفادہ کو جائز کر دینا، اعضا کی پیوند کاری (Organ Transplantation)

اور مصنوعی طور پر حاملہ ہونے (Artificial Insemination) وغیرہ کو جائز کر دینا۔

اگر صرف تین سو سالوں کے اس پیٹرن پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلام کے سارے احکام کے جواز اور عدم جواز کا تعلق قرآن و سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں بلکہ علما کی 'معلومات' اور اس سے زیادہ ان کے 'مزاج'، 'پسند' اور 'قبولیت' سے رہا ہے۔ آخر قرآن نے 'اربابا من دُونِ اللہ' کا اور کیا مطلب لیا ہے؟

۴۔ اب جہاں تک 'علما' کے مزاج، ان کی معلومات اور ان کی قبولیت کا سوال ہے تو ظاہر ہے کہ ان امور کا تعلق ان کے ذہن (Mind) اور دماغ (Brain) سے ہے۔ غور طلب امر یہ ہے کہ 'علما' کے ذہن (Mind) کی کیا خصوصیات ہیں اور ان خصوصیات کی جڑ کہاں ہے؟ علما کے ذہن (Mind) اور دماغ (Brain) کا دقیق جائزہ بتاتا ہے کہ وہ تین خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ واضح رہے کہ جب مسلم معاشرہ صد فی صد مکثیف (Conditioned) تھا اور اب جب کہ وہ تکثیف (Conditioning) کلی طور پر ختم ہو چکی ہے دو الگ کیفیات کو مد نظر رکھنا ضروری ہے۔ جب مسلم معاشرہ صد فی صد مکثیف تھا تو 'حوادث' سے بے خبری اور لاعلمی کو گوشہٴ عافیت باسانی میسر ہو جاتی تھی۔ لیکن اس صورتحال کے ختم ہو جانے کے بعد اب مسلم معاشرہ کھلی دھوپ میں ہے اور 'علما' انھیں مکثیف رکھ کر فطری طور پر ان کے اندر پیدا ہونے والے سوال، مشاہدہ اور مناظرہ سے انہیں الگ نہیں رکھ سکتے۔ مذکورہ تین خصوصیات درج ذیل ہیں:

۱۔ شدید علمی پس ماندگی (Intense Epistemological Backwardness)

۲۔ شدید ادراکی پس ماندگی (Intense Intellectual / Ontological Backwardness)

۳۔ شدید ماضی وابستگی (Intense Past-Attachment)

'علما' کے اندر شدید ماضی وابستگی کی دو قسمیں پائی جاتیں ہیں:

۱۔ شدید ماضی وابستگی (جارحانہ)

۲۔ شدید ماضی وابستگی (انفعالی)

'علما' کے ذہن (Mind) اور دماغ (Brain) کی یہ تینوں خصوصیات تاریخ میں امت کے لئے ہمیشہ مضر بلکہ مہلک ثابت ہوئیں۔ ان تینوں خصوصیات کے دباؤ میں مسلم معاشرے میں گزشتہ چودہ سو سالوں میں اذہان اور ان کے افکار اور اعمال کے رد اور قبول درج ذیل دو احوال کے شکار ہو کر رہ گئے۔

۱۔ امت مسلمہ میں پیدا ہونے والے تمام ذہنی، فکری، علمی عباقرہ اور خلاق افراد 'علما' کے ذریعہ

زیند بنیق اور کافر قرار پائے چنانچہ ایسے افراد امت کا افادہ کر سکے نہ امت ان سے استفادہ کر سکی۔
 ۲۔ امت مسلمہ میں پیدا ہونے والے تمام ذہنی اور فکری طور پر غمی اور علمی طور پر پس ماندہ اور بلید ایسے افراد جن کی 'فطرت' مسخ ہو چکی تھی 'امام' اور 'مُجَدِّد' قرار پائے۔
 ۵۔ گزشتہ چودہ سو سالوں کے دوران متمکن ہو جانے والے ان 'علما' کی کارکردگی کا جائزہ لیا جائے تو مندرجہ ذیل امور کا ادراک ہوتا ہے:

۱۔ امت مسلمہ کو چودہ سو سالوں تک مکلف (Conditioned) بنائے رکھنے کے تہا ذمہ دار 'علما' ہیں۔
 ۲۔ 'علما' نے 'حکمران'۔ علما تعہد کے تحت چودہ سو سالوں تک امت کو حکمرانوں کے لئے منضبط (Regulated) رکھنے میں بلا شرکت غیرے کردار ادا کیا۔
 ۳۔ 'علما' نے ان چودہ سو سالوں کے دوران امت مسلمہ کو اللہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حقیقی دین اللہ سے دور رکھا اور ان کے اور امت مسلمہ کے مابین پہاڑ بن کر سد راہ بنے رہے۔
 ۴۔ 'علما' نے اسلام کو اجنبی (غریب) بنا دیا اور امت مسلمہ کے حقیقی اسلام سے باخبر ہونے کی ہر راہ بند کر دی۔

۵۔ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل کردہ 'ہدی' کو 'علما' نے امت مسلمہ میں 'محبوب' بنا دیا۔ قرآنی علم، تعلیم، تعالیم، تحقیق، تمحیص، تفحص اور مذاکرہ کو ممنوع قرار دے کر قرآن کو 'مہجور' بنا دیا۔

۶۔ 'علما' نے نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ کو مٹا کر اس کی جگہ جعلی سنت رائج کی۔ امت مسلمہ کے لئے سنت رسول پر چلنا مشکل بنا کر اس کی بحالی کو دشوار تر بنا دیا۔
 ۷۔ 'علما' نے چودہ سو سالوں سے امت کو پستی اور اضمحلال کی جانب دھکیلنے میں مفسدین کی مدد کی چنانچہ امت پر بتدریج امارت، ملوکیت، کاٹ کھانے والی بادشاہت، جبر اور ظلم والی بادشاہت اور فساد فی الارض عارض ہوتے چلے گئے۔

۸۔ 'علما' نے امت مسلمہ کے ذہن اور دماغ کو پس ماندگی کا عادی اور خوگر بنا دیا۔
 ۹۔ 'علما' نے امت مسلمہ کے ذہن اور دماغ کو قبل از وقت، بروقت حتی کہ بعد از وقت بھی فیصلہ لینے کے لائق نہیں رہنے دیا۔

۱۰۔ 'علما' نے امت مسلمہ کو عملاً پس رو (Lagging) بنا کر طبعاً پس رو (Limping) بنا دیا۔

۱۱۔ 'علماء' نے امت مسلمہ کو کبھی قرآنی تحقیق اور تدبیر کا سہارا لے کر Quantum Jump لینے یا Change of Scale کرنے کی اجازت نہیں دی۔

۱۲۔ 'علماء' نے پچھلے پچاس سالوں میں بالعموم اور حالیہ بیس سالوں میں بالخصوص امت مسلمہ کو تمام استعماری (Colonial) اور سرمایہ دارانہ قوتوں (Capitalistic Forces) کے مظالم کا شکار بنانے میں سب سے بڑے آلہ کار کی حیثیت سے کردار ادا کیا۔ یہ بات آج ہر باخبر انسان پر واضح ہے کہ گزشتہ بیس سالوں میں عالمی استعماری قوتوں (Global Colonial Powers)، عالمی سرمایہ دارانہ نظام کی قوتوں (Global Capitalistic System's Forces)، بڑے بڑے ملٹی نیشنل کارپوریشنز (Giant Multi-national Corporations)، اور عالمی بزنس ہاؤسز (Global Business Houses) کے عالمی بازار (Global Market) کو وسعت دینے اور مستحکم کرنے کے لئے 'فقہ' اکادمیوں (Fiqh Academies) نے سب سے بڑا رول ادا کیا ہے جس میں 'علماء' نے بڑھ چڑھ کر 'فقہ' کی خدمت کی۔

۶۔ یہ تمام وہ امور ہیں جن کے بارے میں نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو آگاہ کر دیا تھا۔ چنانچہ صحابہ کرام ان تمام باتوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان میں چند باتیں درج ذیل ہیں:

۱۔ وعن سفیان ان عمر بن الخطاب قال لكعب: من ارباب العلم؟ قال: الذین يعملون بما يعلمون. قال: فما اخرج العلم من قلوب العلماء؟ قال: الطمع. (رواه الدارمی)

ترجمہ: حضرت سفیان نے فرمایا: پوچھا حضرت عمر نے حضرت کعب سے: صاحبان علم کون ہیں؟ کعب نے کہا: جو علم کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ پوچھا عمر نے: کیا چیز علم کو علما کے قلب سے نکال دیتی ہے؟ کعب نے جواب دیا: لالچ۔

۲۔ وعن الاحوص ابن حكيم عن ابيه قال: سئل رجل النبي صلى الله عليه وسلم عن الشر. فقال: لاتسئلوني عن الشر و سلوني عن الخير. يقولها ثلثا. ثم قال: ألا ان شر الشر شرار العلماء وان خير الخير خيار العلماء. (رواه الدارمی)

ترجمہ: حضرت احوص بن حکیم نے روایت کی اپنے والد سے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شر کے بارے میں معلوم کیا تو آپ نے فرمایا: مجھ سے شر کے بارے میں نہیں بلکہ خیر کے

بارے میں پوچھو۔ یہ کلمات آپ نے تین بار فرمائے۔ اس کے بعد فرمایا: برے میں سب سے برے بھی
 علماء ہیں اور اچھے میں سب سے اچھے بھی علماء ہیں۔

۳۔ وعن علی قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم يوشك ان ياتي على الناس
 زمان لا يبقى من الاسلام الا اسمه ولا يبقى من القرآن الا رسمه. مساجدهم عامرة
 وهي خراب من الهدى. علماءهم شر من تحت اديم السماء من عندهم تخرج الفتنة و
 فيهم تعود. (رواة البيهقي في شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت علی نے فرمایا: فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے: قریب ہے کہ لوگوں پر ایسا دور
 آئے گا جس میں اسلام نام کے لئے باقی رہ جائے گا اور قرآن کی رسم باقی رہ جائے گی۔ مسجدیں آباد تو
 ہوں گی لیکن ہدایت سے خالی ہوں گی۔ اور اس دور کے علماء آسمان کے نیچے بدترین مخلوق ہوں گے ان
 سے فتنے ظاہر ہوں گے اور وہ فتنے انھیں پر لوٹیں گے۔

پس چه باید کرد

۱۔ ہندوستان میں امت مسلمہ بالعموم اور مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ بالخصوص اب 'جاں کنی' (Agony of Death) میں مبتلا ہو چکی ہیں۔ بعض لوگوں کو ان کے ظاہری احوال اور چہرے کی بشاشت اس تشخیص کے ماننے میں حارج ہو سکتی ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو اس پر حیرت اور بعض کو اس سے انکار بھی ہو۔ لہذا عاجز کے "پس چه باید کرد" کو بخوبی سمجھنے کے لئے ان کے حقیقی احوال کا ادراک نہایت ضروری ہے۔ اس 'جاں کنی' [ملاحظہ فرمائیں: محمد شبیر خاں: ذاکر صاحب کی شخصیت میری نظر میں: خدا بخش لائبریری جرنل: 50؛ صفحہ 113] کی تشخیص کو دو عنوان کے تحت یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

۱۔ ہندوستان میں امت مسلمہ کو فی زمانہ قوتی (Potential) اور حقیقی (Actual) وجود (Existence) اور بقا (Survival) کے مسائل درپیش ہو چکے ہیں۔

۲۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کو فی زمانہ قوتی (Potential) اور حقیقی (Actual) وجود (Existence) اور بقا (Survival) کے مسائل درپیش ہو چکے ہیں۔

۳۔ ہندوستان میں آج بالعموم امت مسلمہ، بالخصوص اس کے اداروں اور بالخصوص مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے وجود کو باقی رکھنے والی ہر موثر قوت اور صورت بظاہر مفقود ہو چکی ہے۔ دریں حالت جیسی حقیقی اور برسر زمین صورت حال درپیش ہے وہ کسی اصلاح حال کے امکان کو کلیتہً خارج از تصور بنا دیتی ہے۔

اس صورتحال اور اس کی حرکیت (Dynamics) میں موثر داخلی عوامل کی Juxtapositioning اور Interaction کو یوں ملخص کیا جاسکتا ہے:

(الف) 'علما' کی طبع: امت مسلمہ میں 'علما' کی حقیقی موجودگی ناقابل انکار ہے۔ ان کی قوت 'موثر' ہے۔ ان کی رسائی ہمہ گیر نہیں تو کم از کم افقی طور پر اور بالخصوص ذیلی طبقے کی حد تک 'صد فی صد' ہے۔ لیکن بایں ہمہ تاریخ گواہ ہے کہ وہ طبعاً فکر، تدبیر اور تعمیل ہر سہ محاذ پر جامد (Rigid)، منفی (Negative)، سلبی (Passive)، خارج (Obstructionist) اور ناقابل تبدیل (Unchanging) ہوتے ہیں۔ خواہ ان کے الفاظ و بیان بظاہر اس کی کیسی ہی تردید اور ان کے حرکات و تگ و دو بظاہر اس کی کیسی ہی نفی کرتے ہوں۔

(ب) 'علما' کی نفسیات: 'علما' کی نفسیات میں ایک عجیب و غریب بات پائی جاتی ہے۔ چنانچہ امت کی چودہ سو سالہ تاریخ اس کی گواہ ہے کہ مسلم معاشرے میں بالعموم اور عامۃ المسلمین میں بالخصوص اپنے اثر، تفوق اور گرفت کی اجارہ داری (Monopoly) کو مستحکم کرنے اور برقرار رکھنے کے لئے جہاں ایک جانب مداخلت جاوے جائے 'علما' کبھی دست بردار نہیں ہوتے وہیں دوسری جانب اپنے اہداف کو پورا کرنے کے لئے وہ خیر و شر کی ہر موجودہ قوت سے مفاہمت اور معاملت کر سکتے ہیں۔ اپنے اس تعامل کے لئے عام طور پر وہ 'فقہ' کا بھرپور استعمال کر کے حلال کو حرام اور حرام کو حسب خواہش و ضرورت اپنے لئے حلال بنا دیتے ہیں۔ 'مذہب' ان کے نزدیک عوام کے لئے 'عقیدہ' اور ان کے لئے 'آلہ' (Instrument) کا درجہ رکھتا ہے۔

(ج) 'علما' اور دین اللہ: انسانی تاریخ بالعموم اور مسلم تاریخ بالخصوص اس کی شاہد ہے کہ 'علما' دین اللہ مخالف اور 'مذہب' موید واقع ہوئے ہیں۔ 'علما' کی ہمیشہ وابستگی 'دین آبا یا دین ماضی' کے ساتھ ہوا کرتی ہے۔ ان کا یہ 'دین' ہر دور میں ایک 'قالب' اختیار کر لیتا ہے جسے 'دین عاجلہ' کا قالب کہا جاسکتا ہے۔ ان کا 'دین آبا یا دین ماضی' ہر دور میں 'دین عاجلہ' کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا رہتا ہے۔ 'دین آبا یا دین ماضی' اور 'دین آخرت' میں بعد المشرقین ہے۔ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دین۔۔۔ حقیقی اسلام۔۔۔ 'دین آخرت' ہے۔ ظاہر ہے ایسے اسلام کو 'علما' کیسے برداشت کر سکتے ہیں؟

۳۔ مروجہ قیادت: مسلمانوں میں فی زمانہ 'قیادت' کا Infrastructure 'عالماتہ' (Alimatic) ہے۔ اس کے Superstructure میں خواہ کسی طبقے اور ذہن کی نمائندگی کیوں نہ ہو وہ محض سطحی اور

نمائشی ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی 'موجودہ قیادت' درج ذیل احوال سے گزر رہی ہے:

۱۔ موجودہ قیادت قوۃ (Potentially) اور حقیقۃً (Actually) بے بصیرت (Visionless) ہو چکی ہے۔

۲۔ موجودہ قیادت قوۃ (Potentially) اور حقیقۃً (Actually) بد ذہن (Mindless) ہو چکی ہے۔

۳۔ موجودہ قیادت قوۃ (Potentially) اور حقیقۃً (Actually) ناتواں (Impotent) ہو چکی ہے۔

۴۔ موجودہ قیادت قوۃ (Potentially) اور حقیقۃً (Actually) عاجز (Incapacitated) ہو چکی ہے۔

۵۔ موجودہ قیادت قوۃ (Potentially) اور حقیقۃً (Actually) بے اثر (Ineffectual) ہو چکی ہے۔

۶۔ موجودہ قیادت اپنی عصمت (Integrity) کھو چکی ہے۔

۷۔ موجودہ قیادت مزا جانا اور عملاً طفیلی (Parasitic) ہو چکی ہے۔

۸۔ موجودہ قیادت حقیقۃً ناقابل اعتماد (Unfaithful) ہو چکی ہے۔

۳۔ ایسی صورتحال میں جب کہ مذکورہ اسباب سے امت مسلمہ بالعموم اور مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ بالخصوص 'جاں کنی' میں مبتلا ہو چکی ہیں اصلاح حال کی 'موثر' (Effective)، تیر بہ ہدف (Accurate) اور کافی (Adequate) کوششیں اگر بروقت نہ کی گئیں تو عن قریب حادثات فاجعات کا ظہور یقینی ہو جائے گا۔ خدا نخواستہ اگر ایسا ہوا تو اس کے عواقب دو شکلوں میں برآمد ہوں گے:

۱۔ امت مسلمہ میں اسلامی حیویت (Vitality) کی قوۃ (Potential) اور حقیقۃً (Actual) موت واقع ہو جائے گی۔

۲۔ امت مسلمہ میں انسانی حیویت (Vitality) کی قوۃ اور حقیقۃً موت واقع ہو جائے گی۔

۵۔ یہ بات ذہن میں واضح رہنی چاہیے کہ آئندہ اندیشوں (Eventualities) اور امکانات (Opportunities) میں ترجیح (Preference) کا تعلق پسند و ناپسند سے اب قطعاً مربوط نہیں۔

اندیشوں (Eventualities) کی ناز کی کسی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے امکان یعنی اختیار و انتخاب (Choice) کو کلیتہً رد کر دیتی ہے۔ چنانچہ اس ناز کی کو درج ذیل دو جہات سے واضح کیا جاسکتا ہے:

۱۔ اصلاح حال کے لئے آئندہ کیا کیا جائے؟ اور اس کے لئے کن تجویزوں کا انتخاب ہو؟

۲۔ ادارہ دار اب اختیار (Choice) پر نہیں ہو سکتا اس لئے کہ یہ مسئلہ انتظام (Maintenance) کا ہے نہ ارتقا (Growth & Development) کا۔

۲۔ اصلاح حال کے لئے آئندہ اختیار کئے جانے والے طریقوں اور اٹھائے جانے والے اقدام کا تعلق بالکل وجود (Existence) اور بقا (Survival) کے مسئلے سے ہے چنانچہ ایسی صورت حال میں اختیار کے تحت صرف ایک ترجیح پیش نظر رکھی جاسکتی ہے اور وہ یہ کہ آخر وہ کون سی صورت ممکن اور موثر ہے جس سے وجود (Existence) اور بقا (Survival) یقینی بن جائیں؟

۶۔ اسی طرح یہ بات بھی ذہن میں واضح رہنی چاہیے کہ امت مسلمہ اور اس میں موجود افراد، اجتماعیات اور اداروں کی حقیقی صلاحیت (Capability) اور استعداد (Faculty)، ان کی تاثیر (Effectiveness) اور بار آوری (Productivity) کی حقیقی صورت حال کیا ہے؟ مزید ازیں ان افراد، اجتماعیات اور اداروں کی طبع اور عادت میں کتنی آمادگی (Urge) اور لگن (Earnestness) پائی جاتی ہیں۔ از روئے حقیقت امت میں موجود افراد، اجتماعیات اور اداروں کی موجودہ صورت حال ذیل میں یوں ملخص کی جاسکتی ہے:

۱۔ امت میں موجود نمائندہ افراد، اجتماعیات اور ادارے صلاحیت اور استعداد کے اعتبار سے قوتاً (Potentially) اور حقیقتاً (Actually) صفر ہو چکے ہیں۔

۲۔ امت میں موجود ان نمائندہ افراد، اجتماعیات اور اداروں کی تاثیر یا موثریت (Effectiveness) اور بار آوری (Productivity) ناکافی (Inadequate) ہو چکی ہیں۔

۳۔ اصلاح حال کے حوالے سے امت کے نمائندہ افراد، اجتماعیات اور اداروں کا عزم (Determination) اور ان کی آمادگی (Urge) صفر ہو چکی ہیں۔ امت کے ان نمائندہ افراد، اجتماعیات اور اداروں کی حقیقی صورت حال اتنی ناگفتہ بہ ہو چکی ہے کہ اگر روئے ارض کی اعلیٰ اور ارفع ترین تفکیر (Vision) اور اعلیٰ و ارفع ترین تدبیر (Strategy) اور منہاج (Methodology) بھی انہیں فراہم کر دیئے جائیں جب بھی وہ ان کی تعمیل (Execution) نہیں کر سکتے۔ بلکہ اگر اس سے بھی آگے

پس چہ باید کرد

کی بات کہہ دی جائے کہ اگر کوئی ان کے لئے تعمیل (Execution) کر کے اس کے ثمرات ان کے حوالے بھی کر دے تو وہ اتنی بھی صلاحیت نہیں رکھتے کہ ان ثمرات سے بھرپور استفادہ کر لیں۔ پچھلے پچاس سالوں میں مشرق وسطیٰ سے درآمد کردہ پیٹرو ڈالر کے ثمرات کا امت کے نمائندہ افراد، اجتماعیات اور اداروں نے جو مصرف لیا ہے اور ان ثمرات سے جس طرح استفادہ کیا ہے اس سے زیادہ مٹو فتح مثال تقریب فہم کے لئے اور کیا ہو سکتی ہے؟

۴۔ امت میں موجودہ نمائندہ افراد، اجتماعیات اور اداروں کی اس نازائی (Unproductiveness) کے پس پردہ دو عوامل کارفرما نظر آتے ہیں:

۱۔ 'مسلم قیادت'

۲۔ 'علما'

یہ بات واضح کی جا چکی ہے کہ 'مسلم قیادت' اصلاً 'عالمانہ' (Alimatic) ہے جس کے اندر مذکورہ دو طبقے شمار ہوتے ہیں۔ ان دونوں طبقوں میں اول الذکر صرف Superstructure اور Facade ہے جب کہ موخر الذکر وہ اصل قاعدہ (Infrastructure) ہے جس پر اول الذکر 'قیادت' ایستادہ ہے۔ بالفاظ دیگر 'مسلم قیادت' کی نازائی (Unproductiveness) کا بنیادی سبب امت مسلمہ کی 'عالمانہ قیادت' (Alimatic Leadership) ہے۔

چودہ سو سالہ مسلم تاریخ شاہد ہے کہ یہ عارض 'عالمانہ قیادت' (Alimatic Leadership) امت کے لئے ہمیشہ تباہ کن ثابت ہوئی ہے۔ 'علما' کی خواہشات، ان کی سفارشات، ان کی تجویزیں، ان کا طرز عمل اور بعض اوقات ان کی باضابطہ اور راست عملی کارروائیاں امت کے لئے ہلاکتیں لے کر آئیں۔ 900 عیسوی کے بعد اس کا بنیادی سبب عام مسلمانوں کے علم، ان کی معلومات، ان کے ذہن اور ان کے رجحانات کا پوری طرح مکثیف (Conditioned) ہونا لگتا ہے۔ گزشتہ تین سو سالہ تاریخ ایسے کئی دلدوز مناظر پیش کرتی ہے جب 'علما' کی سفارشات، تجویزیں، ان کا طرز عمل اور ان کی باضابطہ مداخلت اور عملی کارروائیاں امت کے لئے صرف اور صرف تباہیاں لے کر آئیں جن کی ہلاکت خیز مضمرات اور عواقب سے امت آج تک نجات نہیں پاسکی ہے۔

[۱۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کی سفارشات، تجویزوں، طرز عمل اور عملی کارروائیوں کے لئے ملاحظہ فرمائیں:]

(الف) شاہ ولی اللہ دہلوی: حجۃ اللہ بالغہ: باب سیاست المدنیہ،

- (ب) شاہ ولی اللہ دہلوی: تفہیمات جلد اول۔
- (ج) محمد عاشق پھلتی: القول الخلی فی ذکر آثار الولی۔
- (د) پروفیسر خلیق احمد نظامی: شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات: ندوۃ المصنفین، دہلی۔
- [۲۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی کی سفارشات، تجویزوں، طرز عمل اور عملی کارروائیوں کے لئے ملاحظہ فرمائیں:]
- (الف) فتاویٰ عزیز یہ (فتاویٰ شاہ عبدالعزیز دہلوی)،
- (ب) شاہ عبدالعزیز دہلوی: فتح العزیز جلد اول، دوم و سوم،
- (ج) شاہ عبدالعزیز دہلوی: سر الشہادتین،
- (د) شاہ عبدالعزیز دہلوی: تحفۃ اثنا عشریہ۔
- [۳۔ جمال الدین افغانی کی سفارشات، تجویزوں، طرز عمل اور عملی کارروائیوں کے لئے ملاحظہ فرمائیں:]
- (الف) E.G. Brown: The Persian Revolution of 1905-1909, Cambridge, 1910
- (ب) سید رشید رضا: تاریخ الأستاذ الامام محمد عبدہ: جلد اول و دوم: قاہرہ 1931-44۔
- (ج) Charles. C. Adam: Islam And Modernism in Egypt, London 1933.
- [۴۔ شیخ محمد عبدہ کی سفارشات، تجویزوں، طرز عمل اور عملی کارروائیوں کے لئے ملاحظہ فرمائیں:]
- (الف) سید رشید رضا: تاریخ الأستاذ الامام عبدہ: قاہرہ 1931-44۔
- (ب) محمد عبدہ: رسالۃ التوحید،
- (ج) محمد عبدہ: شرح نہج البلاغہ،
- (د) محمد عبدہ: شرح مقامات الہمدانی،
- (ہ) محمد عبدہ: تقریر الإصلاح المحاکم الشرعیہ،
- (و) محمد عبدہ: الإسلام والنصرانیة،
- (ز) احمد الشایب: الشیخ محمد عبدہ: مکتبۃ الاسکندریۃ 1929۔
- (ح) عبد العزیز الدسوقی: تطور النقد العربی الحدیث فی مصر: قاہرہ 1977۔
- (ط) مصطفى لطفی المنفلوطی: مؤلفات مصطفى لطفی المنفلوطی: جلد اول و دوم: بیروت 1980۔
- [۵۔ سید رشید رضا (ف 1935) کی سفارشات، تجویزوں، طرز عمل اور عملی کارروائیوں کے لئے ملاحظہ فرمائیں:]

(الف) سید رشید رضا: مجلة المنار،

(ب) سید رشید رضا: تفسیر المنار، بیروت۔

[۶۔ یحییٰ بن محمد بن حمید الدین الحسینی (1869-1948) کی سفارشات، تجویزوں، طرز عمل اور عملی

کارروائیوں کے لئے ملاحظہ فرمائیں:]

P. Dresh: Tribes, Government And History in Yemen, (الف)

Oxford, 1993.

۷۔ چونکہ امت مسلمہ تفکیر (Vision)، عزم (Determination)، آمادگی (Urge)، تدبیری

جوارج کی فعالیت (Efficaciousness of the Strategic Instruments and

Institutions) اور تعمیلی جوارج کی فعالیت (Efficaciousness of the Executive

Instruments) بالکل کھو چکی ہے اس لئے در اس حالت صرف ایک ممکنہ راہ نظر آتی ہے۔ امت کی اصلاح

حال کے لئے خارجی مدد کو بروئے کار لانا۔

۸۔ اس مقام پر کسی بھی ذہن میں چند بنیادی سوالات کا پیدا ہونا لازمی ہے: نفس مذہب کیا

ہے؟ اس کے علمبردار نفس 'علما' سے کیا مراد ہے؟ یہ کون ہوتے ہیں؟ کیوں ہو جاتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ کی

تخلیق کردہ اس دنیا میں ان کا کیا مقام ہے؟ انسانی معاشرے میں ان کا تاریخی رول کیا رہا ہے؟

۱۔ روئے ارض پر پہلی بار جب آدم و حوا بسائے گئے اور ان سے ان کی اولادیں پھیلیں تو بنی آدم پر

عارض ہونے والا سب سے پہلا 'انسان۔ تمہلی مہلکتہ' (Human-borne Calamity &

Fatality) مذہب تھا۔ یہ وہی 'مہلکتہ' ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے الجنت سے روئے زمین تک کے سفر پر

عازم ہونے سے پہلے آدم اور پھر حوا کو باخبر اور خبردار کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فاما یا تینکم منی ہدی فمن تبع ہدای فلا خوف علیہم ولا هم یحزنون (البقرہ ۳۸۵)

ترجمہ: پھر اگر تم کو پہنچے میری طرف سے کوئی ہدایت تو جو چلا میری ہدایت پر نہ خوف ہوگا ان پر

اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ نے مزید تاکید فرمائی:

والذین کفروا و کذبوا بآیتنا اولئک اصعب النار ہم فیہا خالدون (البقرہ ۳۹۵)

ترجمہ: اور جو لوگ منکر ہوئے اور جھٹلایا ہماری نشانیوں کو وہ ہیں دوزخ میں جانے والے وہ اس میں

ہمیشہ رہیں گے۔

ظاہر ہے کسی ایسے 'مہلکتہ' کا منبع، مصدر اور مرجع 'ابلیس' کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟

۲۔ اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کو روئے ارض پر آئندہ درپیش ہونے والے جس 'مہلکتہ' کے ظہور سے آگاہ کیا تھا وہ بالآخر سچ ثابت ہو کر رہا۔ چنانچہ 'ہدی' سے مزود (Equipped) ہونے کے باوجود ابلیس کی مداخلت سے بنی آدم زمین پر اس 'مہلکتہ' کا شکار ہو گیا۔ اس مداخلت کے سبب بنی آدم کے ارضی حیات کے جسد میں ایک Outbuilding کا ظہور ہوا جس نے دیکھتے دیکھتے اس کے جسد میں باضابطہ Outgrowth کی پوزیشن اور صورت لے لی۔ یہی Outbuilding جس نے باضابطہ Outgrowth کی صورت اختیار کر لی تھی 'مذہب' (Religion) کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ 'مذہب' (Religion) کا محل تو انسانی ذہن (Mind) تھا لیکن اسے Doctrine اور Dogma کی اینٹوں اور گارے سے مرئی شکل دی گئی۔ یہ ظاہرہ بڑی زوردار اور موثر تھی۔ بنی آدم کے جسد میں یہ ظاہرہ اس کی حیات (Life) اور حیویت (Vitality) کو ہلاک کرنے کی طاقت رکھتی تھی۔ چنانچہ یہی 'ظاہرہ' روئے ارض پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے 'رسالت' کے اجرا کا باعث ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے بنی آدم پر رحم فرمایا اور 'مذہب' کے مہلکتہ کے انسداد کے لئے اپنی رحمت خاص سے زمین پر 'رسالت' کا اجرا فرمایا۔ اس طرح روئے ارض پر انسانی معاشرے میں انبیا اور رسل کی بعثت کا آغاز ہوا۔

۹۔ روئے ارض پر نسل آدم وسیع تر علاقوں میں پھیلنے لگی۔ اس کی تعداد اور زمین پر موجود 'متاع' سے استفادہ کے امکانات میں زبردست اضافہ ہو گیا۔ جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ بنی آدم کے لئے دو 'ظاہرات' کا ظہور ہوا۔ یہ دو ظاہرات (Phenomena) تھیں:

۱۔ اختیار (Authority) — اور

۲۔ دولت (Wealth)۔

ہزاروں سال کی انسانی تاریخ میں یہ دونوں ظاہرات (Phenomena) تین صورتوں میں بے قابو ہو کر پھوٹ پڑیں:

۱۔ اضطرابی ظاہرہ (Pinching Phenomenon)

۲۔ ظالمانہ ظاہرہ (Tyrannical Phenomenon)

۳۔ بے رحم ظالمانہ ظاہرہ (Ruthless Tyrannical Phenomenon)

انسانی تاریخ میں متبدل رنگوں (Shades) طرزوں (Forms) اور فکروں (Ideologies) کے ساتھ یہ کسی بھی نام سے معروف رہیں، ہوئیں یا کی گئی ہوں — مثلاً عصر حاضر میں — شدت پسندی، دہشت گردی، آمریت، ملوکیت، اشتراکیت، اشتمالیت، سرمایہ داری، استعماریت، اکثریتی آمریت، حتیٰ کہ اباحت، الحاد اور انکار خدا — ان کی نوعیت ہمیشہ مذکورہ تین صورتوں کی رہی۔ ان میں سے ہر ایک انسانی معاشرے میں کبھی دوستانہ مسابقت دہندہ (Friendly Competitor) رہی، کبھی ظالمانہ مسابقت دہندہ (Tyrannical Competitor) اور کبھی بے رحم ظالمانہ مسابقت دہندہ (Ruthless Tyrannical Competitor)۔ لیکن ان دونوں ظاہرات یعنی اختیار (Authority) اور دولت (Wealth) کے تینوں انفجارات (Spillovers) روئے ارض پر بنی آدم کے وجود (Existence) اور مقصد وجود (Raison d'etre) کے لئے مہلک بالعمین (Really Fatal) کبھی نہیں ہوئے۔ اگر کوئی 'ظاہرہ' بنی آدم کے وجود (Existence) اور مقصد وجود (Raison d'etre) کے لئے مہلک بالعمین بنی تو صرف 'مذہب' بنا۔ اس لئے کہ بنی آدم کو وجود اور مقصد وجود کے اعتبار سے ہلاک کرنے کی استعداد اور آمادگی صرف 'مذہب' میں پائی جاتی تھی۔ قرآن نے اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

یٰبنی آدم لا یفتنکم الشیطن — اولیاء للذین لا یؤمنون (الاعراف ۲۷)
ترجمہ: اے اولاد آدم کی! نہ بہکائے تم کو شیطان — رفیق ان لوگوں کا جو ایمان نہیں لاتے۔
اس تاریخی پیش رفت کو مد نظر رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے روئے ارض میں موجود تین عوامل

۱۔ بنی آدم

۲۔ مستقر اور

۳۔ متاع

میں اپنی ایک ایسی 'سنت' جاری فرمائی ہے جو ان دونوں ظاہرات (Phenomena) کے بے قابو (Out of Control) ہوتے ہی خود بہ خود (Suo natura, Suo jure et Suo motu) متحرک ہو جاتی ہے اور روئے ارض پر Normalcy کو یقینی بنادیتی ہے۔ اس 'سنت اللہ' کے ایک پہلو کا ذکر قرآن نے یوں فرمایا ہے:

ولو لا دفع اللہ الناس بعضهم ببعض لفسدت الارض (البقرہ ۲۵۱)

ترجمہ: اور اگر نہ ہوتا دفع کر دینا اللہ کا ایک کو دوسرے سے تو خراب ہو جاتی زمین۔

اسی 'سنت اللہ' کے تحت روئے ارض پر ہمہ دم 'متبدل قوتیں' (Changing Forces) اور انسانی حیات اور اس کے ماحول میں موثر متبدل عوامل (Effective Variable Factors) باہم متعامل (Interact) ہو کر ان کا سدباب کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے کوئی بھی 'ظاہرہ روئے ارض' پر بنی آدم کی حیات اور اس کے مقصد وجود کے لئے مہلکہ نہیں بن پاتی۔

اس کے برخلاف 'مذہب' (Religion) اور اس کے علمبردار 'علما' (Ulama) بنی آدم کی حیات (Life) اور اس کے مقصد وجود (Raison d'etre) کے لئے ہمیشہ مہلک بالعمین (Really Fatal) بن کر سامنے آئے۔ روئے ارض پر انسانی معاشرے میں حالات کی اس تبدیلی اور انحطاط کو قرآن نے یوں بیان فرمایا ہے:

«اتخذوا احبارہم و رهبانہم ارباباً من دون اللہ و المسیح ابن مریم» (التوبة ۳۱)
ترجمہ: ٹہرا لیا (یہود نے) اپنے علما اور رهبان کو خدا اللہ کو چھوڑ کر اور ٹہرا لیا (نصاری نے) مسیح ابن مریم کو خدا اللہ کو چھوڑ کر۔

۱۰۔ 'مذہب' اور 'علما' کا 'فساد' ناقابل اصلاح ہوتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ بنی آدم کی صالح قوتیں اس مہلکہ کے سامنے بے بس ہو جاتی ہیں۔ جاری 'سنت اللہ' کے جو ارح اور طرق بھی اسے معتاد طریقے سے روکنے پر قادر نہیں ہوتے۔ (بات یہ نہیں ہے کہ 'سنت اللہ' انھیں معتاد طریقے سے روکنے پر قادر نہیں۔ وہ انھیں روک سکتی ہے لیکن وہ ایسا کرتی نہیں۔ اس لئے کہ معتاد طریقے سے 'علما' اور مذہب کے فساد کو روکنے میں بنی آدم کی جان اور زیست کے متاع کو ناقابل برداشت زیاں کا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے)۔ چنانچہ یہی وہ مہلکہ بالعمین ہے جس کے سدباب کے لئے ربانی مداخلت بالآخر ناگزیر ہو جاتی ہے لہذا اللہ تعالیٰ روئے ارض پر انسانی معاشرے میں انبیاء اور رسل کی بعثت فرماتا ہے۔ انسانی تاریخ کی یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ انبیاء اور رسل صرف 'مذہب' اور اس کے علمبردار 'علما' کے انسداد اور ان کے قلع قمع کے لئے ہی مبعوث ہوئے۔ اختیار (Authority) اور دولت (Wealth) کے انفجار کے انسداد کے لئے اختیار اور دولت کے حاملین اور امیدواران اختیار و دولت کے درمیان ہمہ دم جاری کشمکش ہی کافی ہو جاتی ہے۔ اختیار اور سرمایہ یا مال دونوں 'دولت' اسی وجہ سے کہلاتے ہیں کہ ان کے اندر جاری 'سنت اللہ' انھیں یکساں ثابت اور قائم رہنے نہیں دیتی۔ قرآن نے فرمایا:

«وتلك الايام نداولها بين الناس» (آل عمران ۱۴۰)

ترجمہ: اور یہ دن باری باری بدلتے رہتے ہیں ہم ان کو لوگوں میں۔

لیکن 'مذہب' اور 'علما' کا معاملہ جداگانہ اور منفرد ہے۔ 'مذہب' اور اس کے علمبردار 'علما' اختیار (Authority) اور دولت (Wealth) دونوں کو اپنے اختیارِ عظمیٰ (Super Authority) کے تحت Monopolise کر کے انھیں 'آلہ' Instrument بنا لیتے ہیں۔ یہ ارتکازِ مذہب اور 'علما' کو ناقابلِ تسخیر (Impregnable) بنا دیتا ہے۔ وہ لامحدود (Transcendental) ہو جاتے ہیں۔ ان کے حدود بیک وقت حقیقی (Actual) اور تعبیری (Virtual) دونوں ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جب 'علما' اختیار (Authority) اور دولت (Wealth) دونوں کو مذہب کے اختیارِ عظمیٰ (Super Authority) کے زیر سایہ Monopolise اور Consolidate کرنے میں صد فی صد کامیاب ہو جاتے ہیں تب ان کے زیر تسلط انسانی حیات روحانی اعتبار سے 'شیطانی' (Satanic) اور جسمانی اور معاشرتی اعتبار سے بھی (Bestial) بن کر رہ جاتی ہے۔

۱۱۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ دریں حالات اصلاحِ حال کی صرف ایک ممکنہ راہ نظر آتی ہے۔ 'اصلاحِ حال' کے لئے خارجی مدد کو بروئے کار لانا۔ یہ وقت کسی ایسے اقدام کے لئے موزوں ترین ہے۔ ہر چند کہ امت 'جاں کنی' میں مبتلا ہے اور اصلاحِ حال کی موثر داخلی قوت 'معدوم محض' ہے لیکن بایں ہمہ اصلاحِ حال کے لئے یہ گھڑی 'فیصلہ کن' اور 'نہایت موافق' (Extremely Favourable) ہے۔ اس کے دو اسباب ہیں:

۱۔ سببِ اول: گزشتہ ساٹھ سالوں میں ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے نسبتاً جتنے 'اچھے' (Pliable) اور 'موافق' (Favourable) حالات رہے ہیں پوری دنیا بشمول مسلم ممالک میں اتنے اچھے اور موافق حالات کہیں میسر نہیں رہے۔ یہاں ریاست (State) دستوری (Constitutional) ہے۔ ریاست کے تینوں شعبے عدلیہ (Judiciary)، مقننہ (Legislature) اور انتظامیہ (Executive) پر جوشِ طریقے (Vibrantly) سے متحرک (Active) ہیں۔ ریاستِ فلاحِ نہاد (Welfare-Based) ہے۔ حکومت (Government) لبرل (Liberal)، جمہوری (Democratic) اور وفاقی (Federal) ہے۔ جب سے ملک میں دستوری حکومت قائم ہوئی ہے دستور کبھی معطل نہیں ہوا۔ اور سب سے قابل ذکر بات یہ ہے کہ عوام کی اکثریت (Majority) کا لبرل (Liberal) اور توافق پسند (Accomodative) ہونا وقتی اور نمائشی 'ظاہرہ' نہیں بلکہ ہندوستانی

طبع (Indian Temperament) کا تاریخی حصہ ہے۔ جس ملک میں اتنے سارے موافق و جوہ جمع ہو جائیں وہاں کے حالات صرف 'اچھے' (Pliable) اور 'موافق' (Favourable) ہی کہے جاسکتے ہیں۔

۲۔ سبب دوم: مغرب تیزی سے بدل رہا ہے۔ بعض تجزیہ نگاروں کے نزدیک مغرب زوال آمادہ ہے۔ بعض کے نزدیک اس کے قویٰ مضحمل ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن ان سب کے باوجود یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مغرب اب بھی ذہنی اور فکری اعتبار سے زکی و بکر (Pure & Virgin) ہے۔ اس نے بڑی جدوجہد اور بے شمار قربانیوں کے بعد گزشتہ پانچ سو سالوں میں یہ ذہنی اور فکری زکاوہ و بکارت (Purity & Virginity) حاصل کی ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو عاجز کے علم کی حد تک وہاں کے اذہان اسلام حقیقی کے لئے صد فی صد زکی و بکر (Pure & Virgin)، تحملی (Concieving) اور تقبلی (Receptive) ہیں۔ یہ صورت حال اسلام حقیقی اور پوری انسانیت کے لئے نعمت غیر مترقبہ اور نعمت عظمیٰ سے کم نہیں۔ عاجز کے علم کی حد تک مغرب آج 'فیصلہ کن' موڑ پر کھڑا ہے۔ لیکن افسوس! یہی وہ گھڑی ہے جب ایک خطرناک 'ظاہرہ' سرا بھار رہی ہے جو درحقیقت 'بے حد تشویشناک' ہے۔

عالم اسلام سے جوق در جوق بلکہ فوج در فوج 'علما' اسی مزین اور مراض 'مذہب' اسلام، اس کے علوم، اس کی اجتماعیات اور اس کے اداروں کو لے کر وہاں پہنچ رہے ہیں۔ بڑی تعداد میں وہی مذہبی رسومات، عصبیتیں، جذبات، آداب اور ثقافت وہاں مستحکم کرتے جا رہے ہیں جو گزشتہ کئی صدیوں سے عالم اسلام کا خاصہ رہی ہیں۔ مغرب کے ان اذہان کو جو فی الوقت بالکل زکی و بکر (Pure & Virgin) ہیں انھیں ان 'علما' کے ذریعہ جس اسلام کا 'لقا' (Exposure) مل رہا ہے وہ اسلام 'دین اللہ' نہیں بلکہ وہی فاسد 'مذہب' ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ لقا (Exposure) پوری انسانیت کے لئے عن قریب 'المیہ' (Tragedy) میں تبدیل ہو جائے۔ چنانچہ اگر اسی وقت ہندوستان میں اصلاح حال کا عمل فی الفور جاری نہیں کیا گیا تو پھر شاید اس کا جاری ہونا کبھی ممکن نہ ہو۔ اس زریں موقع کو کھو دینا ساری انسانیت کو آئندہ 'المیے' سے دوچار کر دینا ہوگا۔

تجویز: اوّل

سرسید تحریک کا جامع اور مکمل احیا

۱۔ امت مسلمہ کی موجودہ صورتحال میں اصلاح حال کی سب سے اعلیٰ صورت 'سرسید تحریک کے جامع اور مکمل احیا' میں ممکن نظر آتی ہے۔ اس مقصد کے لئے مسلم یونیورسٹی کو 'اسوہ' (Role Model) بنانے کی ضرورت ہے۔ اسوہ سے مراد ہے مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے ذریعہ اس کردار کی ادائیگی جن میں یونیورسٹی بطور Pioneer، Laboratory، Incubator، Culturer، Regulator، Pilot، Raiser، Cultivator اور Ideologist اپنی ذمہ داریاں پوری کرے۔

۲۔ 'سرسید تحریک کے جامع اور مکمل احیا' کا پہلا اور فی الحال واحد نصب العین ہو: "وحدانی ارتقائی اسلامی نظام تعلیم" وضع اور اس کا عملی تجربہ کرنا۔ اس نصب العین کے تحت درج ذیل کام کئے جائیں:

- ۱۔ 'وحدانی ارتقائی اسلامی نظام تعلیم' کی خلاقانہ طور پر (Innovatively) تشکیل کی جائے۔
- ۲۔ 'وحدانی ارتقائی اسلامی نظام تعلیم' کے نصاب بنانے کی خلاقانہ طور پر سعی کی جائے۔ یہ نصاب نرسری، کنڈرگارٹن، پرائمری، مڈل، سکنڈری، کالج اور یونیورسٹی ہر سطح کا احاطہ کرتا ہو۔
- ۳۔ اس نقطہ نظر سے تیار کردہ عبوری نصاب کو مد نظر رکھ کر پہلے مرحلے میں نرسری تا یونیورسٹی سطح تک ضروری — تعلیمی، علمی، تدریسی، تدریسی، تحقیقی اور انتظامی امور، ان کے ادارہ جات، ان کی ہئیت

حاکم، ان کے آداب، مدت کار، ان کے ضوابط اور قوانین کی خلا قانہ تشکیل کی جائے۔

۴۔ اس نصاب کو ابتداء عبوری اور تجرباتی طور پر پرائمری تا یونیورسٹی سطح تک نافذ العمل بنایا جائے۔ تیس سالوں میں دس دس سالوں کے تین عرصوں (Segments) میں ان پر نظر ثانی اور ضروری ترمیم کی جائے۔

۵۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں اس وقت موجود فیکلٹیوں اور شعبوں کو کلی یا جزوی صورت میں بتدریج افقی یا بعض صورتوں میں عمودی طور پر تحلیل کر کے ان کی خلا قانہ طور پر تشکیل کی جائے۔

۶۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں موجود بعض فیکلٹیوں اور ان کے تحت موجود شعبوں کا مثلاً فیکلٹی آف تھیالوجی (شعبہ دینیات) اور فیکلٹی آف اسلامک اسٹڈیز کی موجودہ صورتحال کو یکسر ختم کر کے نئے اصولوں، میقات، نصاب اور ترجیح کے ساتھ عبوری طور پر نظم جدید کیا جائے تا وقتیکہ اصل خاکے کے مطابق وحدانی ارتقائی اسلامی نظام تعلیم تیار ہو کر نافذ العمل نہ ہو جائے۔

۷۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں تجرباتی طور اور Seminal اور Prenatal خاکے کے ساتھ ایک فیکلٹی قائم کی جائے جس کا نام ہو— فیکلٹی آف قرآن— اس فیکلٹی کی Seminal اور Prenatal خاکے کی مدت تیس سے پچاس سال کی ہو جو دس دس یا پندرہ پندرہ سال کے تین عرصوں (Segments) پر مشتمل ہوں۔ اس 'فیکلٹی آف قرآن' کے قیام سے قطعاً یہ مراد نہ ہو کہ مروج و معروف علوم قرآن مثلاً علوم قرآن کے معروف اصناف کی وہاں الگ الگ شعبوں میں تعلیم، تدریس اور تحقیق ہو۔ بعض مروج و معروف علوم قرآن جن کی کوئی اصل نہیں اور جو مصنوعی، جعلی اور محض گمراہ کن ہیں مثلاً تفسیر و علوم تفسیر کا بڑا حصہ، اسباب النزول، شان نزول، نسخ و منسوخ، قراءت اور تجوید وغیرہ ان کی تعلیم تاریخ کے تحت تو کی جاسکتی ہے تاکہ محققین واقف رہیں کہ ماضی میں کیا کچھ ہوتا رہا تھا لیکن ان کا کوئی الگ شعبہ نہ ہو۔ فیکلٹی آف قرآن کے تحت بالکل نئے شعبے قائم کئے جائیں جن کی نئی سعت (Extent) اور ان کے نئے ابعاد (Dimensions) ہوں۔

۸۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں Seminal اور Pre-natal طور پر قائم 'فیکلٹی آف قرآن' کا اگلا ہدف ہو— حقیقی 'یونیورسٹی آف قرآن' کا قیام۔ 'فیکلٹی آف قرآن' کے پچاس تا سو سال کے تجربے کے بعد اور اس تجربے کے نتیجے میں سو سال سے دو سو سال کی مدت میں 'یونیورسٹی آف قرآن' کا قیام عمل میں لایا جائے۔ چنانچہ آج کی تمام یونیورسٹیاں سو تا دو سو سال بعد ختم کر دی جائیں یا از خود رفتہ رفتہ ختم ہو کر رہ

جائیں۔ سو سے دو سو سالوں میں روئے ارض پر جو نظام تعلیم اور ادنیٰ سے اعلیٰ ترین تعلیم گاہ ہو وہ دراصل 'یونیورسٹی آف قرآن' کا حصہ ہو۔ یہ 'یونیورسٹی آف قرآن' سر تا پا 'یونیورسٹی آف ہدی' ہو۔ ہدی سے مراد ہے اللہ کی وحی اور رسالت پر مبنی نظام تعلیم۔ چنانچہ خواہ اس 'یونیورسٹی آف ہدی' کے تحت کوئی بھی شعبہ مثلاً Faculty of Nebular-Physics یا Faculty of Astro-Physics ہی کیوں نہ قائم ہو وہ 'ہدی' کی روشنی میں ہو۔ کسی کو یہ غلط فہمی خوش فہمی نہ ہو کہ وہ آج کی معروف اسلامی عالمانہ یونیورسٹی جیسی کوئی یونیورسٹی ہوگی۔ ایسا قطعاً نہیں ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس یونیورسٹی کے نظام علم میں آج کے معروف 'علما' اور ماہرین سائنس دونوں 'جاہل محض' قرار پا کر بے کار ہو جائیں۔ مثلاً اس یونیورسٹی کی کسی فیکلٹی کے کسی شعبے میں اذا الشمس کورت (التکویر - ۱) میں 'اذا' کو Calculate کرنے کی بات آئے تو ماہرین سائنس فین مین (Feynman: 1918-1988)، آئن سٹائن (Einstein: 1879-1955)، برٹریڈ رسل (Bertrend Russel: 1872-1970)، بوہر (Bohr: 1885-1962) اور فرمی (Fermi: 1901-1954) بے بس نظر آئیں کہ ان کے علوم اسے Calculate کرنے سے قاصر ہیں۔ اور اسٹیفن ہاکنگ (Stephen Hawking) یہ کہیں کہ کائنات میں جاری صرف ایک طبیعی قانون کے تحت تو وہ Calculate کر سکتے ہیں لیکن کیا ضروری ہے کہ وہ درست بھی ہو؟

۹۔ نرسری، کنڈرگارٹن، پرائمری، مڈل اور سکینڈری اسکولوں کے جملہ امور کی اس 'وحدانی ارتقائی اسلامی نظام تعلیم' کے مطابق خلافت تشکیل کی جائے۔ نو تا بارہ سال کی عمر تک سکینڈری تعلیم سے فراغت ہو جائے۔ یہاں یہ بات واضح کر دینی ضروری ہے کہ عاجز جن الفاظ کا استعمال کر رہا ہے مثلاً نرسری، مڈل، سکینڈری وہ صرف ابلاغ کے لئے ہیں ورنہ خود ان الفاظ، ان کی تقسیم اور درجہ بندی اور ان کے وہ مفہیم جو آج ان سے لئے جاتے ہیں ان کی عاجز کے نزدیک از روئے حقیقت کوئی اہمیت نہیں۔ ان کا استعمال صرف ابلاغ کے لئے کیا جا رہا ہے۔

۱۰۔ بعض امور کے پیش نظر ایسا لگتا ہے کہ کچھ عبوری اور Diversional اقدام کرنے کی بھی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ مثلاً اگر ضروری محسوس ہو تو ابتدائی پچاس سے سو سال کے لئے ایک عبوری نظم کا اجرا کیا جاسکتا ہے تا وقتیکہ 'وحدانی ارتقائی اسلامی نظام تعلیم' پوری طرح زیر عمل (Functional) آجائے۔ اس عبوری اور Diversional اقدام کے تحت مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں 'مدارس' (Seminaries) کا ایک نظم قائم کیا جائے۔ یہ مدارس مسلمانوں میں رائج مدارس کی طرح قطعاً نہ ہوں

خواہ وہ جامعہ ازہر کا طرز ہو یا دارالعلوم، دیوبند یا ندوۃ العلماء، لکھنؤ یا جامعہ ام القریٰ کا طرز بلکہ یہ لازماً 1500 عیسوی سے قائم آکسفر ڈ اور کیمبرج کے Seminaries یا جرمن Hochschule کے طرز پر قائم ہوں۔ اس خاکے کی اسلامی توجیہ سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ واضح ہو کہ یونیورسٹی آف قرآن کے قائم ہو جانے پر اس کی سکینڈری اور پری یونیورسٹی درجات کو چھوڑ کر بقیہ تمام درجات یا تمام درجات ختم کر دیئے جائیں۔

۱۱۔ سر سید تحریک کے مکمل احیا اور وحدانی ارتقائی اسلامی نظام تعلیم کی کوششوں کو پوری طرح (Optimally) ثمر آور (Productive) بنانے کے لئے سب سے پہلے اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ اپنی موجودہ 'جان کنی' کی حالت سے باہر نکل آئے اور اس کی صحت کم از کم Stabilize ہو جائے۔ اس Clinical تدبیر کی نوعیت دراصل مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے جسم میں جان بچانے والی ادویہ (Life Saving Medication) پہنچانے اور ایسی تدابیر اختیار کرنے کی ہے تاکہ وہ ان مہلک اور مضر صحت عوامل کو فوری طور پر بے اثر (Neutralize) کر سکے جو یونیورسٹی کو سرعت کے ساتھ موت کی آغوش میں لے جا رہے ہیں۔ اس حوالے سے فی الفور دو اقدام کئے جائیں:

۱۔ مدارس کے Recognition اور Affiliation کا خاتمہ:

ابتدا سے انتہا تک، ہر سطح اور ہر شعبے سے، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے 'مدارس' (بلا تفریق تمام مدارس خواہ وہ درس نظامی والے مدارس ہوں یا دیگر نصاب کے مدارس) سے کلی انقطاع (Total Disconnection & Disengagement) کو یقینی بنایا جائے۔ چنانچہ تمام 'مدارس' جن کا وہاں کسی بھی اعتبار سے بالواسطہ یا بلاواسطہ Recognition یا Affiliation ہے اسے فی الفور علی الاطلاق اور بلا استثناء کا عدم قرار دے دیا جائے۔ اس بات کو بھی یقینی بنایا جائے کہ علانیہ، خفیہ، بلاواسطہ یا بالواسطہ 'مدارس' سے فارغ کوئی بھی طالب علم یا استاد پرائمری سطح سے D.Litt تک کسی سطح میں یونیورسٹی میں داخلہ نہ لے سکے۔

۲۔ ذمہ داران مدارس کو آگاہی:

اس حتمی اقدام کے ساتھ ساتھ اس بات کی شدید اور فی الفور ضرورت ہے کہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے ذمہ داران 'مدارس' کے ذمہ داران کو آگاہ کریں کہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کا مدارس کے تعلق سے یہ اقدام قطعاً معاندانہ (Hostile)، تفریقی (Discriminatory)، فرقہ وارانہ (Communal)،

طبقاتی (Sectional)، مسلکی (Sectarian) اور جارحانہ (Aggressive) نہیں ہے۔ یہ اقدام سراسر طبی (Pathological)، منطقی (Logical) اور معقول (Rational) ہے۔ اس کا واحد مقصد ایک مکمل وحدانی ارتقائی اسلامی نظام تعلیم وضع کرنے کی کوشش کو یقینی بنانا اور جلد از جلد اس کے ہدف کو پورا کرنا ہے۔

انھیں رضا کارانہ، خیر خواہانہ اور بلا طلب یہ مشورہ بھی دیا جاسکتا ہے بلکہ دیا جانا چاہیے کہ اگر وہ چاہیں تو وہ بھی اپنے طور پر اور اپنی صوابدید سے مدارس میں اسی طرح ابتدا سے انتہا تک ایک جامع مکمل اسلامی نظام تعلیم جسے وہ اپنے طور پر احسن اور انسب سمجھتے ہوں وضع کرنے کی کوشش کریں۔ انھیں اس سے بھی آگاہ کیا جائے کہ ہم اس حوالے سے جامع وحدانی ارتقائی اسلامی نظام تعلیم وضع کرنے کے لئے 'خارجی مدد' کے بطور حکومت ہند سے درخواست کرنے اور ان کا تعاون لینے جا رہے ہیں اگر وہ بھی مناسب سمجھیں تو اس طرح کے اقدام اپنے طور پر کر سکتے ہیں۔

۱۲۔ اس مقام پر دو سوالات پیدا ہوتے ہیں:

۱۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے 'مدارس' کے حوالے سے اس نوعیت کے اقدام کی جو بظاہر سخت

(Drastic) اور دور رس (Far-reaching) معلوم ہوتے ہیں کیا ضرورت ہے؟

۲۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کا یہ اقدام کس طرح طبی (Pathological)، منطقی (Logical) اور

معقول (Rational) ہے؟

۱۳۔ ان دونوں سوالوں کے پیش نظر چند امور کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

اس تدبیر کا براہ راست تعلق — اسلام دین اللہ، نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات اور امت مسلمہ کی نفسیات، مقصد و جوہر اور فرائض منصبی سے ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت ابوامامہ الباہلی روایت فرماتے ہیں:

عن ابی امامہ الباہلی عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: لینقضن عرا الاسلام عروة عروة فکانما انتقضت عروة تشبث الناس بالتي تليها و اولهن الحكم و آخرهن الصلاة. (مسند احمد ج. ۵ مرویات ابو امامہ الباہلی)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دی گئی اس خبر اور اس میں بیان کردہ نکات کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱۔ امت مسلمہ محمدیہ میں زوال آئے گا۔

- ۲۔ یہ زوال دائروی ہوگا۔
 - ۳۔ امتِ مسلمہ محمدیہ میں آنے والا زوال اوپر سے آئے گا۔
 - ۴۔ امتِ مسلمہ محمدیہ کا زوال اصلاً 'قیادت کا زوال' ہوگا۔
 - ۵۔ امتِ مسلمہ محمدیہ میں آئے زوال کے سبب منشعب (Ramified) اور متضارب (Multiplied) ہو کر پھیلنے والے فسادات کا منبع اصلاً 'قیادت' ہوگی۔
 - ۶۔ امتِ مسلمہ محمدیہ میں بالآخر 'اصلاح' آئے گی۔
 - ۷۔ امتِ مسلمہ محمدیہ میں 'اصلاح' دین اللہ کے ظہور پر منتج ہوگی۔
 - ۸۔ امتِ مسلمہ محمدیہ میں 'اصلاح' اوپر سے آئے گی۔
 - ۹۔ امتِ مسلمہ محمدیہ میں 'اصلاح' 'قیادت کی اصلاح' ہوگی۔
 - ۱۰۔ امتِ مسلمہ محمدیہ میں اس آخری 'اصلاح' کے سبب منشعب (Ramified) اور متضارب (Multiplied) ہو کر پھیلنے والی 'صالحات' کا منبع بھی 'قیادت' ہی ہوگی۔
- چنانچہ یہی 'حقیقتِ مہدی' ہے۔

سحرم دولت بیدار بہ بایس آمد گفت بر خیز کہ آن خسرو شیریں آمد

۱۴۔ برسبیل تذکرہ یہاں ایک بات کا ذکر تقریبِ فہم کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے۔ حالیہ زمانے میں متعدد براعظموں میں چلنے والی بدعنوانی مخالف تحریکات قابلِ غور ہیں۔ عاجز نہیں جانتا کہ ان تحریکات کی اصل حقیقت کیا ہے؟ یہ کتنی مخلصانہ ہیں؟ ان کے اصلی محرکات کیا ہیں؟ ان کے سرپرست، اعوان و انصار کون ہیں؟ تاہم ان تحریکات کا ایک پہلو قابلِ غور ضرور ہے۔ بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ ان تحریکوں کا اصل زور اوپر کی اصلاح پر ہے اور اس کا اصل رخ 'اوپر سے اصلاح' کی جانب ہے۔ یہ بات بے حد غیر معمولی، چونکا نے والی اور حیران کن ہے۔ یہ تحریکات درست بھی ہو سکتی ہیں اور متنبیانہ بھی۔ ممکن ہے یہ کسی 'واروۃ' کا حصہ ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اس لاہوتی 'القاء' کا جو فی زمانہ خلا و ملاے ارضی پر عارض ہے محض 'انعطافی انجذاب' اور 'مطلق' کا نتیجہ ہوں۔ بہر حال اس میں تو کوئی شک نہیں کہ زمانہ تیزی سے اس جانب رواں ہے۔

باراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست در باغِ لالہ روید و در شورہ بوم خس

۱۵۔ جہاں تک امت میں 'اصلاح' کی روایت ہے تو اس کی صورت حال ناگفتہ بہ ہے۔ مثلاً گزشتہ تین سو سالوں میں 'رائج'، تسلیم شدہ اور معروف اصلاح' کی اکثر کوششیں قرآن و سنت کی روشنی میں خدا مخالف (Anti-Allah)، رسول مخالف (Anti-Rasulullah) اور سنت مخالف (Anti-Sunnah) رہی ہیں۔ قابل غور امر یہ ہے کہ ان تمام 'رائج'، تسلیم شدہ اور معروف اصلاحی کاوشوں کے روح رواں اور اعضاء و جوارح 'علما' ہی رہے ہیں۔ ان تمام 'علما' نہاد اصلاحی کوششوں کی حقیقت، ان کی صورت، ان کی ترجیحات، ان کا رخ اور ان کا زور۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر سے متصادم اور ان کے منشا کے خلاف رہے۔

ان 'علما' نہاد اصلاحی کاوشوں کے درمیان متفق علیہ اور مشترک امور درج ذیل ہیں:

- ۱۔ امت مسلمہ محمدیہ میں مفسد کا 'ظرف اور مظروف' مسلم عوام ہیں۔
- ۲۔ امت مسلمہ محمدیہ میں مفسد کے انسداد کے سامان صرف 'علما' کے پاس ہیں۔
- ۳۔ امت مسلمہ محمدیہ میں مفسد کے انسداد کی اہلیت اور صلاحیت صرف 'علما' کے اندر ہے۔
- ۴۔ امت مسلمہ محمدیہ میں مفسد کے انسداد کا اختیار (Authority) صرف 'علما' کے پاس ہے۔
- ۵۔ امت مسلمہ محمدیہ میں مفسد کے انسداد کی صرف وہی کاوش معتبر ہے جو 'علما' کی جانب سے ہو۔
- ۶۔ چنانچہ امت مسلمہ محمدیہ میں اصلاح کا مفہوم صرف اور صرف 'علما' کے ذریعہ عوام کی اصلاح ہے۔

یہی سبب ہے کہ 'علما' نہاد اصلاحی تحریکات کے صد فی صد رخ (Orientation)، جہت (Direction)، مواد (Content)، زور (Stress) اور ترجیح (Priority) لے دے کر عوامی اصلاح سے متعلق اور صرف اس پر مبنی ہوتے رہے ہیں۔

'علما' کا — یہ 'موقف' اور ان کا یہ 'موقف' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اور ان کی بدترین مخالفت ہیں۔ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی بدترین مخالفت اس لئے ہے کہ یہ 'ریائی یہودیت' کی روح، مزاج اور تعامل کی مثالی ترجمانی ہے جو کسی رسول اور اس کی ہدایت کی سخت دشمن ہے۔ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق امت مسلمہ محمدیہ کی ساری خرابیوں کا منبع اور محرک خواص (Elite) ہوا کریں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بھرپور وضاحت فرمائی تھی۔ چنانچہ صحابہ رسول بخوبی جانتے تھے کہ خواص (Elite) کون ہوں گے۔ چنانچہ ایک روایت ہے:

وعن زياد ابن حدير قال: قال لى عمر: هل تعرف ما يهدم الاسلام؟ قلت: لا.
قال: يهدمه زلة العالم و جدال المنافق بالكتاب و حكم الائمة المضلين (رواه
الدارمى)

ترجمہ: حضرت زياد بن حدير فرماتے ہیں کہ مجھ سے حضرت عمر نے دریافت کیا: کیا تمہیں معلوم ہے کہ اسلام کو کون سی چیز منہدم کر دے گی؟ میں نے کہا: مجھے نہیں معلوم۔ تو حضرت عمر نے فرمایا: عالم کی ہوس، منافق کا کتاب اللہ کے بارے میں جھگڑا کرنا (اللہ کی کتاب کو تباہ کر دینا) اور گمراہ حکمرانوں کی حکمرانی۔

661 عیسوی سے وقوع پذیر حقیقی اسلامی تاریخ کا اعتبار کیا جائے تو یہی تین عوامل تباہی کے ذمہ دار

ہیں۔ یہ تین عوامل ہیں:

۱۔ علما

۲۔ منافق اور

۳۔ حکمراں

ان میں اول و دوم دراصل ایک ہی صنف کے دو شاخسانہ ہیں جو 661 کے بعد ایک ہو گئے۔ دوسری طرف 661 عیسوی کے بعد تیسرا عامل یعنی حکمراں صرف مجازاً اور تعبیراً باقی رہا اور نہ حقیقتاً اس کا کوئی وجود نہیں تھا۔ حضرت ابوامامہ الباہلی کی روایت کے مطابق ”نقض صلاة“ کے بعد حکمراں اسلامی معاشرے کے حقیقی میدان عمل سے خارج ہو جاتے ہیں اور اس صورت میں خواص (Elite) میں صرف ’علما‘ شمار کئے جاسکتے ہیں۔

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق پہلی صدی ہجری کے بعد امت مسلمہ محمدیہ میں مفسد کا ’ظرف اور مظروف‘ صرف اور صرف وہ ہوں گے جو ’علما‘ کے نام سے موسوم و معروف ہوں گے۔ اب ایسی صورت میں ان ’علما‘ کا ’اصلاح‘ کے حوالے سے تمام مفسد کا ’ظرف اور مظروف‘ عوام کو قرار دینا خدا مخالف، رسول مخالف اور سنت مخالف عمل کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ خبر جس میں آپ نے فرمایا:

وعن على قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم يوشك ان ياتي على الناس

زمان لا يبقى من الإسلام إلا اسمه ولا يبقى من القرآن إلا رسمه. مساجد هم عامرة

وہی خراب من الہدیٰ۔ علماءہم شر من تحت ایدیہ السماء۔ من عندهم تخرج الفتنة۔
وفیہم تعود (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت علی روایت کرتے ہیں: فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے: قریب ہے کہ لوگوں پر ایسا دور آئے گا:

۱۔ جب اسلام نام کے لئے باقی رہ جائے گا،

۲۔ اور قرآن کی لکھاوٹ (یا لکھاوٹ کا نشان) باقی رہ جائے گی،

۳۔ مسجدیں آباد ہوں گی،

۴۔ مگر ہدیٰ کا کھنڈر ہوں گی،

۵۔ اس کے علاوہ آسمان کے نیچے بدترین مخلوق ہوں گے،

۶۔ ان (علماء) سے فتنے ظاہر ہوں گے،

۷۔ اور وہ (فتنہ) انہیں پر لوٹیں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق اسلام مٹ جائے گا، قرآن کی یاد باقی رہ جائے گی، مسجدیں آباد مگر ہدایت سے خالی ہوں گی۔ علماء بدترین مخلوق ہوں گے۔ وہ تمام فتنوں کے Habitat ہوں گے۔ امت کے جسد میں وہ ایک نامیہ Organism کی طرح ہوں گے جس کی غذا امت مسلمہ محمدیہ کی حرارت غریزی ہوگی۔ اور ان تمام مصیبتوں کو صرف 'عوام' کو جھیلنا ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانا: ان یاتی علی الناس زمان عام مسلمانوں پر آپڑنے والی کیسی ہولناک مصیبت کی خبر دیتی ہے۔

۱۶۔ اس 'ظاہرہ' کے حوالے سے بیسویں صدی میں برپا ہونے والے چند مخصوص اور اہم حوادث اور صورتحال کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں دو غیر معمولی تحریکوں نے جنم لیا۔ یہ دو غیر معمولی تحریکیں تھیں:

۱۔ تبلیغی جماعت جس کے بانی مولانا محمد الیاس کاندھلوی تھے — اور دوسری —

۲۔ جماعت اسلامی جس کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی تھے۔

یہ دونوں تحریکیں عظیم الشان تھیں لیکن ان کے بانیوں نے اپنی زندگی میں اپنے اپنے اہداف کو پانے میں ناکام ہو گئے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان دونوں تحریکوں کے مضمرات و عواقب امت مسلمہ کے لئے بے حد سنگین ہوئے۔ دونوں ہی تحریکیں اپنے بانیوں کی وفات کے بعد اسلام اور امت مسلمہ کے لئے

Counterproductive ہو گئیں۔

۱۔ تبلیغی جماعت اور مولانا محمد الیاس:

مولانا محمد الیاس اور ان کی برپا کردہ تحریک 'تبلیغی جماعت' (قیام 1927) کا دقیق مطالعہ اور تجزیہ سب سے پہلے ان کی سہ گانہ اہداف کو واضح کرتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مولانا محمد الیاس کے نزدیک ان کی تحریک کے تین اہداف تھے:

۱۔ انسدادِ فساد اور خاتمہِ منبعِ فساد

۲۔ اصلاحِ خواص یا اصلاحِ قیادت

۳۔ تربیت و تزکیہ عوام

بیسویں صدی کی تیسری دہائی 1927 سے 1944 تک جب مولانا محمد الیاس نے وفات پائی اور 1944 سے تا دمِ تحریر 2012 تک 'تبلیغی جماعت' کی کاوشوں کا دقیق جائزہ یہ بتاتا ہے کہ اس جماعت نے بلاشبہ اپنے ہدفِ اول کے نصفِ اول کے حصول میں غیر معمولی اور حیران کن کامیابی حاصل کر لی۔ مولانا الیاس کے مطابق (ایسا لگتا ہے کہ) امتِ مسلمہ میں فساد کا منبع اصلاً 'علما' ہیں۔ چنانچہ ایسا لگتا ہے کہ بانی تحریک نے تبلیغی جماعت اور اس میں شامل عوام کو 'جارجہ' بنایا اور اس 'جارجہ' کا سہارا لے کر اولاً منبعِ فساد یعنی 'علما' کا زور توڑ دینا چاہا۔ تمام امور کا جائزہ بتاتا ہے کہ وہ اس کے نصفِ اول یعنی 'علما بالقوۃ' کو توڑ دینے میں باسانی کامیاب ہو گئے۔ مولانا الیاس کی تبلیغی جماعت نے عملاً مسلم معاشرے میں 'علما' کو قوۃ (Potentially) بے اثر (Neutralise) کر کے مجبور و بے بس کر دیا۔ مسلم معاشرے میں 'علما' کی یہ بے بسی پچھلے پچاس سالوں کے دوران برصغیر میں ہر جگہ دیکھی جاسکتی ہے۔ چنانچہ دیکھتے دیکھتے ہندوستان کے طول و عرض میں تبلیغی جماعت کے سامنے 'علما' اسی طرح بے بس ہو کر رہ گئے جس طرح الف لیلی و لیلیٰ کی کہانی سندباد جہازی کے 'سفرِ وادی گوہر' میں پرندہ 'رخ' کے آجانے پر بڑے بڑے سانپ بے بس ہو جایا کرتے تھے۔ لیکن مولانا محمد الیاس اور ان کی تبلیغی جماعت ابھی تک 'علما' کو بالفعل بے بس کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

جہاں تک دوسرے اور تیسرے اہداف کی بات ہے تو مولانا محمد الیاس اور ان کی تبلیغی جماعت ان دونوں اہداف کے حصول میں بری طرح ناکام ہوئے۔ اصلاحِ خواص یا اصلاحِ قیادت اور تربیت و تزکیہ عوام میں نہ صرف وہ ناکام ہو گئے بلکہ اسلامی حیویت (Islamic Vitality) کے نقطہ نظر سے

مولانا محمد الیاس کی تبلیغی جماعت امت مسلمہ کے لئے حد درجہ Counter productive ثابت ہوئی۔ یہ بحث نہایت الجھی ہوئی ہے جس کا خلاصہ اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے:

(الف) تبلیغی جماعت کے تین اہداف میں سے ڈھائی اہداف میں ناکامی کا بنیادی سبب 'علما' کا تاریخی تعامل ہے۔

مولانا محمد الیاس کے زیر قیادت تبلیغی جماعت جیسے جیسے متحرک اور فعال تر ہوتی گئی 'علما' بالخصوص 'بڑے علما' خاموش اور Encapsulated ہوتے چلے گئے۔ ان کی خاموشی اور ان کا Cocooned ہونا ہی ان کی طرف سے سلبی (Passive) اور منفی (Negative) جوابی حملہ (Counterattack) تھا۔ چنانچہ 'علمائے اجل' نے عافیت کدوں میں سمٹ جانے میں مصلحت یا عافیت سمجھی اور متوسط اور چھوٹے علمائے مولانا محمد الیاس کی 'تبلیغی جماعت' کا حصہ بن جانے میں۔ لہذا یہ انوکھا Polarization عالم واقعہ میں ایک واضح تبدیلی ضرور لے کر آیا۔ مسلم معاشرے میں 'علما' کی Oligarchy تبلیغی جماعت یا کاندھلہ کی Monarchy میں بدل کر رہ گئی۔ لیکن اس تبدیلی نے 'علما' کو صرف 'بالقوة' بے بس کر دیا۔ وہ اب بھی 'بالفعل' موجود ہے۔

(ب) تبلیغی جماعت نے عوام کو 'جارحہ' (Membrum or Minister) کے بطور نہایت کامیابی سے برسر عمل کیا۔ اس کے نہایت Complex بلکہ Multiplex نتائج برآمد ہوئے۔ تبلیغی جماعت کے ذریعہ عوام کے Multiple Exposure نے مسلم عوام کو جواب 'تبلیغی' کہلاتے یا کہلانا پسند کرتے تھے نامیہ (Vector) میں تبدیل کر دیا جس نے تبلیغی جماعت کے اندر اور باہر مسلم معاشرے میں پائی جانے والی ہر شے — افراد، اجتماعیات اور اداروں اور ان کے اذہان، دماغ، شعار، فکر، عادت اور تعامل کو مکمل طور پر عامی (Vulgar) بنا کر رکھ دیا۔ عامیاناہ پن (Vulgarity) کا یہ جرثومہ (Virus) اور اس کا یوں نامیہ (Vector) میں تبدیل ہو جانا علمائے عمرانیات (Sociologists) کے لئے حیرتناک تھا۔

تبلیغی جماعت میں پیدا شدہ Vectorization اپنے جلو میں عجیب و غریب 'ظاہرے' لے کر آیا۔ تبلیغی جماعت کے زیر اثر آنے والے مسلم معاشرے کے خواص دیکھتے دیکھتے ذہنی اور علمی طور پر 'عوام' میں تبدیل ہو کر رہ گئے۔ اس کے برخلاف تبلیغی جماعت میں سرگرم عوام آنا فانا 'خواص' بن گئے۔ سرگرم تبلیغی عوام کا 'خواص' بن جانا دراصل ان کا 'علما' بن جانا تھا۔ بلاشبہ تبلیغی جماعت کے اثر، اقتدار اور وسعت نے عوام کو بالفعل نہیں تو بالقوة 'علما' ضرور بنا دیا۔

(ج) ملک کے ہر خطے اور حصے میں تبلیغی جماعت کے پھیل جانے سے معاشرے پر اس کی گرفت مضبوط تر ہوتی چلی گئی۔ قصبہ قصبہ، قریہ قریہ اور گاؤں گاؤں میں تبلیغی جماعت کے ذمہ داران کی رائے اب معنی رکھتی تھی۔ چنانچہ اس صورتحال نے امت میں پانچ کیفیات کو جنم دے دیا:

۱۔ 'علمائے اجل' کی رجعت اور عقب نشینی (Retirement, Retreat & Retrogression)

۲۔ 'علمائے متوسط و عام' کی تبلیغی جماعت میں پناہ گزینی (Emigration to the Refugium)

۳۔ تبلیغی جماعت سے متاثر 'خواص' کی 'عامیت' (Plebeianization & Vulgarization)

۴۔ تبلیغی سرگرم عوام کی 'خاصیت' (Patricianization)

۵۔ بقیہ مسلم افراد و طبقات (خواہ ان میں اعلیٰ ترین اہل علم اور عباقرہ ہی کیوں نہ ہوں) کا مکمل

-Marginalization

ان پانچوں کیفیات نے دو نتائج برآمد کئے:

۱۔ تبلیغی جماعت اپنے دوسرے ہدف یعنی اصلاح خواص یا اصلاح قیادت میں کلیتہً ناکام ہو گئی۔

۲۔ تبلیغی جماعت اپنے تیسرے ہدف یعنی تربیت و تزکیہ عوام میں کلیتہً ناکام ہو گئی۔

لیکن یہ دونوں ناکامیاں بالکل الگ اور متخالف ہیں۔ ان میں وہی بُعد ہے جو 180° کے دوسروں کے مابین ہوتا ہے۔ تبلیغی جماعت اپنے دوسرے ہدف میں اس لئے ناکام ہو گئی کہ اس عنوان سے اس نے کوئی کام سرے سے کیا ہی نہیں۔ اور جو کیا وہ Counter productive تھا۔

اپنے تیسرے ہدف میں تبلیغی جماعت اس لئے ناکام ہو گئی کہ اس نے عوام کو 'جارجہ' بنا دیا۔ عوام کے علی الاطلاق 'جارجہ' بننے نے اسے فوراً نامیہ (Vector) میں تبدیل کر دیا۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے ان نامیوں (Vectoris) کا Spill شروع ہو گیا جو اب لامتناہی نظر آتا ہے اور بظاہر بے قابو (Uncontrollable) بھی۔

(د) تبلیغی جماعت کا ایک مخصوص اثر برصغیر میں ایسا بھی ہوا ہے جس کا باضابطہ کوئی سروے اب تک

نہیں کیا جاسکا ہے یا کوئی ایسا سروے عاجز کے علم میں نہیں آسکا ہے۔ لیکن Random Samples اور

ان کے Data کی بنیاد پر ایسا کہا جاسکتا ہے کہ اس کے اثرات امت مسلمہ پر بڑے مہلک ہوئے ہوں

گے۔ ہندوستان میں پچھلی صدیوں میں خانقاہوں (مزارات نہیں) بالخصوص علمی خانقاہوں نے نہایت

اہم رول ادا کیا تھا۔ ہندوستان میں ان کی تشکیل ایک خاص توجیہ (Orientation) رکھتی تھی جس کو

ہندوستانی مزاج سے خاص مناسبت تھی چنانچہ کم از کم گاؤں کی سطح پر (اور ہندوستان چونکہ روایتاً وہی ملک رہا ہے) ان خانقاہوں نے نہایت مثبت اور تعمیری کردار ادا کیا تھا۔ اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ ہندوستان کے طول و عرض میں قائم لاکھوں خانقاہیں جو اب مزارات یادگار ہوں کے نام سے زیادہ مشہور ہیں اور ان سے وابستہ پیر صاحبان اور پیر زادگان اسلام کے نمائندے ہیں۔ بلاشبہ صوفیائے کرام نے ہندوستان میں اسلام کی عظیم الشان خدمات انجام دیں۔ لیکن ان کے بعد اور ان کے نام سے قائم ان کی خانقاہوں اور ان سے وابستگی ظاہر کرنے والوں نے اسلام کی ایسی بیخ کنی کی جو تاریخ میں یاد رکھی جائے گی۔ عاجز نے خانقاہ لکھ کر یہاں ایک خاص مفہوم لیا ہے۔ لہذا اس کی تشریح ضروری معلوم ہوتی ہے۔

۱۔ خانقاہ کے دو معانی اور دو صورتیں ہیں۔ لہذا ہندوستان میں صدیوں سے ان دونوں معانی اور صورتوں کی خانقاہیں پائی جاتی رہی ہیں۔ ان میں ایک اسلامی ہے جب کے دوسرے کا اسلام سے صرف برائے نام تعلق ہے۔

۲۔ خانقاہ کی پہلی قسم: شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کے مطابق یہ لفظ خان بمعنی خانہ اور قاہ بمعنی دعا سے مرکب ہے یعنی عبادت خانہ۔ [ملاحظہ فرمائیں: خیر المجالس]۔ خانقاہ کسی 'محل' یا 'مقام' کی طرح وجود رکھتے ہوئے بھی کوئی تعمیر نہیں ہوتی تھی۔ ہر وہ 'محل' یا 'مقام' جہاں ایک ہستی اور چار چیزیں پائی جائیں اسے خانقاہ کہا جاتا ہے۔ گویا یہ ایک ایسے تعبیری مقام (Virtual Place) کو کہتے ہیں جو چند دنوں، مہینوں یا سالوں میں ختم ہو جاتا تھا۔ وہ پانچ ذوات جو کسی 'محل' کو خانقاہ بناتی ہیں درج ذیل ہیں:

۱۔ شیخ، ۲۔ سجادہ، ۳۔ خرقہ، ۴۔ دستار اور ۵۔ نعلین۔ چنانچہ حضرت قطب الدین بختیار کاکی نے شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر سے آخری ملاقات میں فرمایا:

”من امانت شمارا یعنی سجادہ و خرقہ و دستار و نعلین بقاضی حمید الدین ناگوری خواہم داد بعد از پنجم روز بشما خواہد رسانید آزا گرو آرید، مقام ما مقام شماست“۔ [ملاحظہ فرمائیں: امیر خورد: سیر الاولیاء ص ۷۳] ایسی خانقاہ شیخ کی حیات تک باقی رہتی تھی پھر یا تو وہاں منتقل ہو جاتی تھی جہاں مذکورہ پانچ ذوات ہوں یا پھر ختم ہو جاتی تھی۔ چنانچہ حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی سے ان کے مقرب خاص شیخ زین الدین نے دریافت کیا:

”مخدوم بیشتری مریدان شما صاحب حال و اہل کمال اند۔ ازیں جملہ یکی را اشارت شود کہ بجای شما نشستہ باشد کہ ایں سلسلہ بکلی گسستہ نگردد“۔ حضرت نے فرمایا کہ جن دریشوں کو تم اہل سمجھتے ہو ان کے نام

لکھ لاؤ۔ شیخ زین الدین نے تین فہرستیں تیار کیں۔ اعلیٰ، اوسط اور ادنیٰ۔ شیخ نے مطالعہ کے بعد فرمایا:

”شیخ زین الدین ایشاں را بگو کہ غم ایمان خود بخورند چہ جای آن کہ بار دیگر بردارند“۔

[ملاحظہ فرمائیں: کلمہ خیر المجالس اور سیر العارفین]

چنانچہ حضرت چراغ دہلوی نے وصیت فرمائی کہ سلسلہ کے سب تبرکات ان کے ساتھ دفن کر دیئے جائیں۔

ایسی خانقاہوں میں شیخ کی زندگی میں چار اقسام کے لوگوں کی آمد و رفت اور قیام رہتا تھا۔

۱۔ خلفاء، ۲۔ مخصوص مریدین، ۳۔ عام مریدین اور، ۴۔ عوام۔ شیخ کی وفات پر یہ تعبیری خانقاہ (Virtual Khanqah) ختم ہو جاتی ہے۔

۲۔ خانقاہ کی دوسری قسم: شیخ کی وفات کے بعد بھی وہ جگہیں حسب سابق خانقاہیں کہلاتی ہیں۔ لیکن اب وہ شیوخ کے مزارات اور ان کی صلبی و صہری اولادوں کی سکونت گاہ بن جاتی ہیں۔ حکمرانوں، امراء، مستسبین، متمول مسلمانوں اور دیگر عقیدت مندوں کے ہدایا، نذرانوں اور تحائف سے یہ مقامات اور اس کے ساکنان فیض یاب ہوتے رہتے ہیں۔ ہر چند کہ ایسی جگہیں اب بھی خانقاہیں کہلاتی ہیں اور ان کے متعلقین بالواسطہ یا بلاواسطہ، ضرورۃً یا مصلحتاً پیری مریدی کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں لیکن ان کا ان بزرگان دین سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔ بالخصوص حضرات چشتیہ کے تین بنیادی اصول تھے۔ جن سے خانقاہوں کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے:

۱۔ اصول اول برائے خانقاہ: طمع منع، طمع منع اور جمع منع

۲۔ اصول دوم برائے مستسبین: مرکزی نظام سے وابستگی

۳۔ اصول برائے خلفاء، مریدین خاص، مریدین: تارک دنیا ہونا۔

حضرت نظام الدین اولیاء نے خلافت نامہ دیتے ہوئے فرمایا:

”می باید کہ تارک دنیا باشی۔ بسوی دنیا وار باب دنیا مائل نشوی و دیہہ قبول کنی۔ وصلہ بادشاہاں

نگیری“۔ [ملاحظہ فرمائیں: سیر الاولیاء، ص۔ ۲۹۵]

’تارک دنیا‘ کی تشریح فرماتے ہوئے حضرت محبوب الہی نے مزید فرمایا:

۱۔ فتوح کو جمع کر کے نہ رکھیں۔

۲۔ امرا و سلاطین کی صحبت سے پرہیز کریں۔

۳۔ وظائف اور ادارہ قبول نہ کریں۔

۴۔ ملازمت شاہی سے بچیں۔ [تفصیلات کے لئے ملاحظہ فرمائیں: سیر الاولیاء، فوائد القواد، احسن الاقوال، انفاس العارفين وغیرہ]۔

چنانچہ پہلی قسم کی خانقاہیں اب خال خال ہیں۔ رہیں دوسری قسم کی خانقاہیں تو ان کی تعداد لاکھوں میں ہے۔

تبلیغی جماعت نے ان خال خال بھی اصلی خانقاہوں پر نہایت منفی اثرات ڈالے۔ عوامی اور عمومی خانقاہوں اور مزارات پر خواہ کوئی اثر نہ پڑا ہو لیکن علمی خانقاہیں تباہ و برباد ہو گئیں یا ٹھنڈ کر رہ گئیں۔

ملاحظہ فرمائیں:

[C.W. Troll, (ed): Muslim Shrines in India: Their Character, History and Significance: Oxford: OUP. 1989]

(ہ) ان تمام باتوں کا سب سے خطرناک نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ مسلم معاشرے کی حیثیت ترقیبی میں ایسا انقلاب آیا جو شاید چنگیز، ہلاکو اور نادر شاہ کے حملوں سے بھی مسلم معاشرے میں نہ آسکا تھا۔ کسی بھی قوم کے جسد کے تین افقی حصے ہوتے ہیں۔ یوں تو سب اہم ہیں لیکن سب سے اہم متوسط حصہ ہوتا ہے جو جسم میں کمر کی مانند ہے۔ مسلم معاشرے کا متوسط طبقہ اس کی کمر کے مانند تھا۔ تبلیغی جماعت نے مسلم معاشرے کے ہیکل کو Upside down کر کے رکھ دیا۔ چنانچہ امت کی کمر ہی ٹوٹ کر رہ گئی۔ اس کا اندازہ اگلے پچاس سالوں میں بخوبی ہو جائے گا۔ لیکن سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ آخر ایسا ہوا کیوں؟ ان تمام باتوں کی جڑ کہاں ہے؟ تبلیغی جماعت کی کارکردگی کا غائر مطالعہ اور تجزیہ یہ بتاتے ہیں کہ اس کا سبب خود اس تحریک کی تعمیر میں ایک مضمحل خرابی تھی۔ تعمیر میں وہ مضمحل خرابی تھی: ”اس تحریک کے بانی مہانی اور ان کے تمام اجل رفقا کا خود طبقہٴ علما سے ہونا۔“ چنانچہ اس تحریک کے تمام عمود (Pillars) ’مدارس‘ کے فارغین تھے۔ ان کی فکر اور ان کا فکری افق، علم اور علمی عمق، عمل اور عملی میدان، ذہن اور ذہنی سعادت، پسند اور ناپسند اور ان کے سارے اوزان و عیارات ’مدرسہ‘ کے ماحول میں تشکیل پائے ہوئے تھے۔ چنانچہ ہر چند کہ انہوں نے تین اہداف مقرر فرمائے لیکن ان کے لاشعور میں صرف تیسرا ہدف حاوی تھا۔ چنانچہ ان کا سارا زور تیسرے ہدف پر رہا۔ لیکن چونکہ وہ شعور کی سطح پر تین اہداف رکھتے تھے چنانچہ ان کے شعور نے تیسرے ’معمول‘ کو ’معمول‘ رہنے نہیں دیا بلکہ ’معمول‘ کو ’عامل‘ اور ’جارجہ‘ بنا دینا چاہا۔

اس شعوری اور لاشعوری تصادم کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ان کا 'معمول' 'عالم' بنتے ہی نامیہ (Vector) میں تبدیل ہو گیا۔ ممکن ہے ایسا نہ ہوا ہو بلکہ باطن کوئی ایسی تبدیلی واقع ہو گئی ہو جس نے ان کے تیسرے ہدف کو جن پر وہ 1927 سے عامل تھے غیر شعوری طور پر توسیع دے دی۔ 1938 کے بعد تبلیغی جماعت کی سرگرمیوں کی بدلتی ہوئی صورتحال کا گہرا مطالعہ یہ تاثر بھی دیتا ہے کہ ایسا ہونا دراصل اس فرق اور اس کے تبلیغی جماعت پر پڑنے والے اثرات کے سبب بھی ہو سکتا ہے جو مولانا محمد الیاس اور مولانا محمد زکریا کے مزاج میں پایا جاتا تھا۔ کسی بھی تحریک میں دو مفکر (Ideologue) اور دو تفکیریں (Ideologies) مہلک (Fatal) ہوتے ہیں۔

از حد الجبھی اور عسیر الاستخراج اس بحث کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱۔ تبلیغی جماعت ایک جمعی — اجماعی — اجتماعی تحریک ہے۔ جو ہے وہ نظر نہیں آتا، جو نظر آتا ہے وہ ہے نہیں۔ یہ تحریک اب ناقابل اصلاح اور بے قابو ہو چکی ہے۔ ابتداءً یہ تحریک طالعی اور طلاعی تھی۔ 1938 کے بعد متفجر ہو کر بے قابو ہو گئی۔ کسی بھی عمل کی صلاح کے لئے احتساب ضروری ہے۔ اجتماعی عمل کے لئے ناگزیر۔ کسی اجتماعی عمل کا سب سے اچھا احتساب انسانی معاشرہ کرتا ہے۔ معاشرتی احتساب سے گریز، بے پروائی اور اس سے توحش خودکشی کے مترادف ہے۔ ایسی تحریک جبلی طور پر معاشرے سے لاتعلق رہتی ہے اس لئے معاشرتی احتساب کی اس کے نظام میں کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ 1938 کے انفجار کے بعد تبلیغی جماعت کے بے قابو ہونے کا کھلا ثبوت اس کا معاشرے کے تعلق سے اپنے 'منفرد رویے کا اظہار ہے۔ یہ رویہ روئے ارض کے تاریخی 'منفرد رویوں میں سے ایک ہے۔ معاشرے کے تعلق سے اس تحریک کا رویہ ہے:

With you; Without you; and In spite of you.

چنانچہ احتساب کے بغیر کوئی تحریک 'رحم مفسد' میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔
۲۔ 1938 کے بعد اس تحریک کا عالمی ہو جانا ترقی نہیں بلکہ اس کا Fallout ہے۔ مولانا الیاس کی تحریکی سرحدیں اصلی (Actual) تھیں اب اس کی سرحدیں تعبیری (Virtual) ہیں۔ یوں تو ہر تحریک اپنے بانی کے ساتھ اختتام کو پہنچ جاتی ہے چنانچہ اس تحریک کی یافت و نایافت کی تعیین کا سن 1944 ہے۔ ایسی متعدد شہادتیں موجود ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ 1938 سے 1944 کی مدت میں اس تحریک میں وہ ساری علامتیں ظاہر ہو چکی تھیں جو کسی تحریک کی 'تعمیر' کا اعلان کرتی ہیں۔

۳۔ مولانا الیاس کی تحریک کی اعلیٰ ترین خصوصیات (Forte) ہی اس تحریک کی بدترین کمزوریاں (Bête noires) تھیں۔ مولانا الیاس کی تحریک دو خصوصیات کی حامل تھی اولاً: زبانی (Oral) اور ثانیاً: سادہ (Simplistic)۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مولانا الیاس کی تدبیر تھی۔ عاجز کا خیال ہے کہ ایسا نہیں تھا بلکہ اپنی تحریک کو زبانی (Oral) اور سادہ (Simplistic) بنانا یا رکھنا ان کی مجبوری تھی۔ ایسی مجبوری دو دھاری تلوار کے مانند ہوتی ہے جو اکثر اوقات خودکشی (Suicide) پر منتج ہوتی ہے۔ چنانچہ یہی مجبوری 1938 کے بعد Suicidal ہو گئی۔

۴۔ تبلیغی جماعت پر پچھلے ساٹھ سالوں میں جو کچھ تحقیق ہوئی وہ ناقص اور گمراہ کن ہے۔ اس کا ایک ہی سبب ہے: ساری تحقیقات 'ظواہر' سے بحث کرتی ہیں۔ کوئی بھی قابل ذکر تحقیق اس کی 'حقیقت' سے بحث نہیں کرتی۔ اس کا سبب قابل فہم ہے۔ محققین ایسی اہلیت اور ایسے ادوات کے حامل نہیں جو اس طرح کے Ultramundane تحریک کا ادراک کر سکیں۔

تورات اور انجیل کے ان مباحث کی جو قرآن میں اپنی اصلی حالت میں مخزون ہیں گہرائیوں تک رسائی کے بغیر ایسی تحریک کو سمجھنا ممکن نہیں۔ لہٰذا تو ذونہی (61:5)، نحن انصار اللہ (61:14) اور لہٰذا تقولون ما لا تفعلون (61:2) تک آج کس کی رسائی ہے؟

۵۔ عاجز کا خیال ہے کہ مولانا الیاس اس تحریک کا آغاز کرتے ہوئے ایک بات فراموش کر گئے۔ وہ یہ بھول گئے کہ ان کا وجود 'آدمی'، 'انسانی' اور 'بشری' ہے۔ لہٰذا وہ 'باہمہ' ہو سکتے ہیں اور نہ بے ہمہ رہ سکتے ہیں۔ چنانچہ 'باہمہ' کو اس کی چنداں ضرورت نہیں کہ دوسروں کو اپنا 'علم' منتقل کرے یا دوسروں پر اپنا 'ارادہ' ظاہر کرے۔ اسی طرح 'بے ہمہ' کو اس کی ضرورت نہیں کہ وہ کسی کو اپنا 'نصب العین' بتائے۔ چنانچہ مولانا الیاس اپنی تحریک کے 'بانی' اور 'ہادئ' دونوں ثابت ہوئے۔ 1944 کے بعد کے Phenomenon کی دو اعتبار سے تعبیر کی جاسکتی ہے۔

اولاً: اگر اسے مولانا الیاس کی وہی تحریک مانا جائے جو 1927 میں قائم ہوئی تھی تو پھر 1944-2012 کی مدت میں واقع ہونے والے امور و ظواہر اس تحریک کے Fallout قرار پائیں گے۔
ثانیاً: اگر 1944 کو مولانا الیاس کی تحریک کا سال انہدام مانا جائے تو اس مدت 1944:2012 میں مرادف تحریکیں ان حضرات کی تحریکیں قرار پائیں گی جو اس کے امیرز رہے یا ہیں۔

۶۔ عاجز کے نزدیک مولانا الیاس کا سب سے دقیق اظہار اس گفتگو میں امت کے سامنے آیا جو

انہوں نے اپنے مرض الموت میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری سے کی۔ [ملاحظہ فرمائیں: رسالہ الفرقان ماہ رجب و شعبان ۱۳۶۳ھ]

۷۔ عاجز کے نزدیک 'تبلیغی جماعت' آفاق میں پھیل کر رہے گی۔ کوئی اس کی راہ باندھ نہیں پائے گا۔ اس لئے کہ وہ سب کچھ ہو کر رہے گا جس کی خبر نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔
ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ سر سید: آثار الصنادید۔ ج۔ دوم، مرتب خلیق انجم، اردو اکیڈمی، دہلی۔

۲۔ مولانا محمد احتشام الحسن کاندھلوی: تذکرہ اسلاف حالات مشائخ کاندھلہ، جلد اول و دوم، دارالاشاعت کاندھلہ، مظفرنگر۔

۳۔ محمد عاشق الہی میرٹھی: تذکرہ الرشید، مکتبہ شیخ زکریا، سہارنپور۔

۴۔ مولانا محمد منظور نعمانی: ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاس، الفرقان بک ڈپو، لکھنؤ۔
۵۔ چھ باتیں۔

۶۔ مولانا محمد زکریا: تبلیغی نصاب (اب فضائل اعمال)۔

۷۔ مولانا محمد زکریا: آپ بیتی: مکتبہ شیخ زکریا، سہارنپور۔

۸۔ مولانا محمد زکریا: الاعتدال فی مراتب الرجال۔

۱۸۔ جماعت اسلامی اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی:

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی شخصیت اور جماعت اسلامی کے لٹریچر اور تاریخ کے دقیق مطالعے اور تجزیے سے ان کے اہداف یوں مشخص ہوتے ہیں:

۱۔ حکومت الہیہ کا قیام: یہ وہ ہدف ہے جسے بعد میں 'اقامتِ دین' سے تعبیر کیا گیا۔

۲۔ اس ہدف کے حصول کے لئے ایک 'صالح جماعت' کی تشکیل۔

جماعت اسلامی کے قیام کی بذریعہ مدت (Seminal Period) کا اعتبار کیا جائے تو دس سالوں

بعد اور اگر اس کے باضابطہ قیام کی تاریخ کا اعتبار کیا جائے تو محض تین سالوں بعد اس تحریک کے بانی مہمانی

مولانا مودودی کو بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کی تحریک انجام کار کے اعتبار سے مقصد گاہ تک پہنچنے سے

قاصر رہے گی جس کا برملا انہوں نے اظہار بھی کر دیا تھا۔ [ملاحظہ فرمائیں: روداد جماعت اسلامی، حصہ دوم و

سوم] تاہم وہ ایک باعزم انسان تھے۔ لہذا کسی بھی باہمت اور دیانتدار جہاز راں کی طرح جس پر اتھاہ

سمندر کے بیچ یہ بات منکشف ہو جائے کہ اب یہ جہاز جس کا وہ کپتان ہے منزل تک نہیں جاسکتا اور اخلاقی کوئی صورت بھی میسر نہیں انہوں نے اپنی تحریک کے جہاز کو ترک (Abort) نہیں کیا۔ محض تین سالوں کے اندر ہی انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ ان سے ذاتی طور پر دو غلط فہمیاں سرزد ہو چکی ہیں جن کے سبب وہ دو خلاف واقعیت اندازے (Estimates) قائم کر چکے ہیں جن کی توجیہ مکرر اب ممکن نہیں۔ وہ دو غلط فہمیاں درج ذیل ہیں:

۱۔ علم سے ربط

۲۔ ہدف کے حصول میں عجلت

مذکورہ دو باتوں کے انکشاف کے باوجود عاجز کا اندازہ ہے کہ مولانا پر یہ بات کماحقہ واضح نہیں تھی کہ یہ دونوں 'غلط فہمیاں' فی الواقع ان سے کیسے سرزد ہوئیں؟ عاجز کا خیال ہے کہ ان کا تعلق مولانا کی زندگی میں واقع ہونے والے اس لمحے سے ہے جس سے وہ بچپن اور لڑکپن میں گزرے۔ وہ بلاشبہ ذہین، طباع اور فطین تھے۔ ایسے میں ناموافق حالات نے انہیں غیر معمولی طور پر اُعد بنا دیا۔ چنانچہ حد درجہ ذہین اور فطین انسان ایسے ناموافق حالات میں ایک ایسے Reductionism کا احساس کرنے لگتا ہے جو اصلی ہونے کی بجائے Pseudo-Reductionism سے مشابہ ہوتا ہے۔ ماحول میں اگر تعمیری قوتیں حاوی ہوں تو ذہین اور فطین انسان اس Pseudo-Reductionism کے نقص کا جلد ادراک کر لیتا ہے اور اسے درست کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے لیکن اگر بد قسمتی سے ماحول غیر تعمیری، تخریبی یا جدالی ہو تو فطین انسان بھی یا تو ادراک نہیں کر پاتا یا اگر کرتا بھی ہے تو اس کی درستگی کرنے کی حالت میں خود کو نہیں پاتا۔

چونکہ زمانے کو ثبات نہیں۔ وہ ہمہ دم متبدل اور متغیر ہے۔ لہذا اس کا جبر انسان کو ہمہ دم بروقت فیصلے کرنے کے لئے مجبور کرتا رہتا ہے۔ ٹھیک یہی وہ وقت ہوتا ہے جب انسان سے ایسی 'غلط فہمیاں' سرزد ہو جایا کرتی ہیں۔ عاجز کا اندازہ ہے کہ ایسا ہی مولانا مودودی کے ساتھ بھی ہوا ہوگا۔ ان کے اندر پیدا ہونے والے Reductionism کے دو نتائج برآمد ہوئے:

۱۔ سطحی معلومات

۲۔ عجلت پسندی

کسی کو یہ بدگمانی نہ ہو کہ 'سطحی معلومات' سے مراد یہاں 'مجرد سطحی معلومات' ہے۔ ذہین، طباع اور فطین انسان کی 'سطحی معلومات' بھی دس کتابی کیڑوں (Nerds) سے زیادہ وسیع و عمیق ہوتی ہے۔

’علماء‘ کے تعلق سے مولانا محمد الیاس اور تبلیغی جماعت کا رویہ ’تدبیری‘ معلوم ہوتا ہے جسے برتنے کے لئے مولانا محمد الیاس نے عوام کی نہایت اچھی تربیت کی تھی اور ان سے بھرپور کام لیا۔ 1950 سے قبل تبلیغی جماعت میں رائج درج ذیل ’Clitches‘ اسی ’تدبیری‘ رویہ کا اظہار معلوم ہوتے ہیں:

۱۔ ’علماء‘ کی تکریم کی جائے۔

۲۔ ’علماء‘ کی دعائیں لی جائیں۔

۳۔ ’علماء‘ (تبلیغ سے) زیادہ اہم اور اعلیٰ و ارفع کاموں میں مشغول ہیں۔

۴۔ ’علماء‘ کو (تبلیغ میں) شمولیت کی دعوت دی جائے لیکن ان کے عدم شرکت پر قطعاً ان سے یا ان کے حوالے سے اظہار ناراضگی نہ کی جائے۔

مولانا محمد الیاس اس پر سختی سے عامل رہے اس باب کا نقطہ عروج وہ موقع ہے جب آپ نے اپنے میواتی مسٹر شہین کو مولانا تھانوی (1863-1943) کے پاس ان کی خانقاہ میں پیش فرمایا۔

اس کے برخلاف ’علماء‘ کے تعلق سے مولانا مودودی کا رویہ ہمسرا نہ مگر مصالحانہ، مفاہمانہ اور عاجز کی رائے میں خوش فہمانہ تھا۔ مولانا مودودی کا یہ رویہ ان کی تحریک کے لئے اول و بہتہ میں ہی مہلک (Fatal) ثابت ہوا۔

ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ محمد منظور احمد نعمانی: مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت اور اب میرا

موقف: الفرقان بک ڈپو، لکھنؤ۔

۲۔ حکیم خواجہ اقبال احمد: میں بھی حاضر تھا وہاں: 1986۔

۳۔ میاں طفیل محمد: مشاہدات۔

ایسا لگتا ہے کہ مولانا مودودی کا یہ رویہ بنیادی طور پر ان کے Reductionism کے سبب پیدا ہوا تھا۔ دوسری جانب ایسا لگتا ہے کہ مولانا مودودی اپنے ’ہدف اصلی‘ کے دونوں اجزا کے حوالے سے بھی اسی Reductionism کا شکار ہو گئے۔ انہوں نے اپنے ہدف اور اس کی حصولیابی کے لئے عمرانی علوم (Social Sciences) کے مختصرات سے استفادہ کیا جس کے سبب عاجز کی ناقص رائے میں اس کے قیام کے Phases یا Segments کے تعلق سے وہ درست، عملی اور حقیقت پسندانہ فیصلے نہ کر سکے اور انتشار ذہنی کا شکار ہو کر رہ گئے۔ عاجز کی ناقص رائے ہے کہ اگر مولانا مودودی نے عمرانی علوم (Social

(Sciences) کی مبسوطات اور مَطْوَلات کے ساتھ ساتھ قرآن و سنت کے دقیق نکات کی Simulation بھی کر لی ہوتی تو ان سے یہ غلط فہمی ہرگز ہرگز سرزد نہ ہوتی۔ ممکن ہے دوسری بات ہو۔ بعض اوقات ایسی غلط فہمی کا ارتکاب 'طبع' اور 'مزاج' کی 'مخصوص افتاد' کے سبب بھی ہو جاتا ہے۔ یہ بھی عین ممکن ہے کہ مولانا مودودی کی پہلی غلط فہمی ان کی دوسری غلط فہمی کا سبب بنی ہو بلکہ یہ بات زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ قرآن بھی اسی کی تائید کرتے ہیں۔ مولانا مودودی کی پہلی غلط فہمی خود ایک خاص نقطہ نظر کا نتیجہ تھی۔ مولانا مودودی 'علما' کو لاشعوری طور پر معیارِ حق، معیارِ اسلام اور معیارِ مطلوب سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے پاس ایسے وزنی دلائل اور محکم ثبوت ہیں کہ 'علما' ان کے ہم خیال ہو جائیں گے۔ ان کو اس کا یقین تھا کہ وہ 'علما' کو مطمئن کر لیں گے۔ قرآن و احادیث کا ان کا وسیع مطالعہ انھیں یقین دلارہا تھا کہ ان کی دعوت پر 'علما' کا بڑا طبقہ ان کی آواز پر لبیک کہہ دے گا۔ اسی خیال نے غالباً ان کی تحریر کو لاشعوری طور پر 'علما' موجہ (Ulama Oriented) بنا دیا۔ ہمہ وقت 'علما' موجہ ہونے کی کیفیت نے انہیں لاشعوری طور پر 'علما' کی طرح سوچنے والا بنا دیا۔ 'علما' نے تو انہیں پہلے ہی طعن تشنیع سے وضع قطع میں 'قبلہ نما' بنا دیا تھا۔ تحریک کے قیام کے پہلے سال سے ہی وہ اندرونی اور بیرونی دونوں محاذوں پر 'علما' کی تحدی (Threat) کی زد پر رہے۔ اندرونی اور بیرونی 'علما' کے نشانے کی زد پر ان کی زندگی 'علما' نہاد (Ulama-Typed) بن کر رہ گئی چنانچہ ایسی حالت میں وہ قرآن و سنت کا Simulation کرنا تو دور کی بات قرآن و سنت میں جمہور سے الگ ہٹ کر غور کرنے کی جرات بھی کیسے کر سکتے تھے لہذا وہ قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور دہرے کے مابین درست تطبیق کرنے سے قاصر رہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی گہرائیوں تک وہ صرف 'علما' کے سبب پہنچنے سے قاصر رہے۔ کاش انہوں نے 'علما' کا خیال پہلے سے ہی اپنے ذہن سے نکال دیا ہوتا اور یک سو ہو کر صرف عصری علوم کے حاملین، تعلیم گاہوں اور زندگی کے ان شعبوں کو اپنا میدان کار بنایا ہوتا جہاں صرف عصری علوم کے افراد کی نمائندگی ہوتی تھی تو آج معاشرہ ان کی تحریک کے لئے غیر معمولی امکانات کا نقشہ پیش کر رہا ہوتا۔

تقریب فہم کے لئے ایک مثال دینے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ دو افراد جن میں ایک پاؤں سے معذور ہے اور دوسرا اندھا اور دونوں کو ایک پہاڑی سلسلہ پار کرنا ہے جہاں تلی پگڈنڈیاں، گھماؤ دار راستے اور دونوں جانب گہری وادیاں ہیں۔ ان دونوں کے پاس صرف ایک ہی راہ ہے کہ اندھا پاؤں

سے معذور شخص کو اپنے کاندھوں پر سوار کر لے اور پاؤں سے معذور مگر بینا شخص اسے راہ بتاتا جائے۔ اب اگر اندھا اسے اپنے کاندھے پر سوار کرانے کو راضی نہ ہو تو پاؤں سے معذور شخص پہاڑی سلسلہ عبور کر سکتا ہے ممکن ہے کہ اس کی ایک دن کی راہ ایک ہفتے میں طے ہو۔ لیکن اگر اندھا اس پر بضد ہو کہ وہ پاؤں سے معذور شخص کو کاندھوں پر سوار کرائے نہ اس کی بتائی راہ پر چلے بلکہ وہ خود پاؤں سے معذور شخص کے کاندھوں پر سوار ہونا چاہے اور اس راہ پر چلنا چاہے جس کی راہنمائی وہ خود کرے تو دونوں ہلاک ہو کر رہ جائیں گے۔ مولانا مودودی نے بالواسطہ اور لاشعوری طور پر 'علما' کی اسی ضد کے سامنے خود سپردگی کر دی جس نے مولانا کو وادی تیبہ میں پہنچا کر دم لیا۔

مولانا مودودی کو اپنی تحریک کے 'ہدفِ اصلی' کے Phases یا Segments کی تعیین میں سخت تسامح ہوا جس کا سبب قرآن و احادیث میں غور و فکر کرنے میں 'جمہورِ علما' کا نقطہ نظر اختیار کرنا تھا۔ 'جمہورِ علما' کا فہم قرآن و احادیث عملی زندگی سے کوسوں دور ہے بلکہ عملی زندگی سے اس کا کبھی کوئی تعلق ہی نہیں رہا، لہذا ایسا تسامح ہونا خلاف توقع نہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ کے اس ہولناک مگر دقیق نکتے کو مولانا محمد اسلم جیراچپوری نے کس حسن و خوبی سے بیان فرمایا ہے:

”مسلمانوں میں جب سے لامرکزیت آئی اس وقت سے انھوں نے اللہ اور رسول کی اطاعت کے لئے قرآن و حدیث کو لے لیا اور اولوالامر کی جگہ علما آ گئے۔ جن کے باہمی جھگڑوں میں سے کوئی ایک جھگڑا بھی آج تک قرآن و حدیث سے فیصلہ نہ ہو سکا۔ یہ خیال مذہبی انفرادیت کی پیداوار ہے۔ اللہ اور رسول کی اطاعت صرف زندہ امام کے ذریعے ہی ہو سکتی ہے جو ضروریاتِ زمانہ کے مطابق امت کو قرآن کی روشنی میں اجتماعی مقاصد کی طرف لے چلے۔ اور اس کی ہر قسم کی باہمی نزاعوں کا فیصلہ کرتا رہے۔ نہ حدیث رسول ہے نہ علما اولوالامر ہیں۔“ (مولانا محمد اسلم جیراچپوری: تاریخ امت: حصہ ہشتم: اسلام اور قرآن: صفحہ ۱۲-۱۳: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی 1995)۔

چنانچہ مولانا مودودی نے 'جمہورِ علما' کے فہم قرآن و حدیث کو اختیار کر کے اقامتِ دین کی ابتدائی اقامت (Primary Construction)، ثانوی اقامت (Secondary Construction)، ثالثی اقامت (Tertiary Construction) اور آخری اقامت (Final Construction) کو قرآن و سنت کی حقیقی روشنی میں تطبیق کرنے کی بجائے 'جمہوری' روشنی میں تطبیق کر کے کچھ سے کچھ کر دیا۔ اس امر کو ایک اور زاویہ نظر سے بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ کاش مولانا مودودی نے تعمیر اور تشکیلی مراحل کو

Regular کی بجائے Secular طور پر لیا ہوتا تو اس صورت حال میں عین، عین الصواب اور عین الیقین سے Deviation نہایت معمولی (Infinitesimal, Minimal or Negligible) ہوتا جو ہر حال میں Bridgeable یا قابل اصلاح تھا۔ تعمیری مراحل کو Secular طور پر لینے سے مراد ہے امت کے اندر Potential اور Actual استعداد پیدا کرنے کے زاویے کا لحاظ کرنا۔ چونکہ استعداد برسر زمین حقیقی امور سے تعلق رکھتی ہے لہذا اس حوالے سے Regular مواد (Facts & Data) اور فہم (Understanding & Insight) دھندھلے، منعطف اور محجوب ہیں جب کہ Secular مواد اور فہم تازہ بہ تازہ، نو بہ نو، Updated اور آزمودہ ہیں لہذا Secular ہونے کے باوجود وہ صد فی صد مجرب ہوتے۔ ان تمام تفصیلات پر غور کرنے سے یہی بات سامنے آتی ہے کہ مولانا محمد الیاس اور مولانا مودودی کی تحریکوں کے ناکام بلکہ Counter productive ہو جانے کا اصل سبب عنصری فرق کے باوجود ان کا 'علما نہاد' (Ulama-Typed) ہونا تھا۔

۱۹۔ یہ دیکھ کر از حد حیرت ہوتی ہے کہ کم و بیش ایسا ہی تسامح سر سید جیسی عبقری ہستی سے بھی ہوا۔ جب اینگلو محمدن اور پنٹل کالج میں 'وحدانی ارتقائی اسلامی نظام تعلیم' وضع کرنے کی ان کی عملی کوششیں 'علما' کی مخالفت کا باعث بنیں یا انہیں ایسا لگا تو اپنے اصل خاکے سے پیچھے ہٹتے ہوئے محض 'مصالحت' کو پیش نظر رکھ کر انھوں نے مولانا محمد اکبر کاندھلوی کو علی گڑھ میں شعبہ دینیات کا ذمہ دار اور پھر چند دنوں بعد باضابطہ مولانا عبداللہ (داماد مولانا قاسم نانوتوی) کو ناظم دینیات بنا دیا۔ ممکن ہے بات صرف مصالحت کی نہ ہو۔ اس لئے کہ کچھ اور بھی باتوں اور پہلوؤں کے 'سراغ' ملتے ہیں۔ ممکن ہے سر سید کو اس کے لئے مجبور کیا گیا ہو۔ یا ممکن ہے سر سید نے دفع ضرر کے لئے ایسا کیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سر سید نے اھون البلیتین کا راستہ اختیار کیا ہو۔ لیکن ایسا فیصلہ بہر حال ان کے لئے از حد مہلک ثابت ہوا۔

۲۰۔ حقیقی اسلام کے احیا اور وحدانی ارتقائی اسلامی نظام تعلیم کی تشکیل میں مدارس کے فارغ 'علما' کی شمولیت اور شراکت غیر ضروری (Unnecessary) ہی نہیں بلکہ مہلک (Fatal) بھی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر کے مطابق 'اجنبی بنا دیئے جانے والے یا ہو جانے والے اسلام' کے پلٹ آنے کا وقت قریب آچکا ہے۔ اب ربیائی اسلام کے اس پشتارہ علم کا جو قرآن و سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علی الرغم در اصل ربیائی یہودیت (اور ربیائی نصرانیت Rabbinic Christianity) کی تشکیل جدید تھا۔ کیا کام؟ یوں بھی عصر حاضر میں ارادۃ الہی کے ظہور اجلال نے اسلامی فقہ کے نام سے معروف 'ربیائی یہودی

فقہ کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے۔ Semen Banks، Bio-Sciences، Bio-technology ، Stem Cell Culture ، Surrogate Motherhood ، Artificial Insemination وغیرہ نے اس 'ریبائی' یہودیت نہاد اسلامی فقہ کے پر نچے اڑا کر رکھ دیئے ہیں۔ اب یہ 'فقہ' اور 'اصول' فقہ امت مسلمہ کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک قدم ساتھ نہیں دے سکتے۔ 'حقیقی اسلام کے احیا' اور 'وحدانی ارتقائی اسلامی نظامِ تعلیم' میں انھیں ساتھ رکھنا غیر ضروری (Unnecessary) ہی نہیں بلکہ مہلک (Fatal) بھی ہے۔ 'ریبائی' یہودیت نہاد فقہ لائسنس اور فضول (Redundant) ہو چکی ہے۔ عاجز کو حیرت ہے کہ بعض لوگ اب بھی اس کھنڈر کو الشاطبی (متوفی 790 A.D.) کی الموافقات کی اڑواڑ لگا کر اور محمد عبدہ اور محمد رشید رضا کی تیار کردہ بلیوں اور کچھپیوں سے سہارا دے کر کھڑا رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ الشاطبی کی اڑواڑ لگانے والوں کو پہلے الشاطبی کا حال تو دریافت کر لینا چاہیے۔ وہ کون تھے؟ کیا چاہتے تھے؟ آٹھویں صدی عیسوی میں یعنی پہلی صدی ہجری کے فوراً بعد انھیں اس کی ضرورت کیوں پیش آگئی تھی کہ وہ مقاصد الشارح، مقاصد الشریعة اور مقاصد الشریعة پر بحث فرمائیں؟

ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ ابو اسحاق الشاطبی: الموافقات: دار المعرفة: بیروت

۲۔ احمد الرئیسونی: نظریة المقاصد عند الإمام الشاطبی: المعهد العالمی

للفکر الإسلامی: المؤسسة الجامعیة: 1992

۳۔ عبد الرحمن الکیلانی: قواعد المقاصد عند الإمام الشاطبی: المعهد

العالمی للفکر الإسلامی ودار الفکر: 2000

۴۔ محمد الطاهر بن العاشور: مقاصد الشریعة الاسلامیة، تونس: 1366ھ

۵۔ جمال الدین عطیہ: نحو تفعيل مقاصد الشریعة: المعهد العالمی للفکر

الإسلامی: 2008

۶۔ محمد نجات اللہ صدیقی: مقاصد شریعت: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، نئی دہلی: 2009

۲۱۔ مسلم معاشرے میں پہلی صدی ہجری کے نصفِ آخر میں ہی راج اور راسخ کردہ 'ریبائی' یہودیت

نہاد فقہ کی حقیقت سے ہر زمانے میں صالحین اور حقیقی اہل علم واقف رہے ہیں۔ دوسروں کا ذکر چھوڑ دیجئے

پہلی صدی ہجری کے ختم ہوتے ہوتے ہی خود 'حکمرانوں' اور 'علماء' نے قولاً اور عملاً اس کے 'اصل' چہرے سے

پردہ اٹھا دیا تھا۔ حکمرانوں اور علما کے ذریعہ قائم 'انتظامی مہویت' اس کا کھلا ثبوت تھی۔ مروج قانون کا وہ 'عمودی حصہ' جس کے مصدر و مصدر 'حکمران' تھے اس کا نام 'تعزیر' (آئین) رکھا گیا جب کہ دوسرا 'عمودی حصہ' جس کے مصدر و مصدر 'علما' تھے اس کا نام 'شرع' رکھا گیا۔ 'تعزیر' حکمرانوں کے مفاد کا عکاس تھی اور 'شرع' ربیائی فقہ کی۔ آٹھویں صدی عیسوی کے نصف اول میں 'ماشاء اللہ نظام اسلامی' (?) تھا۔ تفسیر، حدیث اور فقہ پر بہار (?) آئی ہوئی تھی۔ چنانچہ آسمان نے انھیں دنوں روئے زمین پر دو ناقابل فراموش مناظر دیکھے۔ عقل حیران ہے کہ اسلام کے اس 'دور زریں' میں اللہ اور رسول کے کس حکم کی ایسی تعمیل ہو سکتی ہے؟ آسمان نے دیکھا کہ اسی نام نہاد اسلامی 'تعزیر' کے تحت جعد بن درہم کو خالد بن عبد اللہ قسری والی عراق نے عید الاضحیٰ کے دن بطور قربانی ذبح کر دیا اور چند ہی دنوں کے بعد ولید بن یزید خلیفہ المسلمین نے خالد بن عبد اللہ قسری سابق والی عراق کو اس کے جانشین والی عراق یوسف بن عمر ثقفی کے حوالے کر دیا جس نے خالد کو شکنجے میں کس کر اس کے سینے کو ریتی سے ریت ڈالا۔ ظاہر ہے اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ ان میں سے کوئی بھی قانون — تعزیر ہو یا شرع — آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کی نمائندگی نہیں کرتا تھا۔ ان باتوں سے ہر زمانے میں صالحین اور حقیقی اہل علم واقف تھے۔

لیکن جہاں تک عصر حاضر میں اس کی 'قلعی' کے کھل جانے کی بات ہے تو اس سے کون باخبر آج واقف نہیں؟ آج بائیو کیمسٹری (Bio-Chemistry)، بائیو ٹیکنالوجی (Bio-Technology)، بائیو جینیٹکس (Bio-Genesis)، بائیو ڈائنامکس (Bio-Dynamics)، بائیو انجینئرنگ (Bio-Engineering)، بائیو اتھکس (Bio-Ethics)، بائیو لوجی (Biology)، بائیو میڈیسن (Bio-Medicine)، بائیو فیزکس (Bio-Physics) اور بائیو سٹیتھیسس (Bio-Synthesis) سے واقف افراد خوب جانتے ہیں کہ آج روئے ارض میں انسانی ماخوذات (Intakes) خواہ وہ بصورت غذا ہوں یا مشروبات یا ادویہ یا بصورت دیگر ماخوذات مثلاً Fixtures جیسے Artificial Devices یا Chips وغیرہ اب اس نام نہاد فقہ کے مطابق 50 فیصد سے 90 فیصد حرام لعینہ سے مستفاد ہیں اس اعتبار سے دنیا کے مختلف خطوں اور احوال کے مسلمانوں کے ماخوذات (Intakes) میں حرام لعینہ کا تناسب درج ذیل ہے:

۱۔ 99 فیصد حرام لعینہ : خلا نوردوں کے ماخوذات

۲۔ 80-90 فیصد حرام لعینہ : مشرق وسطیٰ میں رہنے والوں کی اکثریت کے ماخوذات

۳۔ 60-80 فیصد حرام لعینہ : یورپ، شمالی امریکہ، جاپان اور آسٹریلیا جیسے صنعتی مغربی

ملکوں میں رہنے والوں کی اکثریت کے ماخوذات

۴۔ 50-60 فیصد حرام لعینہ : دنیا کی دیگر بیشتر مکمل شہری آبادیوں (Highly

Urbanized Population) کے ماخوذات

۵۔ 50 فیصد حرام لعینہ : دنیا کی بقیہ تمام آبادی کی اکثریت کے ماخوذات

تجویز: دوم

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں اصلاح حال براہ انتظامی تدابیر

۱۔ اگر بوجہ پہلی تجویز یعنی ”سرسید تحریک کا جامع اور مکمل احیا“ سردست ممکن نہ ہو یا اس حوالے سے موثر تدابیر کرنے کی گنجائش فی الفور ممکن نہ ہو تو تجویز دوم پر عمل درآمد کیا جائے۔ تجویز دوم ”مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں اصلاح حال براہ انتظامی تدابیر“ سے موسوم کی جاسکتی ہے۔ تجویز دوم کی مخصوص غایت اور ہدف درج ذیل ہیں:

۱۔ اس تجویز کی روح ’سرسید تحریک کے جامع اور مکمل احیا‘ کے لئے مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کو زندہ، متحرک اور موثر رکھنا ہے۔ اس روح اور مقصد کو پیش نظر رکھ کر یونیورسٹی میں موجود اور کچلی ہوئی صلاحیتوں کو زندہ کرنا، زندہ رکھنا اور متحرک کرنا ہے۔ لہذا ’سرسید تحریک کے جامع اور مکمل احیا‘ کے کام کو فی الحال ناممکن العمل یا دشوار ہونے کے سبب کم از کم دس سالوں کے لئے موخر کر کے ساری قوت اس نقطے پر مرکوز کرنی ہے تاکہ یونیورسٹی کی حیویت (Vitality) باقی رہے۔ چونکہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں حالات اس قدر ناگفتہ بہ ہو چکے ہیں کہ ’سرسید تحریک کا جامع اور مکمل احیا‘ خواہ کتنا ہی پاکیزہ اور ارفع نصب العین کیوں نہ ہو اگر میدان کار، تجربہ گاہ اور جسد اولین یعنی یونیورسٹی ہی قوتاً (Potentially) اور حقیقتاً (Actually) باقی نہ رہی تو پھر کیا حاصل؟ ’مسلم قیادت‘ کی گزشتہ سو سالوں کی کارکردگی کو دیکھتے ہوئے اس کام کے لئے حکومت اور اس کے اعضاء اور اداروں کی مدد اب ناگزیر نظر آتی ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت بالکل ویسی ہی ہے جسے Between the Devil and the Deep Blue Sea کہتے ہیں۔

ایک جانب 'مسلم قیادت' ہے اور دوسری جانب 'نامساعد حالات'۔ عاجز کے نزدیک 'نامساعد حالات' سے گزرنا 'مسلم قیادت' پر تکیہ کرنے سے بدرجہا بہتر ہے۔ اس کے درج ذیل اسباب ہیں:

۱۔ 'نامساعد حالات' کو ثابت نہیں۔ وہ 'متبدل ظاہرہ' ہوتے ہیں۔

۲۔ موجودہ صورتحال میں بدترین سرکار بھی 'مسلم قیادت' سے بہتر ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کے کئی

اسباب ہیں:

۱۔ سرکاری حقائق (Facts)، احصائیات (Data & Statistics)، رکارڈ (Records)، جائزے (Assessments)، ترمیمات (Amendments)، نتائج (Results)، نظر ثانی (Revision) اور منصوبہ بندی (Planning) کے تحت کام کرتی ہیں۔ سرکاری برسر زمین حقائق پر قائم ہوتی ہیں، قائم رہتی ہیں اور برسر زمین حقائق کے ناموافق ہونے پر ختم بھی ہو جاتی ہیں۔ سرکاری برسر زمین حقائق سے اغماض تو برت سکتی ہیں لیکن بے خبر نہیں رہ سکتیں اور نہ ہی Unresponsive ہو سکتی ہیں۔

۳۔ 'مسلم قیادت' اصلاً 'عالمانہ' ہے۔ ایسی قیادت میں حقائق، احصائیات، ریکارڈ، جائزے، ترمیمات، نتائج، نظر ثانی اور منصوبہ بندی نام کی کوئی شے پائی ہی نہیں جاتی۔ یہ قیادت برسر زمین حقائق پر قائم ہوتی ہے نہ قائم رہتی ہے اور نہ برسر زمین حقائق کے ناموافق ہونے پر ختم ہو جاتی ہے۔ برسر زمین حقائق سے بے خبری اس کی صفتِ اولین ہے۔

۲۔ ہندوستانی مسلمانوں پر 1858 کے بعد تین فیصلہ کن مرحلے آئے۔ یہ تینوں فیصلہ کن مرحلے ہندوستانی مسلم 'عالمانہ قیادت' کی بد تدبیروں کے سبب ہلاکت خیز ہو گئے لیکن 'مسلم قیادت' جوں کی توں برقرار رہی۔ ان تینوں مرحلوں کے 'عمود' سے اہل علم بخوبی واقف ہیں۔ ان میں سے ہر ایک مرحلے میں 'مسلم قیادت' نے کس باخبری اور حساسیت کا ثبوت دیا تھا اس کا اندازہ اس عہد کی ان کی نگارشات اور تحریکات سے کیا جاسکتا ہے:

۱۔ مرحلہ اول: 1860-1880

۲۔ مرحلہ دوم: 1890-1919

۳۔ مرحلہ سوم: 1930-1940

ان تینوں مرحلوں میں مسلمانوں کی 'عالمانہ قیادت' نے اسلام اور مسلمانوں کی ہلاکت کے سامان

فراہم کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

۳۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس تجویز کے تحت یونیورسٹی میں اصلاح حال کا سارا عمل انتظامی تدابیر (Executive Measures) سے ہی کیا جانا ہے جسے حکومت ہی ممکن اور قابل عمل بنا سکتی ہے۔ اگر ہم درخواست کریں اور حکومت اس حوالے سے ہمارا تعاون کرے تو مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی اقلیتی دستوری حیثیت میں مداخلت کئے بغیر محض عبوری انتظامی تدابیر (Provisional Executive Measures) کے ذریعہ اصلاح ممکن ہے جس سے کم از کم اس کی حیویت (Vitality) یقینی ضرور ہو جائے گی۔

۴۔ چنانچہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی حیویت (Vitality) کو مستحکم (Stabilize) کرنے کے لئے درج ذیل انتظامی تدابیر زیر غور آ سکتی ہیں:

۱۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے بلا تفریق، بلا استثناء اور علی الاطلاق تمام مدارس کا ہر سطح پر انقطاع۔
 ۲۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں موجود اساتذہ کی علمی، حقیقی اور خلاقانہ صلاحیت اور استعداد کا غیر جانبدارانہ اور شفاف امتحان مکرر (Re-examination) جس کے بعد ناکام ہو جانے والے اساتذہ کی انتظامی تدابیر کے ذریعہ اصلاح حال، تعزیر یا پھر مفسد عناصر (Rogue Elements) سے یونیورسٹی کی تطہیر (Purging)۔

۳۔ کم از کم 30 سالوں کے لئے مخصوص اور خلاقانہ استعداد و صلاحیت موجد (Innovative Ability & Capability Oriented) سدلیاقت (Efficiency Bar-E.B.) کا نفاذ۔

۴۔ معیار مطلوب استعداد اور صلاحیتوں کے فقدان کی بنیاد پر — جن کے جانچنے کا پیمانہ اساتذہ کی گزشتہ دس سے بیس یا تیس سالوں کی کارکردگی ہو — ان کی موجودہ اور آئندہ حیثیت کا تعین۔ از سر نو حیثیت کے اس تعین کے تحت متعدد تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں مثلاً:

۱۔ E.B. کے تحت ترقی کا انجماد۔

۲۔ بونس (Bonus)، الاونسز (Allownces) اور پرفکس (Perks) میں انجماد۔

۳۔ اساتذہ کی باضابطہ تنزیلی (Demotion) مثلاً ان کی پوسٹ گریجویٹ سے کالجوں یا سکینڈری اسکولوں حتیٰ کہ مڈل اور پرائمری اسکولوں میں منتقلی۔ ابتدائی مرحلے میں اسے باضابطہ مہم (Drive) کی صورت میں کم از کم دو سالوں تک رو بہ عمل لایا جائے۔

۴۔ یونیورسٹی میں لیکچرر کے ریڈر اور ریڈر کے پروفیسر ہونے کے لئے استعداد (Ability) اور

خلاقت (Innovation) کو بنیاد بنایا جائے۔

۵۔ استعداد (Ability) اور خلاقت (Innovation) کے دو پیمانے مقرر کر کے ایک تعبیری

(Virtual) دو ایوانی نظم (Bi-Cameral Setup) قائم کیا جائے جس کے دو ایوان ہوں:

۱۔ تدریسی اساتذہ جن کی استعداد اور خلاقت کے جداگانہ معیار مقرر ہوں۔

۲۔ تحقیقی اساتذہ جن کی استعداد اور خلاقت کے تدریسی اساتذہ سے جداگانہ معیار مقرر ہوں۔

۵۔ اگر صورت حال ناقابل کنٹرول اور ناقابل اصلاح نظر آئے تو مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی اصل

دستوری حیثیت سے تعرض کئے بغیر انتظامی تدابیر (Executive Measures) اور حکم نامے کے

ذریعہ یونیورسٹی کے بالخصوص مسلمان اساتذہ کے اقلیتی حقوق زیادہ سے زیادہ 30 سالوں کے لئے منجمد کر

دیئے جائیں۔

’اقلیتی حقوق کے انجماد کو درج ذیل صورتوں سے رو بہ عمل لایا جاسکتا ہے:

۱۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں عبوری انتظامی تدابیر کے ذریعہ باضابطہ حکم نامے سے جس کا مسلم

یونیورسٹی، علی گڑھ کے دستور سے تعارض اور تصادم نہ ہو اس تدبیر کا صرف ایک مرحلہ نفاذ کیا جائے کہ اگلے

30 سالوں تک کسی شعبے میں کوئی مسلمان پروفیسر مقرر نہیں کیا جاسکتا، الا یہ کہ اس کی استعداد اور خلاقت غیر

معمولی ہو۔ اس مدت میں مرکزی یونیورسٹیوں سے کسی غیر مسلم استاذ کی جو پروفیسر ہو وہاں منتقلی اور تقرری

کی جائے۔

۲۔ اسی طرح مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں کم از کم بیس سالوں تک اس حکم کا نفاذ کیا جائے کہ پوسٹ

گریجویٹیشن، ایم فل، پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کے Examiners اور Viva کے ممتحن کسی مرکزی یونیورسٹی

کے پروفیسرز ہوں اور لازماً مسلمان نہ ہوں۔

۶۔ ظاہر ہے ایسی تدبیریں بادی النظر میں نازیبا، ناپسندیدہ اور تفریقی معلوم ہوتی ہیں لیکن اس کی

معقولیت (Rationality) اور مناسبت (Appropriateness) کے دو اسباب ہیں:

۱۔ مسلم معاشرے (Muslim Society)، مسلم قیادت (Muslim Leadership)، مسلم

اداروں (Muslim Institutions) اور مسلم کارکردگی (Muslim Performance) میں صالح

عناصر کی بے بسی اور غیر صالح عناصر (Rogue Elements) کے تغلب کا ناقابل تبدیل ہو جانا۔

۲۔ صدیوں سے چلی آرہی مخصوص معاشرتی صورتحال کے سبب مسلم نفسیات (Psyche)، طبع

(Typicality) اور عادت (Habits) میں ناکار کردگی کا استحکام۔

اگر صرف گزشتہ ساٹھ سالوں کا دقیق جائزہ لیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ مذکورہ دو اسباب سے مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ نیچے سے اوپر تک ٹیچر سے کورٹ تک درجہ بدرجہ اور بالا کثر صرف اس عنوان کے تحت کہ وہ اقلیتی فرقے سے تعلق رکھتے ہیں بے استعداد لوگوں کا مامن (Safe Haven) اور غیر صالح عناصر کے اڈہ (Den) بن کر رہ گئی ہے۔

عاجز کو پوری امید ہے کہ ان انتظامی تدابیر (Executive Measures) سے مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی حیویت (Vitality) یقینی طور پر بحال اور مستحکم ہو جائے گی۔
۷۔ یہاں چند امور کی وضاحت بر محل اور ضروری معلوم ہوتی ہے۔

۱۔ سد سبیل (Restrictions)، تطہیر (Purging) اور سد لیاقت (Efficiency Bar) جیسی مجوزہ تدبیریں تفریقی (Discriminatory) ہیں نہ فرقہ وارانہ (Communal) اور نہ ہی معاندانہ (Hostile)۔ یہ بات پوری طرح واضح رہنی چاہیے کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے اور ایسا قطعاً ہونا بھی نہیں چاہیے۔ تجویز کی ان صورتوں کی روح اور غایت ریاست (State)، حکومت (Government) اور عمال (Administration) اور خود مسلمانوں پر واضح ہونی چاہیے کہ یہ ساری مجوزہ انتظامی تدابیر کلیتہً طبی (Clinical)، جراحانہ (Surgical) اور سب سے اہم یہ کہ عبوری (Provisional) ہیں۔

۲۔ ان تدابیر کی تجویز کے پیچھے عمیق مطالعے، مشاہدے اور تجربے کو دخل ہے۔ چنانچہ گزشتہ تین سو سالوں کے دوران بر صغیر اور بر صغیر سے ماوراء مقامی سے عالمی سطح تک مسلمانوں کی کارکردگی (Performance) — سعت (Extent) کی ہر تین سطحوں — یعنی Micro، Meta اور Macro کے ساتھ ساتھ مواد (Content) کی ہر تین سطحوں — یعنی تفکیری (Ideological)، تدبیری (Strategic & Tactical) اور تعمیلی (Executive) پر درج ذیل دو صورتوں میں ظاہر ہوئی ہے:

۱۔ غیر معمولی اور اعلیٰ ترین کارکردگی — اور

۲۔ ناگفتہ بہ اور بدترین کارکردگی۔

۸۔ مذکورہ دونوں قسموں کی کارکردگیوں کے سینکڑوں واقعات کا دقیق تجزیہ یہ بتاتا ہے کہ ان

دونوں صورت حال میں چند استثنا کے سوا دو باتیں نمایاں رہی ہیں:

۱۔ جب بھی مسلمانوں نے غیر مسلموں کے ماتحت کاموں کو انجام دیا جن میں کاموں کے کروانے کے محرکات، کروانے والوں کے حق میں جاتی تھیں تو مسلمانوں کی اوسط کارکردگی کیفیت (Quality) اور کیت (Quantity) ہر دو اعتبار سے غیر معمولی اور اعلیٰ درجے کی رہی۔

۲۔ اس کے برخلاف جب بھی مسلمانوں نے Exclusively اور Insular ہو کر ان کاموں کو انجام دیا ہے جن کے محرکات خود اسلام اور مسلمانوں کے لئے مفید تھے تو مسلمانوں کی کارکردگی کیفیت (Quality) اور کیت (Quantity) ہر دو اعتبار سے ناگفتہ بہ اور بدترین رہی۔

۹۔ ان دونوں احوال اور نتائج کا دقیق مطالعہ، مشاہدہ اور تجزیہ اس نتیجے تک پہنچاتا ہے کہ مسلمانوں کی نفسیات (Psyche)، طبع (Typicality) اور عادت (Habits) میں وہ بدترین ذہنیت پیدا ہو کر راسخ ہو چکی ہے جسے 'بندگی' یا 'عبودیت' کہا جاتا ہے۔ روئے ارض پر انسانی معاشرت میں اور بالخصوص اجتماعیت کی سطح پر پیدا ہونے والی یہ بدترین اور کرہ ترین بیماری ہے۔ یہ وہی ذہنیت ہے جو بنی اسرائیل میں مصر میں ظہور پذیر ہو گئی تھی جس کا ذکر سورہ الشعراء (26:22) میں کیا گیا ہے۔ یہ وہ بدترین اجتماعی ذہنی بیماری ہے جو کسی قوم کے ذہن اور جسم کو سزا کر رکھ دیتی ہے۔ ایسی بیماری بڑی سے بڑی قربانیوں اور عظیم الشان تفکیر اور تدبیری کوششوں کے بعد بھی صدیوں سے پہلے ختم نہیں ہوتی یا شاید کبھی ختم نہیں ہوتی۔ چنانچہ بنی اسرائیل کی اسی بدترین ذہنی بیماری نے حضرت موسیٰ کی ساری خیر خواہیوں، قربانیوں، عزیمتوں اور کوششوں کے باوجود انھیں ناکامی سے دوچار کر کے چھوڑا۔ نوبت یہاں جا سید کہ بالآخر بنی اسرائیل کی اسی ذہنیت نے حضرت موسیٰ اور ان کے دست راست حضرت ہارون کو خود بنی اسرائیل کے ہاتھوں شہید کروا کر چھوڑا۔ یہ جداگانہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کی حفاظت فرمائی۔

”بندگی“ یا ”عبودیت“ کی یہ ذہنیت عجب اور جاں سوز نتائج برآمد کرتی ہے۔ اس بیماری میں بتلا قوم دوسروں کے حتیٰ کہ اپنے معاند حکمرانوں کے ماتحت ان حکمرانوں کے سراسر مفادات کی تکمیل بھی اتنی جانفشانی، دیانت داری، مہارت اور حسن کارکردگی کے ساتھ کرتی ہے جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اکثر ایسی حالت میں ان کی کارکردگی اور ان کی بارآوری (Productivity) کیفیت (Quality) اور کیت (Quantity) ہر دو اعتبار سے غیر معمولی ہو جاتی ہے۔

اس کے برخلاف یہی قوم نسبتاً زیادہ موافق حالات اور کئی گنا زیادہ وسائل مہیا ہونے کے باوجود

جب Exclusive اور Insular ہو کر خود اپنے مفادات کے لئے کام کرتی ہے تو اس میں ایسا فساد ڈالتی اور ایسی سستی، بددیانتی، بدسلوکی اور ناکارکردگی کا مظاہرہ کرتی ہے جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اکثر ایسی حالت میں اس کی کارکردگی اور اس کی بارآوری (Productivity) کیفیت (Quality) اور کمیت (Quantity) ہر دو اعتبار سے ناگفتہ بہ اور بدترین ہو جاتی ہیں۔

۱۰۔ جس طرح یہودی قوم کے نشوونما میں 'علمائے یہود' نے زور لگایا چنانچہ اس قوم کے ذہن اور فکر پر انہیں علمائے یہود کا غلبہ ہے ٹھیک اسی طرح مسلم قوم کے نشوونما میں 'مسلم علمائے' نے زور صرف کیا اور اس قوم کی نفسیات صد فیصد 'علمائے' کے ذہن و فکر کا Alter Ego بن گئی۔ قرآن اور اقوال رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر مسلمانوں کے بیشتر علمی کام اور ان کا بیشتر ذخیرہ 'علمائے' کی طبع کے عکاس ہیں۔ یہ ذخیرہ علم کیا ہے؟ اور یہ علمی کام کیسا ہے؟

لفاظیاں، مبالغہ آرائیاں، بے اعمدالیاں اور افسانہ طرازیوں! ان میں ہر ایک حقیقت کی دشمن۔ ایسا آخر کیوں کر ہوا؟ اس کا ایک ہی جواب ہے۔ کبھی تحقیق نہیں کی گئی۔ سوال پیدا ہوتا ہے: آخر کیوں؟ اس لئے کہ 661 عیسوی کے بعد امت مسلمہ کے لئے تحقیق کرنا حرام اور جرم قرار دے دیا گیا۔ آخر کیوں؟ اس لئے کہ 'علمائے' اور تحقیق ایک دوسرے کی ضد تھے۔ تحقیق ہوتی تو 'علمائے' فنا ہو جاتے۔ 'علمائے' کی بقا کے لئے تحقیق کا فنا کر دیا جانا ناگزیر قرار پایا۔

عصر حاضر میں 'علمائے' اسلام کی نفسیات کیا ہے اور اس کی جامع اور اکمل شکل کہاں دیکھی جاسکتی ہے؟ عصر حاضر میں 'علمائے' کی نفسیات آٹھ عناصر پر مشتمل ہے۔ یہ آٹھ عناصر ہیں:

Sentimentalism_۱

Epicureanism_۲

Romanticism_۳

Nostalgia_۴

Megalomania_۵

Insularity_۶

Exclusiveness_۷—اور

Inferiority Complex_۸

یہ آٹھ عناصر 'علما' کی نفسیات کے اجتماعی عناصر ہیں لہذا کسی ایک ذات میں ان کا تمام وکمال جمع ہونا یا پایا جانا نہایت دشوار ہے۔ تاہم گزشتہ دو سو سالوں میں دو ہستیاں ایسی ضرور نظر آتی ہیں جن کی ذات میں یہ تمام عناصر تمام وکمال جلوہ گر نظر آتے ہیں جن کا ادراک کرنا تو آسان ہے لیکن جملہ عناصر کی جامعیت کا احاطہ کرنا از حد دشوار ہے۔ ان دو ہستیوں میں پہلی جامع اور کامل ہستی شیخ محمد عبدہ کی ہے اور دوسری جامع اور کامل ہستی مولانا شبلی نعمانی کی۔ شیخ محمد عبدہ اور مولانا شبلی کی جملہ تصنیفات (کتابیں، مضامین، خطبات اور مکتوبات) اس کی شاہکار ہیں۔ 'علما' کی یہ طبع امت میں از حد مقبول ہے۔

۱۱۔ چنانچہ ہندوستان کے طول و عرض میں اور ہندوستان سے باہر بالخصوص مغربی ملکوں میں اگر زندگی کے جملہ میدانوں میں مثلاً — تعلیم، تدریس، تحقیق، تصنیف، حکمرانی، سفارت کاری، تالیف و ترتیب، ترجمہ، ترجمانی، صحافت، اداکاری، ادب، سائنس، ٹکنالوجی، لسانیات، عمرانیات، اسپورٹس، آتھلیٹکس وغیرہ اور ان کی ہر چار سطحوں یعنی بین الاقوامی (International)، سرکاری (Governmental)، نیم سرکاری (Semi-Governmental) اور غیر سرکاری (Non-Governmental) اور ان کی ہر تین انواع — یعنی تفکیری (Ideological)، تدبیری (Strategic) اور تعمیلی (Executive) میں مسلمانوں کی موجودہ کارکردگی کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اول الذکر صورت میں یعنی غیر مسلموں کے ماتحت ان کے مفادات کی تکمیل میں ان کی کارکردگی غیر معمولی اعتبار سے اعلیٰ ترین حتیٰ کہ مثالی ہو جاتی ہے۔

۱۲۔ حیرت اس وقت ہوتی ہے جب ٹھیک اسی وقت بلکہ کبھی کبھی تو ایسا دیکھا گیا ہے کہ وہی لوگ جنہوں نے غیروں کے ماتحت مثالی کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے — اس کے برخلاف ہندوستان ہو یا ہندوستان سے باہر بالخصوص مغربی ملکوں میں زندگی کے ان میدانوں میں جن میں اسلام یا مسلمانوں کے مفادات وابستہ ہیں ان کی کارکردگی ہر تین سطحوں اور ہر تین انواع میں ناگفتہ بہ اور بدترین ہو جاتی ہے۔ دونوں صورتوں میں محض یہ فرق ہوتا ہے کہ ناگفتہ بہ اور بدترین کارکردگی کا مظاہرہ صرف اور صرف وہاں ہوتا ہے جہاں مسلمان Exclusive اور Insular ہو کر کام کرتا ہے۔

یوں تو اس حوالے سے انفرادی، ادارہ جاتی اور سرکاری ہر تین سطحوں پر بیسیوں مثالیں دی جاسکتی ہیں لیکن عاجز صرف چار مثالوں پر اکتفا کرے گا:

۱۔ فورٹ ولیم کالج (1700) اور ایشیاٹک سوسائٹی (1784) میں شامل مسلمان اہل علم کی کارکردگی۔

۲۔ انگریزوں کے ماتحت دلی کالج اور نکولا مسابکی کے ماتحت مطبعہ بولاق مصر (1821) میں شامل مسلمان اہل علم کی کارکردگی۔

۳۔ دائرۃ المعارف عثمانیہ، حیدرآباد میں مسلمان اہل علم کی کارکردگی۔

۴۔ دائرۃ المعارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور میں شامل مسلمان اہل علم کی کارکردگی۔

ان میں اول الذکر دوزمرے اپنے حسن کارکردگی کے لئے اور آخر الذکر دو اپنی بدترین کارکردگی کے لئے قابل ذکر ہیں۔ ان میں اول الذکر دوزمرے زندگی کے ہر میدان میں انقلاب لانے کے لئے اور موخر الذکر دو برپا انقلاب کو موت کی نیند سلا دینے کے لئے یاد رہیں گے۔ جہاں تک دائرۃ المعارف عثمانیہ، حیدرآباد کی بات ہے تو اس کے بارے میں ایک مشہور رائے یہ پائی اور پھیلائی جاتی رہی ہے کہ اس کا خاتمہ سلطنت آصفیہ کے خاتمے کے ساتھ ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ دائرۃ المعارف عثمانیہ کا خاتمہ اس آشوب میں ہوا جب سلطنت آصفیہ کا ریاست ہند میں 1948 میں الحاق ہوا۔ یہ بات درست ہے لیکن صرف اس حد تک کہ دائرۃ المعارف عثمانیہ اپنے جسد کے اعتبار سے 1948 میں 'مردہ' قرار پایا۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ دائرۃ المعارف عثمانیہ کے قیام، کارکردگی اور تاریخ کا دقیق مطالعہ کرنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ اس کی حقیقی اور روحانی موت تو اسی وقت واقع ہو چکی تھی جب علامہ شبلی، مولانا فراہی اور دیگر علما اور اہل علم اس کا بالواسطہ یا بلاواسطہ حصہ ہو گئے۔ یہ موت فی الحقیقت دائرۃ المعارف عثمانیہ کے عرصہ حمل (Prenatal Period) میں ہی واقع ہو چکی تھی۔ دائرۃ المعارف ایک 'مردہ جسد' (Still Born) تھا۔ جہاں تک اس 'جسد' کی بات ہے تو وہ اب بھی حیدرآباد میں بعض کی نظر میں زندہ اور بعض کے مطابق نعش گاہ میں پڑا ہے۔ یہ ادارہ قطعاً وہ نہیں جس کا خاکہ سر سالار جنگ اور سید حسین بلگرامی نے سوچا تھا۔ 'علما' کی شمولیت نے اس ادارے میں Exclusiveness اور Insularity پیدا کر کے اسے بے روح کر دیا۔ لیکن جس ناکارکردگی کا بطور خاص ذکر کیا جانا چاہیے وہ شعبہ دائرۃ المعارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور اور اس کا شہرہ آفاق کارنامہ اب تک طبع شدہ "دائرۃ المعارف الاسلامیہ" کی بیس سے زاید جلدیں ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ امت مسلمہ میں مسلمانوں کے ذریعہ بیسویں صدی میں انجام دیا جانے والا یہ سب سے بڑا علمی کارنامہ ہے۔ بہ نظر غائر دیکھا جائے تو بیسویں صدی میں مسلم اہل علم کے ذریعہ انجام دیا جانے والا یہ وہ بدترین کام ہے جس کے عواقب اور برے نتائج آئندہ سو سالوں تک اتنے بھیانک اور

ھولناک ہوں گے جن کا اندازہ کم ہی لوگوں کو ہوگا۔ اس 'عظیم الشان' کام کی کم از کم دو خرابیاں کسی مہلک سے کم نہیں۔ یہ دو خرابیاں درج ذیل ہیں:

۱۔ یہ مبسوط 'گمراہ کن' ہے اس لئے کہ یہ حد درجہ Exclusive اور Insular ہے۔

۲۔ اس کے حقائق (Facts)، مواد (Data) اور تعبیرات (Nuances) تحقیق، تقاضہ تحقیق،

ضرورت تحقیق اور عصمت تحقیق کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ اس سے استفادہ کرنے والے کے اندر رجحان تحقیق کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہ مبسوط 'طبع' کے لحاظ سے تحقیق مخالف (Anti-Research) ہے۔

اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اس کا مواد اول وہلہ میں 'سوال' کو ہلاک کر دیتا ہے۔ عاجز کو اندیشہ ہے کہ کم

از کم اردو۔ نہاد اہل علم کی آئندہ تین نسلیں اس کے زیر اثر علمی اور فکری اعتبار سے تباہ ہو کر رہ جائیں گی۔

اکیسویں صدی کی ابتدا میں نظام عالم میں واقع ہونے والے تداول قوت (Power Shift) اور اس کے

زیر اثر اذہان و علوم میں واقع ہونے والے Change of Scale نے اسے اور بھی بھیا تک بنا دیا

ہے۔ اگر اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ کا یہی تصنیفی کام مثلاً ہالینڈ، بلجیم یا جرمنی میں غیر مسلم ذمہ داروں کے

زیر نگرانی انجام پاتا بایں صورت کہ پنجاب یونیورسٹی کا سارا عملہ وہی کا وہی رہتا تو اس کی افادیت، کیفیت

اور عینیت (Factuality) ہر اعتبار سے کم از کم دس گنا بڑھ جاتی۔

تنقیح اور توضیح

۱۔ مذکورہ دونوں تجویزوں کے تعلق سے اب صرف ایک بات زیر بحث آنا رہ جاتی ہے۔ کسی بھی تجویز کی پیش کش میں یہ بات دیکھنی نہایت ضروری ہے جس کے لئے پوری دقت نظر، تفصیل اور متعدد جہتوں سے بھرپور جائزہ لیا جانا چاہئے کہ آیا وہ تجویز قابل عمل بھی ہے یا نہیں؟ یہی سوال مذکورہ دونوں تجویزوں کے تعلق سے بھی پیدا ہوتا ہے: ان تجویزوں کی قابلیت عمل (Feasibility) کیا ہے؟

۲۔ تجویز اول کی قابلیت عمل (Feasibility):

اس حوالے سے دو سوالات پیدا ہوتے ہیں:

۱۔ کیا تجویز اول یعنی 'سرسید تحریک کا جامع یا مکمل احیا' یا 'وحدانی ارتقائی اسلامی نظام تعلیم' کی تشکیل کی تجویز اور اس کا مذکورہ طریقہ کار (Methodology) قابل عمل (Feasible) ہے؟

۲۔ کیا یہ تجویز موجودہ صورتحال میں قابل عمل ہے؟

بہشتیت مجوز عاجز کو اس بات میں زرا بھی شبہ نہیں کہ:

'موجودہ صورت حال میں' (Ceteris Paribus) یہ تجویز موجودہ صورت میں ناممکن العمل (Unfeasible) ہے۔

اب باقی رہ جاتا ہے سوال اول — تو عاجز کی رائے ہے کہ بایں ہمہ یہ تجویز 'Mediate' اور 'Immediate' ہر دو صورتوں میں قابلیت عمل (Feasibility) رکھتی ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ درایں صورت اس تجویز پر کیوں کر عمل درآمد ہو؟ لیکن عاجز کے خیال

میں اس بات پر غور کرنے سے قبل یہ جاننا از حد ضروری ہے کہ 'موجودہ صورتحال میں' (Ceteris Paribus) اس کے ناقابل عمل ہونے کی اصل حقیقت ہے کیا؟

'موجودہ صورتحال میں' اس کے قابل عمل ہونے میں تین رکاوٹیں (Constraints) درپیش ہیں:

۱۔ افرادِ کار کی رکاوٹ (Work-Force Constraint)

۲۔ وسائل کی رکاوٹ (Resource Constraint)

۳۔ میقات کی رکاوٹ (Gestational Constraint)

ظاہر ہے یہ تینوں رکاوٹیں 'موجودہ صورتحال میں' اور فی الفور ناقابل ازالہ ہیں۔ اس صورتِ حال

میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر کیا کیا جائے؟ چنانچہ پھر دو ہی راہیں بچ رہتی ہیں:

۱۔ کچھ نہ کیا جائے!

۲۔ کچھ بھی کیا جائے!

اب اگر مسئلہ وجود (Existence) یا بقا (Survival) کا ہو تو پہلی راہ بادی النظر (Prima Facie)

میں قابل رد ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے صرف دوسری راہ بچ رہتی ہے۔ لیکن پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ دوسری

راہ کے اختیار کرنے کی معقولیت (Rationality) اور جواز (Justification) کیا ہو؟

چنانچہ مجوز کے نزدیک اس کی معقولیت (Rationality) اور اس کا جواز (Justification) یہ

ہے کہ ہم انہیں 'Mediate' یا 'Immediate' ہدف کے بطور یا کم از کم تجویز اول کے مقصدِ اصل کے

ہدف کی تکمیل کے لئے موافق فضا بندی کے حصول کے لئے بطور 'Tool' اختیار کر سکتے ہیں۔

امت مسلمہ جس سے انسانیت کی آئندہ امیدیں اور فلاح وابستہ ہیں جن احوال میں گرفتار ہے اور

اسے آئندہ جن چیلنجوں کا سامنا ہے اس میں انسانیت کی بھلائی کو یقینی بنانے کے لئے لازمی ہے کہ وہ اس

Exclusiveness اور Insularity سے نکلنے کے لئے 'قیادت' سے مکمل طور پر پیچھا چھڑائے۔ اس تجویز

کے اختیار کرنے سے دو اہداف میں سے دونوں یا کم از کم ایک ہدف تک رسائی لازماً ممکن ہو جائے گی:

۱۔ اس Exclusive اور Insular قیادت سے حقیقی انقطاع (Actual

Disengagement)

۲۔ اس Exclusive اور Insular قیادت سے ماحولی انقطاع (Atmospheric

Disengagement)

۳۔ تجویز دوم کی قابلیت عمل (Feasibility):

اس تجویز کے حوالے سے بھی سب سے بڑا سوال اس کی قابلیت عمل (Feasibility) ہے۔ عاجز کی رائے ہے کہ اس تجویز کا قابل عمل ہونا خواہ درجہ اول پر ممکن نہ ہو لیکن درجہ دوم اور درجہ سوم پر بلاشبہ ممکن ہے۔ اس تعلق سے صرف ایک بات قابل تشویش اور قابل غور ہے: عاجز کو اس بات میں قطعاً شبہ نہیں کہ اگر اس تجویز پر عمل درآمد کیا گیا تو امت پر اس کے نہایت تکلیف دہ ذیلی تاثیرات (Side-Effects) لازماً مرتب ہوں گے۔ چنانچہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسی حالت میں امت ایسی تجویز پر عمل کرے؟

جیسا کہ عاجز عرض کر چکا ہے کہ جب مسئلہ وجود (Existence) اور بقا (Survival) کا درپیش ہو تو ایسی کسی ذیلی تاثیر (Side-Effects) کو گوارا کرنے کے سوا کوئی راہ باقی نہیں رہتی۔ مسئلہ وجود و بقا سے اختیاری (Optional) رہنے ہی نہیں دیتا۔ لیکن جیسا کہ عاجز نے عرض کیا کہ مسلمانوں کے پاس ان کے Exclusive اور Insular قیادت سے پیچھا چھڑانے کی یہ واحد صورت باقی رہ گئی ہے لہذا ان کے لئے ان تمام ذیلی تاثیرات (Side-Effects) کو طوعاً جذب کر لینا اس سے بہتر ہوگا کہ جب یہ قیادت حسب روایت مصیبت میں قوم کو وقت کے رحم و کرم پر چھوڑ دے اور قوم اسے کرباً جذب کرے۔ لہذا عاجز کے نزدیک ان ذیلی تاثیرات کو رضا کارانہ جذب کر لینا حرکت مذہبی سے بدرجہا بہتر ہے۔ ۴۔ یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے: کیا ان تجویزوں پر عمل درآمد سے امت مسلمہ فی الواقع اپنی Exclusive اور Insular قیادت سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب ہو جائے گی؟

عاجز کی رائے ہے کہ 'موجودہ صورتحال میں' (Ceteris Paribus) ایسا ہونا یقینی نہیں۔ اس کے کئی وجوہ ہیں:

۱۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے اس Exclusive اور Insular قیادت کا انقطاع لازماً انہیں پوری قوم میں بے اثر (Neutralize) نہیں کر سکتا۔

یہاں یہ بات بھی ذہنوں میں واضح رہنی چاہیے کہ مسلمانوں کی Exclusive اور Insular قیادت کا اصل کشت زار (Nursery) مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ نہیں ہے۔

اسی طرح یہ بات بھی ذہنوں میں واضح رہنی چاہیے کہ مسلمانوں کی مرئی Exclusive اور Insular قیادت ان کی اصل قیادت نہیں ہے۔ ان کی اصل قیادت تو وہ تعبیری (Virtual) اور غیر مرئی

(Invisible) قیادت ہے جس کی غذا امت کے جسم میں پائی جانے والی حرارتِ غریزی ہے۔ مسلمانوں کی Exclusive اور Insular قیادت اس اصلی قیادت کی محض ظل (Shadow) ہے۔

661 عیسوی کے بعد امتِ مسلمہ کی اصلی قیادت 'علا' کی قیادت ہے جس کا اصل کشت زار مسلم معاشرہ ہے۔ یہ کشت زار اس 'قیادت' کا Most Favourable Breeding Ground and Habitat ہے۔ مسلم معاشرہ اس قیادت کے لئے نہ صرف کشت زار ہے بلکہ Multiplier بھی ہے۔ اس صورتحال میں 'مخلصہ مہدی' کا سب سے بڑا ہدف یہی قرار دیا جاسکتا ہے کہ امتِ مسلمہ کا حقیقی اور براہ راست (Direct) تعلق نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بحال (Restore) کیا جائے تاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر اسلام اجنبیوں کے مانند پھر پلٹے گا جیسے پہلے آیا تھا (سیعود کما بداء: تو مزی) عالم واقعہ میں حقیقت کا جامہ پہن سکے۔

عاجز کے نزدیک 'مخلصہ مہدی' کے خارزار سے انسانیت کو کامیابی سے گزار لے جانے کی بہترین صورت ان دو تجویزوں پر عمل درآمد ہے۔

۵۔ ہندوستان ایک دستوری، جمہوری، وفاقی اور فلاحی ریاست (Constitutional, Demoratic, Federal & Welfare State) ہے لہذا عوام کے ہمہ گیر فلاح کو یقینی بنانا اس کے فرائض منصبی میں داخل ہے۔

فلاحی ریاست (Welfare-State) کے فرض منصبی میں یہ بات داخل ہے کہ وہ اپنے عوام یا شہریوں (Citizen) کو انفرادی اور اجتماعی اعتبار سے 'فلاحی شہری' بنائے۔ 'فلاحی شہری' بنانے سے مراد بحیثیت شہری ہر فرد اور اس کے مجموعہ سے بننے والی ہر اجتماعیت کے اندر کم سے کم اتنی استعداد (Minimum Ability) پیدا کرے تاکہ وہ اپنے شہری حقوق اور شہری ذمہ داریوں کے تقاضوں کو Optimally پورا کر سکیں۔ چنانچہ ہر فلاحی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے ہر شہری کو اس استعداد کے حصول کا پابند بنائے اور اس کی سہولیات مہیا کرے۔ اسی ذمہ داری کی ادائیگی قومی کامن بیس (National Common Base) کے تحت وضع کردہ تعلیمی نظام اور اس کے نصاب کے نفاذ اور ہر شہری کو اسے مہیا کرانے سے کی جاتی ہے۔ چنانچہ ہندوستان کی فلاحی ریاست کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ مسلمانوں کے لئے اس قومی کامن بیس (NCB) سے استفادہ کو یقینی بنائے۔ اس حوالے سے اولین ذمہ داری خود مسلمانوں بالخصوص عام مسلمانوں پر عاید ہوتی ہے کہ وہ حکومت سے مطالبہ کریں کہ انھیں قومی کامن بیس (NCB) کا حصہ بنایا جائے۔ چنانچہ اس

ہدف کو پیش نظر رکھ کر درج ذیل تجویزیں پیش کی جاسکتی ہیں:

۱۔ ملک میں Across the Board پرائمری، مڈل اور سکندری تعلیم کا قومی کامن بیس (National Common Base) بنایا جائے اور مسلمانوں کی تعلیم کو بلا استثنا اس کا حصہ بنا دیا جائے۔
۲۔ تعلیم کا یہ قومی کامن بیس (National Common Base) سب کے لئے لازمی قرار دیا جائے۔ چنانچہ ملک کے ہر شہری پر اس کا حامل ہونا لازمی ہو۔ ملک میں اس قومی کامن بیس سے گزرے بغیر کوئی تعلیمی استعداد قابل تسلیم نہ ہو۔

۳۔ حکومت مسلمانوں کے مدارس کے ذمہ داران سے دریافت کرے کہ وہ واضح کریں کہ ان کا 'مدرسہ جاتی نظام تعلیم' جامع (Comprehensive) نظام ہے یا خصوصی/تخصصی (Specialized)۔ کیا مدرسہ جاتی نظام مسلم افراد اور مسلم معاشرے کی جملہ ضروریات کی تکمیل کرتا ہے یعنی 'مہد سے لحد' تک کی انفرادی اور اجتماعی جملہ تعلیمی، تدریسی، تحقیقی، تربیتی، علمی اور تجرباتی مطالبات پوری کرتا ہے یا مخصوص؟ اگر ان کا موقف یہ ہو کہ یہ مدرسہ جاتی نظام تعلیم جامع (Comprehensive) نہیں بلکہ تخصصی (Specialized) نظام ہے تو پھر ان سے کہا جائے کہ وہ ملک میں رائج اور مجاز تمام خصوصی تعلیم (Specialized Knowledge) کے اداروں مثلاً Engineering Colleges, Medical Colleges کی طرح صرف Graduate اور Post-Graduate سطح پر اس تعلیمی نظام کو چلائیں جہاں صرف انھیں طلبہ کا داخلہ ممکن ہو جو دو تقاضے پورے کرتے ہوں:

۱۔ وہ سکندری سطح تک ملک میں رائج قومی کامن بیس کی تعلیمی استعداد اور سندر رکھتے ہوں۔

۲۔ مدارس کی تخصصی تعلیم حاصل کرنے کے خواہش مند ہوں۔

علی گڑھ ایک شہر ہے اور نہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ محض ایک یونیورسٹی۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ 'انسانیت' کی آخری امید ہے۔ یہاں 'انسانیت' مستقبل میں اپنی بقا کی آخری اور فیصلہ کن لڑائی لڑ رہی ہے۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی بقا پر مستقبل میں انسانیت کی بقا منحصر ہے۔ چنانچہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ اب انسانیت کی بقا اور موت کی علامت بن چکی ہے۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی بقا سر سید کی بصیرت کی بقا میں مضمر ہے۔ سر سید کی بصیرت پر عمل آوری بے بصیرتی اور ظلم کے خلاف انسانیت کی بقا کی سب سے موثر تدبیر ہے اور قرآنی انسان کی بازیافت کی سب سے احسن صورت۔